تعلیم و ترقی



ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جنوری ۱۹۵۸ء
شمارہ نمبر ۱

بانی، شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ جامعہ نگر نئی دہلی

ٹیلی فون نمبر ۲۲۴۶۱

قیمت سالانہ: چار روپے

کلکتے کا نیشنل سیمینار

ایک نظر

سیمیناروں میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ زیر بحث موضوع سے متعلق شرکاء اپنے اپنے تجربات اور خیالات کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور ان کی روشنی میں ایک نتیجہ نکالتے ہیں۔ اس اعتبار سے سیمینار نمائندوں کے لئے ٹریننگ کیمپ کی بھی حیثیت رکھتے ہیں اور زیر بحث موضوع کے بارے میں نتائج اور فیصلے بھی مرتب کرتے ہیں۔

کلکتے کے نیشنل سیمینار کو سیمینار کی اس تعریف کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کے لئے ٹریننگ کیمپ کی زیادہ تھی اور رہنمائی کم۔ یہ صورت ہمارے خیال میں اس لئے ہوئی کہ سیمینار کا موضوع ہی ایسا تھا جس کے بارے میں ہندوستان کے سماجی تعلیم کے ماہروں کے دماغ بھی صاف نہیں ہیں اور سیمینار کے شرکاء میں سے اکثر کے لئے مزدوروں کی تعلیم کا عنوان سرے سے ایک نامانوس اور غیر معروف عنوان تھا۔

سیمینار کے ڈائرکٹر شری وی۔ ایس ماتھر غالباً اس بات کو بخوبی سمجھ گئے تھے چنانچہ انھوں نے جو ورکنگ پیپر ترتیب دیا اُسے مزدوروں کی تعلیم کے باب میں بنیادی قاعدے (پرائمر) سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس ورکنگ پیپر کے اوپر غور کیجئے تو اس میں مزدوروں کی تعلیم سے متعلق زیادہ تر تعریفات ملیں گی۔ ظاہر ہے جب تک تعریفات ذہن نشین نہ ہو جائیں، اس وقت تک کسی موضوع کی تفصیلات کے مطالعے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ورکنگ پیپر کی یہ حیثیت اس لئے بھی ضروری تھی کہ خود ملک میں مزدوروں کی تعلیم ابھی شیر خوارگی کی حالت میں ہے یہاں مزدوروں کی انجمنوں اور مزدور سبھاؤں کا نام تو ضرور سننے میں آتا ہے جن کا خاص منصب مزدوروں کے مطالبات پیش کرنا اور ان مطالبات کے نہ مانے جانے کی صورت میں ہڑتالیں منظم کرنا ہے۔ مزدوروں کی تعلیم کے سلسلے میں کسی انجمن کا نام شاید اب بھی ہندوستان میں کہیں سننے میں نہیں آتا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی پس ماندگی کا یہ حال ہے کہ جب انٹرنیشنل فیڈریشن آف ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشنز (مزدوروں کی تعلیمی انجمنوں کے بین الاقوامی وفاق) کی رکنیت

ترتیب

اشارات

اصول اور طریقے

کارکنوں کے خیالات

سوشل ایجوکیشن کی تحریک

کلکتے میں سیمینار کے انعقاد کی دعوت ویسٹ بنگال اڈولٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے دی تھی۔ جب تک اس بات کا علم نہیں ہوا تھا اس وقت تک ہمارا خیال تھا کہ اپنے موضوع کی مناسبت سے شاید وہ ایشین ٹریڈ یونین کالج میں منعقد ہو اور اگر ایسا ہوتا تو ہمارا خیال ہے سیمینار کے شرکا، کو اس موضوع سے واقفیت کا زیادہ موقع ملتا۔

قیام کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ سیمینار کے منتظموں کو ذرا سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ ایک کرے میں دس دس بارہ بارہ نمائندوں کا قیام اس لحاظ سے تو یقیناً مفید ہوتا ہے کہ وہ دس بارہ روم فیلو چھ سات دن تک ایک ساتھ رہنے سے ایک دوسرے سے بہت قریب آجاتے ہیں اور احباب کی فہرست میں بڑا قابل قدر اضافہ ہوجاتا ہے لیکن سیمینار میں بامقصد شرکت جسے کہتے ہیں، اس کے راستے میں اس سے بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی نمائندہ اگلے دن کی بحثوں کے لئے کچھ تیاری کرنا چاہے ——— اور ظاہر ہے ہمارے سیمیناروں میں اس قسم کی تیاری کے لئے صرف رات ہی کا وقت میسر آتا ہے ——— تو وہ اس قافلے کے ساتھ رہ کر نہیں کرسکتا۔ اس طرح سیمینار کا مقصد جس میں امید کی جاتی ہے کہ حصہ لینے والا ہر شخص کچھ نہ کچھ "کان ٹری بیوٹ" کرے، سرے سے فوت ہوجاتا ہے۔

ہمارے نیشنل سیمیناروں میں ایک چیز کی اکثر کمی رہتی ہے جو اس آٹھویں سیمینار میں بُری طرح محسوس ہو رہی تھی، اور وہ ہے حوالے کے مواد (ریفرینس میٹیریل) کی کمی۔ اگر سیمینار کسی جانے بوجھے موضوع پر ہو اور صرف تجربات کو یکجا کرکے ان کی روشنی میں غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا مقصود ہو، تب تو یہ کمی زیادہ محسوس نہیں ہوتی مگر جب موضوع ان جانا اور نامانوس ہو، جیسے اس سیمینار کا موضوع تھا تو اس وقت حوالے کے مواد کی فراہمی ضروری بلکہ لازمی ہوجاتی ہے۔

اگر مزدوروں کی تعلیم سے متعلق مستند مصنفوں اور ماہرین کی تصانیف، بین الاقوامی سیمیناروں کی رپورٹیں مختلف ملکوں کے تجربات پر مضامین اور رسالے اور اسی طرح کا حوالے کا دوسرا مواد جمع کردیا گیا ہوتا اور نیوز بلیٹن کے ذریعے روز کے روز نمائندوں کو زیر بحث موضوع کی مناسبت سے اس مواد کی طرف متوجہ کیا جاتا تو ہمیں یقین ہے کہ سیمینار کی بحثیں زیادہ جامع اور نتیجہ خیز ہوتیں۔

اس سیمینار میں نمائندوں کو بحثوں اور کاروباری پروگراموں میں بُری طرح باندھ دیا گیا تھا۔ اگر حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ نمائندوں کو کلکتے اور اس کے آس پاس کی سیر کرائی جائے، تو کم سے کم اتنا تو ہونا ہی چاہئے تھا کہ روزانہ کچھ دیر کے لئے یا ایک دن کے ناغے سے آدھے وقت کے لئے انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا تا کہ وہ اپنے ذوقِ سیاحت کی تسکین کا سامان اپنے آپ کرلیتے۔

کا سوال پیش ہوا تو اس کے لئے (غالباً) انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے اپنا نام بھیجدیا اور اس وقت یہی جماعت مزدوروں کی تعلیمی انجمنوں کے اس بین الاقوامی وفاق میں ہندوستان کی نمایندگی کر رہی ہے۔

مگر ملک کے موجودہ حالات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اب یہ کمی بھی پوری ہو جائے گی اور عنقریب مزدوروں کی تعلیمی انجمنیں اور ان کی سرگرمیاں شروع ہو جائیں گی۔ اُس وقت مزدوروں کی تعلیم کا کام کرنے والوں کے لئے اس سیمینار کی سفارشات کم سے کم بنیاد کا کام ضرور دیں گی، اور ان کا سہارا لے کر کارکن کچھ دُور چل سکیں گے۔

جب یہ کام کچھ عرصہ ہو لے گا اور کارکنوں کو کامیابی یا ناکامی کا کچھ تجربہ ہو جائے گا، اُس وقت ان کی مکمل رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ضرورت کون پوری کرتا ہے۔ آیا اُس وقت تک الگ سے مزدوروں کی تعلیمی انجمنوں کی کوئی تنظیم قائم ہو جائے گی جو یہ کام کرے گی یا انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن ہی یہ خدمت انجام دے گا۔ بہرحال کرے کوئی، یہ کام کرنا یقیناً ہوگا، اور اُس وقت جو سیمینار ہوگا، اُسے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کا درجہ دیا جاسکے گا۔

اس موقعے پر یہ کہنا ہمارے خیال میں خارج از بحث نہ ہوگا کہ سیمیناروں کا موضوع بحث منتخب کرتے وقت انڈین اڈلت ایجوکیشن ایسوسی ایشن کو یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جس کے بارے میں سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کو سب سے زیادہ رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جس کے سلسلے میں ہر کارکن اپنے تجربے کی مدد سے میں کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایسوسی ایشن نے کسی موضوع پر سیمینار منعقد کیا ہو اور سفارشات مرتب کی ہوں، مگر وہ سفارشات تجربے کی کسوٹی پر پہنچ کر کم اصل یا سرے سے غلط ثابت ہوئی ہوں۔ ایسی صورت میں یہ بالکل نامناسب نہ ہوگا اگر اُسی موضوع پر پھر سیمینار منعقد کیا جائے اور پہلے سیمینار کی سفارشات کا ٹھوس تجربات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو زیر بحث موضوع کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائیگا اور وہ مسئلہ ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔

اس تجویز کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مزدوروں کی تعلیم کے موضوع پر یہ سیمینار قبل از وقت نہ سہی مگر سفارشات کے اعتبار سے نامکمل ضرور ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد جب یہ تحریک چل پڑے تو اس کی اس تشنگی کو دور کرنے کے لئے ایک دوسرا سیمینار اسی موضوع پر پھر منعقد کیا جائے۔

ا۔ وہ تمام ملازمین جو صنعتوں میں، زرعی فارموں یا چائے کے باغات میں کام کرتے ہیں، چاہے ان کے کام کی نوعیت جسمانی محنت کی ہو یا غیر جسمانی محنت کی۔ مگر وہ ملازمین نہیں جو انتظام میں دخل رکھتے ہیں، اور مزدوروں کو بھرتی کرنے، برخاست کرنے، ترقی دینے اور تبدیل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی نہیں جو انتظام کرنے والوں سے کسی طرح کا صنعتی رشتہ رکھتے ہیں۔ مختصراً "مزدور" کی تعریف میں وہ تمام ملازمین آنے چاہئیں جو بالعموم مزدور سبھا کے رکن بن سکتے ہیں۔

ب۔ آزاد مزدوروں کی وہ سب اقسام جو اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے اسی سماجی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس سے ایک عام مزدور تعلق رکھتا ہے۔

ج۔ ان مزدوروں کے اہل خاندان جن کا (ا) اور (ب) میں ذکر کیا گیا ہے۔

لفظ "مزدور" کی تعریف و توضیح کرنے کے بعد سیمینار نے مذکورہ بالا گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعلیمی ضرورتوں پر غور کیا۔ جہاں تک صنعتی مزدوروں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں کہا گیا کہ ان مزدوروں کی ضرورتوں کو حسب ذیل تین عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) وہ مسائل جو ان کی شہری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) وہ مسائل جن کا تعلق اُس ماحول اور ان حالات سے ہوتا ہے جن کے اندر رہ کر انھیں ملازمت کرنی ہے۔

(۳) وہ مسائل جو مزدور سبھاؤں کا ممبر ہونے کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔

نمبر ایک کے باب میں یعنی ان مسائل کے سلسلے میں جو مزدوروں کی شہری زندگی سے متعلق ہوتے ہیں، اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ صنعتی مزدوروں کی بڑی اکثریت گاؤں سے آتی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ گاؤں میں بیشتر وہ سہولتیں اور آسائشیں میسر نہیں ہوتیں جو شہروں میں حاصل ہوتی ہیں، تاہم اُن میں گندی بستیوں (slums) کا مسئلہ اتنا نازک نہیں ہوتا جتنا شہروں میں ہوتا ہے۔ شہروں کی گندی بستیوں میں رہنے سے مزدور جسمانی اور اخلاقی بہت سے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گاؤں میں وہ ایسے لوگوں کے ساتھ زندگی گذارتا ہے جو تہذیبی نقطۂ نظر سے شہروں کے مقابلے میں زیادہ یک رنگ اور ہم معیار ہوتے ہیں۔ شہروں میں سماجی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے مختلف معیار کے سماجی گروہ رہتے ہیں؛ جن کے ماحول میں اُسے زندگی گذارنی پڑتی ہے اور ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ وہ اس نئے ماحول سے کس طرح مطابقت پیدا کرے، چنانچہ یہ مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔

مزدور کو جن حالات اور ماحول میں ملازمت کرنی ہوتی ہے، اس سے بھی بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں مثلاً

اصول اور طریقے

آٹھواں نیشنل سیمینار منعقدہ ہابرا (کلکتہ)

سفارشات

مزدوروں کی تعلیم کیا ہے؟ اس موضوع پر غور کرتے وقت سیمینار نے محسوس کیا کہ اس سلسلے میں کوئی جامع تعریف متعین کرنے میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے یعنی وہ اشخاص جنھیں تعلیم دی جاتی ہے اور جو کچھ تعلیم دی جاتی ہے، اس کی نوعیت۔ مزدوروں کی تعلیم ظاہر ہے، وہ تعلیم ہے جو مزدوروں کو دی جائے۔ مگر سوال یہ ہے "مزدور کون لوگ ہیں؟" اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہی گئیں۔ مثلاً آیا لفظ "مزدور" انھی ملازموں پر صادق آتا ہے جو صنعتوں میں کام کرتے ہیں، یا اس کے احاطے میں وہ ملازم بھی آتے ہیں جو زرعی فارموں اور چائے کے باغات میں کام کرتے ہیں۔ آیا صرف جسمانی محنت کرنے والوں ہی کو "مزدور" کی صف میں رکھنا مناسب ہوگا یا ان لوگوں کو بھی جو کلرکی یا غیر جسمانی محنت کے کاموں میں لگے ہوتے ہیں؟ پھر جو لوگ ملازمت کرتے ہیں، وہ سب کے سب اس تعریف میں آئیں گے چاہے ان کا مقام اور مرتبہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، یا ان لوگوں کو جو منیجری یا نگرانی کا کام کرتے ہیں، اس تعریف سے خارج کر دینا چاہیئے؟ ان لوگوں کے بارے میں کیا فیصلہ ہے جو آزاد مزدور ہیں یا آپ اپنے ملازم ہیں جیسے بڑھئی، لوہار، کمہار وغیرہ یا چھوٹے چھوٹے دکاندار یا رکشا چلانے والے۔ یہ لوگ بظاہر تو "ملازمت پیشہ" لوگوں کی صف میں نہیں آتے اگرچہ یہ بھی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے اُسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس سے اوسط درجے کے مزدور تعلق رکھتے ہیں؛ اور آخر میں یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ مزدوروں کے اہل خاندان کا کیا ہو؟

مزدوروں کی تعلیم کا مدعا کیا ہے؟

مذکورہ بالا تمام سوالات پر بحث کرنے کے بعد سیمینار اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بات کا تعین کرنے کے لئے کہ مزدوروں کی تعلیم سے فائدہ اُٹھانے والے کون لوگ ہونے چاہئیں، لفظ "مزدور" کی تعریف میں حسب ذیل لوگ آنے چاہئیں:

تھا کہ سوشل ایجوکیشن میں اتنی وُسعت ہے کہ اُس کے احاطے میں وہ سب باتیں آسکتی ہیں جو تعلیمِ بالغان، فنڈا منٹل ایجوکیشن اور مزدوروں کی تعلیم حتیٰ کہ مزدور سبھائیت کی ٹریننگ میں آتی ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ اس مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے کہ مزدوروں کی تعلیم ہی کے حلقۂ عمل میں تعلیم کی مذکورۂ بالا دوسری شاخوں کی باتیں بھی شامل ہیں۔

سیمینار میں ایک خیال پر سب لوگ متفق تھے کہ مزدور سبھاؤں کو ہمارے سماج میں اب اتنا اہم مقام حاصل ہوگیا ہے کہ بالغوں کی تعلیم کا جو بھی نصاب بنے، اس میں مزدور سبھائیت کی تعلیم بھی ایک نہ ایک حد تک ضرور شامل ہونی چاہئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مزدور سبھائیت ایک مضمون کی حیثیت سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا ایک جزو ہونا چاہئے، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اس کا معیارِ تعلیم ان اداروں کی سطح کے اعتبار سے ہر منزل پر مختلف ہوگا۔ سیمینار میں اس بات پر اتفاق تھا کہ مزدور سبھائیت کا اصول اور فلسفہ، ایک جمہوری سماج میں مزدور سبھاؤں کا درجہ، اور ہندوستان اور باہر کے ممالک میں مزدور سبھا تحریک کی تاریخ، یہ سب باتیں سوشل ایجوکیشن کی حدودِ عمل میں شامل ہوسکتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ سیمینار نے یہ خیال بھی قائم کیا کہ مزدور سبھاؤں کی سرداری کی ٹریننگ ان سے مختلف ہے اور سوشل ایجوکیشن کے حلقۂ عمل میں اُسے شامل نہیں کیا جاسکتا۔ مذکورۂ بالا تعلیمی شاخوں کا حلقۂ عمل متعین کرتے وقت سیمینار حسب ذیل نتیجے پر پہنچا۔

تعلیمِ بالغان کی سیدھی سادی تعریف کی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں "بالغوں کی تعلیم" اس حیثیت سے تعلیم کی حدود اور موضوع کی تعریف یا اُسے محدود کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس کے مضاف علیہ "بالغان" سے جن لوگوں کو تعلیم دینی ہے، ان کی صرف عمر کا پتہ چلتا ہے۔ مزدوروں کی تعلیم کی حدود بھی اُسی قدر وسیع ہیں جتنی تعلیمِ بالغان کی حدود مگر یہ اپنے طالب علموں کے حلقے کو ضرور محدود کرتی ہے اور اپنے فیوض کو اُسی سماجی گروہ کے لئے مخصوص کرتی ہے جو لفظ "مزدور" کی تعریف میں آتا ہے۔ سوشل ایجوکیشن اس اعتبار سے کہ اُس کے طالب علموں کے لئے کسی مخصوص و محدود گروہ کی قید نہیں ہے، تعلیمِ بالغان اور مزدوروں کی تعلیم، دونوں کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے، مگر شہریت کی تعلیم پر زیادہ زور دے کر وہ اپنے آپ کو محدود بھی کرلیتی ہے۔ رہی فنڈا منٹل ایجوکیشن، تو وہ یونیسکو کی تراشی ہوئی ایک اصطلاح ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ نیم ترقی یافتہ ملکوں اور اقوام کو تعلیم کی جو کم سے کم مقدار ہوسکتی ہے فراہم کی جائے۔

سیمینار نے اس باب میں یہ نظریہ قائم کیا کہ مزدوروں کی تعلیم حدود کی نوعیت کے اعتبار سے دراصل تعلیم بالغان ہے جو ایک مخصوص سماجی گروہ یعنی مزدوروں کو دی جائے۔

صنعتی نظم و ضبط (ڈسپلن) کا اپنے آپ کو عادی بنانا اور ان حالات میں اپنے آپ کو ڈھالنا جو دیہات کے حالات سے یکسر مختلف ہوتے ہیں اور جن کے اندر رہ کر کام کرنے کا وہ سرے سے عادی نہیں ہوتا۔

پھر مزدوروں کی تعلیمی ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جو ان کے مزدور سبھاؤں کا ممبر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ان ضرورتوں میں بھی سبھا میں ان کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر مزدور سبھا کا ایک معمولی ممبر ہے تو اس کی تعلیمی ضرورتیں اور ہوں گی، اگر وہ سبھا کی کسی شاخ کا ذمے دار افسر ہوگا تو اس کی ضرورتیں دوسری قسم کی ہونگی اسی طرح اگر اس کی حیثیت آل انڈیا لیڈر کی ہے، تو اس کی تعلیمی ضرورتیں بالکل ہی مختلف ہوں گی۔

سیمینار نے بہرحال یہ محسوس کیا کہ مختلف اسباب کی بنا پر مزدور بالعموم تقدیر پرست اور با اختیار آدمیوں کی دُہائی دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت ایک خود کفیل اور جمہوری المزاج مزدور تحریک کی راہ میں بڑی خطرناک رکاوٹ ہے۔ لہٰذا مزدوروں کو اپنے جمہوری حقوق سے واقف کرانا اور محض اپنے دست و بازو کے اوپر بھروسہ کرنے کے قابل بنانا اس وقت سب سے بڑی ضرورت ہے۔

مزدوروں کی مذکورۂ بالا تعلیمی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سیمینار نے مزدوروں کی تعلیم کے اغراض و مقاصد متعین کرنے کی طرف توجہ دی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مزدوروں کی تعلیم کا مقصد مزدوروں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے مسائل کو سمجھیں، اُن حالات کو سمجھیں جن کے اندر رہ کر اُنھیں ملازمت کرنی ہے، اور ان ضرورتوں کو سمجھیں جو ان کے مزدور سبھا کے ممبر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ سیمینار کو بہرحال اس بات کا خاص طور پر احساس تھا کہ مزدوروں کی شخصیت کی نشو و نما ہوئے بغیر نہ ایک جمہوری المزاج سماج کی بنیاد پڑ سکتی ہے اور نہ ایک مضبوط، آزاد اور خود کفیل مزدور سبھا تحریک ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔ اس بات کی روشنی میں سیمینار نے فیصلہ کیا کہ مزدوروں کی شخصیت کی نشو و نما مزدوروں کی تعلیم کا ایک خاص اور اہم مقصد ہونا چاہیے۔

مزدوروں کی تعلیم، تعلیم بالغان اور فنڈا منٹل ایجوکیشن

مزدوروں کی تعلیم کا مقصد متعین ہو جانے کے بعد کسی حد تک یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی حدود اور موضوع کیا ہو سکتے ہیں۔ سیمینار نے متعدد اصطلاحات پر غور کیا جو تعلیم کے میدان میں رائج ہو گئی ہیں مثلاً تعلیم بالغان، مزدوروں کی تعلیم، سوشل ایجوکیشن اور فنڈا منٹل ایجوکیشن۔ ان میں سے بہت سی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کی یا تو واضح طور پر تعریف ہی متعین نہیں ہوئی ہے یا پھر اتنی وضاحت کی گئی ہے کہ ان کے احاطے میں دنیا کی تقریباً ہر چیز آجاتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال

آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس

چودھواں اجلاس

صدر کانفرنس ریورینڈ بی سی مکرجی کا خطبہ

ریورینڈ بلاس چندر مکرجی تعلیم بالغان کے میدان کے پرانے مجاہد ہیں اور انھیں آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے چودھویں اجلاس کا صدر منتخب کرکے انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے ان کی نہیں اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ محترم ریورینڈ نے اپنے خطبۂ صدارت میں سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والوں کو عالم مثال میں نہ لے جاکر خالصتہً عملی باتوں کی طرف توجہ دلاتی ہے ایسی باتوں کی طرف جو روزانہ ان کی نظروں کے سامنے سے گذرتی ہیں اور ان کے درد مند دل کو متاثر کرتی ہیں۔

ذیل میں ہم محترم ریورینڈ صاحب کے خطبے کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں

ایڈیٹر

دوستو،

میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے اس چودھویں اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ اس اعزاز کی مسرت اس لئے بھی ہے کہ اسی سال اسی مہینے میں ہم ویسٹ بنگال اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی بیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس بات سے آپ کو غالباً دلچسپی ہوگی کہ ہماری ایسوسی ایشن تعلیم بالغان کی پہلی ایسوسی ایشن ہے جو ہندستان میں قائم ہوئی، اور اس لحاظ سے ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس میدان میں پہل کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔

پیشے کی تعلیم کے باب میں سیمینار نے یہ نظریہ قائم کیا کہ پیشے کی ایسی تعلیم جو کوئی کسی نئے پیشے کو اختیار کرنے کی غرض سے حاصل کرنا چاہتا ہو، مزدوروں کی تعلیم کے حلقۂ عمل سے باہر ہے۔ مگر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ پہلے سے کسی کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ ترقی پانے یا اپنی حیثیت کو بڑھانے کی غرض سے اپنی مشق و مہارت میں اضافہ کرنے کے خواہشمند ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ مشین سازی کے فن میں ترقی ہونے کی وجہ سے کام کے طریقوں میں تبدیلی آجائے اور اس سے کچھ مزدوروں کا کام مدِ فاضل قرار پائے اور وہ بے روزگار ہوجائیں۔ ایسی حالت میں ایسے مزدوروں کے لئے ضروری ہوجائے گا کہ یا تو کوئی دوسرا کام سیکھیں یا اپنے پہلے کام کو برقرار رکھنے کے لئے کام کی نئی اور ترقی یافتہ تکنیک سیکھیں۔

سیمینار نے اس باب میں یہ فیصلہ کیا کہ پیشے کی ایسی تعلیم جو پہلے سے کام پر لگے ہوئے مزدوروں کو اس غرض سے دی جائے کہ ان کی مشق و مہارت میں اضافہ ہو یا اس غرض سے کہ مشینی تبدیلیوں سے جو صورت حال پیدا ہو، اس کا وہ نئے طریقے اور تکنیک سیکھ کر مقابلہ کرسکیں —— ایسی تعلیم یقیناً مزدوروں کی تعلیم کے احاطۂ عمل میں شامل ہونی چاہئے۔

(باقی اگلے پرچے میں)

۳- ریاستی سوشل ویلفیر بورڈ اور

۴- رضاکار ادارے اور جماعتیں۔

سوشل ایجوکیشن کے کام میں لگی ہوئی ان تنظیموں کے بارے میں ایک بات ایسی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا حکومت کے محکموں کے درمیان خود اور اُن کے اور رضاکار تنظیموں اور جماعتوں کے درمیان کسی قسم کا اشتراک و تعاون نہیں ہے حالانکہ ایسی بہت سی باتیں ہیں جہاں وہ ایک دوسرے سے بخوبی اشتراک و تعاون کر سکتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان محکموں اور تنظیموں کی مسلسل بیٹھکیں اور سیمینار منعقد ہوتے رہنے چاہئیں، تاکہ لوگ ایک دوسرے کے خیالات اور منصوبوں سے واقف ہوتے رہیں۔ اس قسم کے روابط اور تعلقات کی حوصلہ افزائی خود افسرانِ بالا کی طرف سے ہونی چاہئے۔

بہت سے سرکاری محکمے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انھیں تعلیمی پروگراموں سے کوئی سروکار نہیں ہے اور ریاست میں سوشل ایجوکیشن کو ترقی دینا، ان کی ذمّے داری نہیں ہے۔ جب تک تمام سرکاری محکمے اور رضاکار جماعتیں جہالت توہم پرستی، ناخواندگی اور دھوکا دھڑی وغیرہ کے خلاف آپس میں مل کر کام نہیں کریں گے، ہمارے ملک کا مستقبل روشن نہیں ہوگا۔

یہاں ہم میں سے جتنے لوگ جمع ہوئے ہیں، وہ سب کے سب مجاہدین ہیں اور جہالت اور بدحالی کے خلاف مورچہ لے رہے ہیں۔ ہماری اس جنگ کے تین محاذ ہیں۔

ہمارا پہلا محاذِ جنگ گاؤں ہے۔ آزادی کی بدولت یوں تو بہت کچھ ہو رہا ہے۔ نئی نئی سڑکیں بن رہی ہیں، موٹریں اور بسیں چل رہی ہیں، جن سے ٹھیٹھ دیہات میں آمد و رفت اور نقل و حمل کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے، نئے نئے خیالات کی اشاعت ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر ہمارا دیہاتی بھائی ہے کہ اُسے ان تبدیلیوں کا احساس تک نہیں ہے۔ اور اس کا قدامت پسند دماغ ان ہلچلوں سے ذرا نہیں پسیجا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اب بھی وہیں اور اُسی حال میں ہے جہاں اور جس حال میں پہلے تھا — جہالت اور افلاس کا شکار۔

سوشل ایجوکیشن کی منزل اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے بڑی سخت منزل ہے اور سوشل ایجوکیشن کا کارکن یہ نہ سمجھ لے کہ یہی اس کا پیشہ اور اوڑھنا بچھونا ہے، اور جب اس کا دل انسانیت کی اقدار کا گہوارہ نہ بن جائے، اس وقت تک وہ کوئی پائدار کام نہیں کر سکتا۔

سوشل ایجوکیشن کے کارکن کو جو سب سے بڑی مشکل اپنے کام کے سلسلے میں پیش آتی ہے، وہ گاؤں میں کسی مستقل اور

حضرات،

اس کانفرنس میں غور طلب موضوع "انسانیت کی اقدار" رکھا گیا ہے۔ ویسٹ بنگال میں اس کانفرنس کے لئے اس سے بہتر موضوع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کہ پناہ گزینوں کی جس دل گداز کیفیت سے اس وقت بنگال کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے، وہ کیفیت شاید اور کسی ریاست میں نظر نہیں آتی ہوگی۔ ایک سماجی کارکن جب پناہ گزینوں کے کیمپوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر انسانوں کے ہجوم کو کیڑوں مکوڑوں کی زندگی گذارتے دیکھتا ہے تو وہ "انسانیت کی اقدار" کا خیال کر کے مایوسی سے بھر جاتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ان مناظر کے عادی ہو چکے ہیں اور جس وقت کسی ماں کو اسٹیشن پلیٹ فارم پر پڑی ہوئی اپنے بچے کی لاش پر روتے ہوئے دیکھتے ہیں، تب بھی ہمارے دلوں میں درد کی کسک نہیں پیدا ہوتی۔ ہمارے دلوں میں زیادہ سے زیادہ جو خیال گذرتا ہے جس میں خود ہمارے لئے تسکین کا سامان ہوتا ہے، وہ یہ ہوتا ہے "چلو اچھا ہوا۔ بچے کو مزید عذاب سے تو نجات مل گئی!"

دوستو،

کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ بیس سال میں تعلیم بالغان سے متعلق ہمارے خیالات و نظریات ہمارے تجربات کی چھلنی میں چھن چھن کر صاف اور واضح ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا تو پوری طرح احساس ہے کہ تعلیم کے بام ترقی پر پہنچنے کے لئے خواندگی پہلا زینہ ہے اور یہ پہلا زینہ نہایت ضروری اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ تعلیم بالغان سے ہماری مراد صحتِ عامہ، تفریح اور بالغ کی گھر کی زندگی سے متعلق ایک جامع پروگرام ہے۔ اگر ہمیں ایک نئی اور خود کفیل قوم کی تعمیر کرنی ہے تو بالغوں کی معاشی زندگی کی بحالی اور شہریت کے باب میں اس کی تعلیم لازمی شرط ہے۔ یہ سب کچھ سہی، مگر ہم اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بہرحال نہیں بند کر سکتے کہ ہندوستان کی ۶۰ کروڑ کی آبادی میں صرف چھ کروڑ آدمی محض خواندہ ہیں اور ہم خواندگی کے سوشیل کے سفر میں ابھی بیس منزلیں بھی طے نہیں کر پائے ہیں۔ یہ دُکھ بھری داستان اور زیادہ دل گداز ہو جاتی ہے جب ہم عورتوں کی آبادی پر نظر کرتے ہیں جہاں خواندگی کا اوسط مردوں کی دُنیا سے بھی کم ہے۔ اور یہ بات کون نہیں جانتا کہ اگر ہم ایک مرد کو خواندہ بناتے ہیں تو صرف ایک فرد خواندہ بنتا ہے، اور اگر ایک عورت خواندہ بنتی ہے تو اس سے پورا ایک خاندان خواندہ بن جاتا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ سوشل ایجوکیشن کے محاذ پر بڑی طاقتور فوجیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں اہم ایجنسیاں یہ ہیں:

۱۔ حکومت کا محکمۂ تعلیمات

۲۔ ڈیولپمنٹ پروجیکٹ اور این ای ایس بلاک۔

پھر یہاں ایک فلسفی آکر بیٹھا۔ اس نے اس آبشار کی عظمت سے اثر لیا اور بولا "سبحان اللہ! کیا شان ہے!" تیسری بار یہاں ایک انجینیر کا گذر ہوا۔ وہ سائنٹفک دماغ والا آدمی تھا۔ اُس نے سوچا "کتنی زبردست قوت اس آبشار میں پوشیدہ ہے" اور چلّا اٹھا "اُف! کتنا بھاری نقصان ہو رہا ہے!" اور یہ اُس انجینیر کے احساس نقصان کا فیض ہے کہ اب اُسی آبشار سے لاکھوں کلوواٹ بجلی پیدا کی جارہی ہے اور خود آبشار اور اس کے آس پاس کا علاقہ جگمگا اٹھا ہے۔

میں طالب علموں کے بارے میں اکثر اسی طرح سوچا کرتا ہوں اور اُس انجینیر کی آواز میں چیخ پڑتا ہوں کہ "کتنا زبردست نقصان قوت کا ہو رہا ہے" اور آج اس موقعے سے فائدہ اُٹھاکر یونیورسٹیوں کے افسرانِ بالا کو دعوت دینا چاہتا ہوں کہ وہ للّٰہ اس طرف متوجہ ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے لائق و فائق وائس چانسلر اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ صرف چند نوجوانوں کو اونچی تعلیم دے دینے سے ملک کا بھلا نہیں ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے کہ ایک دن وہ آئے جب لاکھوں کروڑوں ناخواندہ لوگ یہ سوچنے لگیں کہ اُن کے خون پسینے کی کمائی صرف چند نفوس کی تعلیم پر لگائی جارہی ہے دراں حالیکہ خود وہ چشمۂ علم کے چلو بھر پانی سے بھی محروم رکھے جاتے ہیں ــــــ اور وہ دن یقین رکھئے قیامت کا دن ہوگا۔

مرکزی جگہ کی غیر موجودگی جسے وہ اپنی تمام سرگرمیوں کا صدر مقام بنا سکے۔ پرانے زمانے میں اس قسم کے جتنے مقامات تھے، وہ ختم ہو گئے۔ ضرورت ہے کہ ہر گاؤں میں ایسی ایک مرکزی جگہ۔ جسے "سماجی زندگی کا مرکز" کہہ سکتے ہیں، باقاعدہ منصوبہ بنا کر تعمیر کی جائے۔

ہمارے جہاد کا دوسرا مورچہ مزدوروں کی دنیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی تیزی سے ہمارا صنعتی پروگرام آگے کی طرف بڑھ رہا ہے، اُسی نسبت سے مزدوروں میں بے چینی بھی بڑھ رہی ہے۔ اس بے چینی کے اسباب کیا ہیں؟ ناخواندگی، سرمایہ اور محنت کے درمیان ہم آہنگی کی کمی، اور مسلسل بے روزگاری جس وقت تک مزدوروں میں ناخواندگی کا دور دورہ رہے گا ان کے معیار زندگی اور اُجرتوں میں اصلاح نہیں ہوگی، یہ بے چینی بدستور باقی رہے گی صنعتیں چلانے والوں کے لئے یہ ایک للکار ہے جس کی طرف سے وہ آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔

بیشتر حالات میں مزدور صنعت کے چلانے والوں کو خون چوسنے والا سرمایہ دار تصور کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال بہت سے معاملات میں حق بجانب بھی ہوتا ہے۔ جب فضا اس قسم کے شبہات سے زہر آلود ہو تو مزدوروں کی بھلائی پر نظر رکھنے والے افسر" لیبر ویلفیر آفیسر" صنعت چلانے والوں کی طرف سے مقرر کیا جانا اس کے مقصد ہی کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اس انتظام کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ ایک مرکزی بورڈ الگ سے قائم کیا جائے جو لیبر ویلفیر افسروں کا تقرر کرے، وہ افسر اسی کے سامنے جواب دہ ہوں اور اسی کے مشورے سے مزدوروں کی بھلائی کے سلسلے کے تمام منصوبے جس میں مزدوروں کی تعلیم بھی شامل ہو مرتب کریں۔

مزدوروں کی تعلیم کی بات سوچتے وقت اس تعلیم کے ماہروں کو شہری آبادی کے اس طبقے پر بھی نظر رکھنی چاہیے جنہیں عرف عام میں "غنڈے" کہا جاتا ہے اور جن کا پیشہ ہی سماج میں رخنہ ڈالنا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہر شہر میں بڑھ رہی ہے۔ اور اپنے کرتوتوں کی وجہ سے سماج کے لئے مستقل دردِ سر بنتے جا رہے ہیں۔

ہمارا تیسرا محاذ طالب علموں کی آبادی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ آبادی کافی معقول آبادی ہے۔ صرف ولیسٹ بنگال میں دو لاکھ سے کچھ اوپر طالب علم مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مگر اس زبردست آبادی میں سے صرف چند ایسے ہیں جو اپنے ملک کے کروڑوں محروم و مفلوک انسانوں کی طرف توجہ صرف کرتے ہیں۔ باقی صرف اودھم مچانے پر تلے رہتے ہیں۔

طالب علموں کے بارے میں آپکے سامنے میں "نیاگرا آبشار" کا ایک واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک مرتبہ اس آبشار پر ایک شاعر کا گذر ہوا، وہ اس کے حسن میں کھو کر رہ گیا اور بے ساختہ چلا اٹھا "اوہ! کتنا غضب کا حسن ہے!"

اور ان کی حقیقتوں کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زندگی میں اپنا سکیں۔ جب تک کسی نئے مقصد یا کسی خوشگوار تبدیلی کو کوئی شخص یا کوئی سماج اپنی ذہنی سطح پر تسلیم نہیں کر لیتا، اُس وقت تک کوئی بھی طاقت اُس کو ان کے مطابق زندگی گذارنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ آزادی کے بعد آج ہمارے ملک اور سماج کے سامنے بہت سے نئے نئے مقاصد اور نئے نئے آدرش آئے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستانی شہری اور ہندوستانی سماج ان آدرشوں کو اپنائے تو تعلیم کے ایک ایسے پروگرام کی ضرورت ہو جاتی ہے، جو سماج میں ایک صحت مند ذہنی ماحول پیدا کرے اور جس میں رہ کر ہندوستانی سماج آج کے نئے نئے آدرشوں اور نئے نئے مقصدوں کو اپنا سکے۔ اس طرح کے پروگرام کا نام ہی سماجی تعلیم یا سوشل ایجوکیشن ہے۔

۲۔ کلچر یا تہذیب سے کیا مراد ہے

کلچر سے مراد ہے ترقی۔ دراصل کلچر اس مطمح نظر کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی قوم اور سماج کی ترقی میں سب سے اونچا مقام دیتا ہے۔ جس طرح ایک فرد کی عادت اور عمل سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، اُسی طرح ایک سماج کے رسم و رواج کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اُس سماج کا کلچر کیسا ہے؛ اس سماج کے مقاصد صرف روپے پیسے اور دھن دولت تک ہی محدود ہیں یا اس کا مقصد افراد میں جنگجویانہ رجحانات پیدا کرنا ہے۔ کیا اُس سماج کا مقصد اخلاقی اور روحانی قدروں کو اجاگر کرنا ہے؛ انھیں مقصدوں کے مطابق اُس سماج کی تہذیب جنم لیتی ہے۔ سماج کے رسم و رواج اور اُس کی تہذیب کا اندازہ سماج کے قوانین، ادب، فنون لطیفہ اور اعتقادوں کے مطالعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ان دو سوالوں کے جواب سے ہم یہ نتیجہ آسانی سے نکال سکتے ہیں کہ ان دونوں کا باہم کیا رشتہ ہے۔

ہماری پرانی تہذیب نے ہمارے سامنے جو آدرش رکھے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان آدرشوں میں جو خوشگوار تبدیلیاں آرہی ہیں اُن کو ایک مستحکم شکل دینے کے لئے ضروری ہے کہ ایک پروگرام مرتب کیا جائے۔ جو ایک ایسی نفسیاتی فضا تیار کرے جس میں رہ کر ایک فرد یا ایک سماج اُن آدرشوں کو اپنا سکے۔ جو پروگرام اور جو مشغلے اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں اس کو ہم کلچرل پروگرام یا تہذیبی سرگرمیاں کہہ سکتے ہیں۔

اب میں کچھ ایسے مشغلوں کا ذکر کروں گا جو سوشل ایجوکیشن کے مقصد کے لئے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ڈرامہ اسٹیج:

سوشل ایجوکیشن میں اسٹیج کا ایک اہم مقام ہے۔ دہلی میں ہر سال مختلف مذہبی اور سماجی ڈرامے کھیلے جاتے

سوشل ایجوکیشن میں تہذیبی سرگرمیاں

ہندوستان بھر میں جو ادارے سوشل ایجوکیشن کا کام کر رہے ہیں وہ اپنے منصوبوں میں دوسرے پروگراموں کے علاوہ کلچرل پروگراموں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ کلچرل پروگرام سوشل ایجوکیشن کا ایک مخصوص ذریعہ ہے۔ اس کے استعمال کے بغیر سوشل ایجوکیشن کی کوئی بھی سنستھا اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے سوشل ایجوکیشن کی ہر انجمن آج کل اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر رہی ہے۔

لیکن اس ذریعہ کا استعمال کیسے ہو رہا ہے؟ کیا وہ سوشل ایجوکیشن کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے؟ اس کے جواب میں محض اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس وقت ان کلچرل پروگراموں کا مقصد تفریح اور صرف تفریح ہو کر رہ گیا ہے۔ اس طرح کے بہت سارے پروگرام سوشل ایجوکیشن کے مقصد اور اُس کے حقائق سے بہت دور ہیں۔ اگر ہم اس ذریعہ کا ٹھیک استعمال کرنا چاہتے ہیں، تو پہلے ہمیں دو سوالوں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہئے۔

(۱) سوشل ایجوکیشن کیا ہے؟

(۲) کلچر یا تہذیب سے ہماری کیا مراد ہے؟

جب ہم ان دو سوالوں کا جواب دے چکیں گے تو یہ ہم پر واضح ہو جائے گا کہ کوئی مشغلہ اور کوئی دلچسپی کب کلچرل پروگرام کے تحت آتی ہے اور اس طرح کے پروگرام سوشل ایجوکیشن کے مقصد کی کہاں تک تکمیل کرتے ہیں۔

(۱) سوشل ایجوکیشن کیا ہے؟

میں یہاں سوشل ایجوکیشن کے متعلق مختلف نظریات کی بحث میں پڑ کر اس کی ایک عملی تعریف متعین کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس تعریف سے سوشل ایجوکیشن کے کارکن متفق ہوں گے۔ سماجی تعلیم یا سوشل ایجوکیشن ایک ایسا پروگرام ہے جو ایک ذہنی ماحول تیار کرتا ہے، جس میں رہ کر افراد اور سماج زندگی کے نئے آدرشوں اور نئی نئی تبدیلیوں

فلم اور بائسکوپ

فلم اور بائیسکوپ کی کلچرل پروگراموں میں ایک اہم جگہ ہے۔ فلم اور بائیسکوپ ڈرامے اور تھیٹر سے زیادہ مقبول ہیں ہندوستان میں فلم بنانے کے تین خاص مرکز بمبئی، کلکتہ اور مدراس ہیں۔ اچھی فلمیں عوام کی ذہنیت میں خوشگوار تبدیلی لانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ لوگ فلمیں دیکھتے ہیں اور اُس میں بتائی گئی اچھی اور مفید باتوں کو غیر ارادی طور پر اپناتے رہتے ہیں۔ مگر ابھی تک ہمارے دیش میں اس طرح کی فلمیں بہت کم تیار کی گئی ہیں۔ جن فلم سازوں نے اس طرح کی فلمیں بنائی ہیں، ان کے کارناموں کی عوام نے دل کھول کر قدر نہیں کی ہے، کیونکہ سستے قسم کی فلموں کی بھرمار نے عوام کے مذاق کو بہت پست کر دیا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ فلموں سے سماجی تعلیم کے کاموں میں مدد لی جائے تو شہری علاقوں میں کام کرنے والی سوشل ایجوکیشن کی سنستھاؤں کو لوگوں میں اچھی اور بُری فلموں میں تمیز کرنے کا شعور پیدا کرنے کی تحریک چلانی ہوگی۔ فلموں پر مباحثے کی انجمنیں بنائی جائیں اور ان کی رائے کو اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ عوام تک پہونچایا جائے۔ ہماری حکومت کا فلم ڈویژن اطلاعاتی تصویروں کے بنانے پر بہت توجہ دے رہا ہے اور اس پر کافی روپے پیسے صرف کر رہا ہے۔ اگر یہ فلم ڈویژن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی فلمیں اثر پذیر انداز میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی بنیاد پر تیار کی جائیں تو وہ سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

بھجن منڈلیاں

جنگ آزادی کی تواریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو ایک بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ مہاراشٹر اور بنگال کے دیہاتی علاقوں میں بیداری پیدا کرنے میں وہاں کی بھجن منڈلیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہ بھجن منڈلیاں صبح اور شام گاؤں گاؤں گھوما کرتی تھیں اور لوگوں کو بھجنوں کے دلفریب نغموں سے آزادی کی لڑائی کے لئے تیار کرتی تھیں۔ آج بھی یہ بھجن منڈلیاں عوام کی تعلیم و تربیت کا بہت بڑا کام انجام دے سکتی ہیں اور اپنے بھجنوں کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کے نئے نئے مقاصد اور خوشگوار تبدیلیوں سے روشناس کرا سکتی ہیں۔

اگر سرکاری محکمے اور سوشل ایجوکیشن کے کارکن کلچرل پروگراموں کے مندرجہ بالا معقولوں کو اپنائیں تو اس سے عوام کی صحت مند تفریح ہی نہیں ہوگی بلکہ انھیں اخلاقی، سماجی اور قومی بیداری کا پیغام بھی ملے گا۔

ہیں۔ کتنے ہی لوگ مذہبی تہواروں پر مذہبی ناٹکوں کے تماشے دیکھتے ہیں تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کے لوگوں کے لئے دہلی اور نئی دہلی کے نئے ڈھنگ کے اسٹیجوں پر طرح طرح کے ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس میدان میں تھری آرٹس کلب" "انڈین نیشنل تھیٹر" وغیرہ کے کام قابل قدر ہیں۔ دہلی کے دیہاتی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ناٹک منڈلیاں ہیں جو مذہبی تہواروں اور دوسرے میلوں ٹھیلوں کے موقع پر لوک ناٹک پیش کرتی ہیں۔

سوشل ایجوکیشن کے مقاصد کے پیش نظر ان کلبوں یا منڈلیوں کی ترقی اور سدھار اور ان کے مناسب انتظام کی بہت سخت ضرورت ہے۔

نئے ڈھنگ کے اسٹیج جو سوشل ایجوکیشن کے میدان میں بہت مددگار ہو سکتے ہیں عوام کی زندگی سے بہت دور ہیں۔ وہ عوام کی زندگی کی عکاسی نہیں کرتے۔ ڈراموں کو تو عوام کی زندگی سے قریب ہونا چاہئے۔ اُسے زندگی کے مسائل کو چھیڑنا چاہئے اور عوام کو اُن باتوں کی طرف سے بیدار کرنا چاہئے اور یہ باتیں اس ڈھنگ سے پیش کی جانی چاہئیں کہ لوگ اپنی زندگی کی بُرائیوں کو دور کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

دیہاتی اسٹیجوں پر تو ابھی تجربے ہی بہت کم ہوئے ہیں۔ دیہاتوں میں مختلف قسم کے ناٹک ہوتے ہیں۔ اگر ان کے ذریعہ آج بھی سماجی مسائل کی عکاسی کی جائے اور جدت پیدا کی جائے تو ڈرامہ اسٹیج سوشل ایجوکیشن کا موثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس طرح کا تجربہ ریاست اندھرا کے دیہی علاقوں میں ایک مشہور ناٹک منڈل نے کیا ہے۔ اور یہ تجربہ بہت ہی کامیاب رہا ہے۔ اس ناٹک منڈل نے ریاست اندھرا میں مروجہ دو طرح کے ڈرامہ اسٹیجوں و دھی ناٹکم (اوپن ایر تھیٹر) اور برا کتھا پر تجربے کئے ہیں اور اس کے ذریعہ گاؤں کے لوگوں کو زندگی کے نئے نئے مسائل اور زندگی کے نئے نئے آدرشوں سے روشناس کرایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں دلی کے ناٹیہ سنگھ کو دہلی کے سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے تعاون سے اس طرح کے تجربے دہلی کے دیہاتی علاقوں میں بھی کرنے چاہئیں۔

علاوہ ازیں سوشل ایجوکیشن کے کارکن اپنے علاقے میں معمولی اسٹیجوں کا استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ جو ڈرامہ کمیونٹی سینٹرول میں آنے والے خود کھیلیں گے اُس کی اہمیت اُس ڈرامے سے کہیں زیادہ ہوگی جو کہ شہروں کی ناٹک منڈلیاں یا آل انڈیا ریڈیو کے ڈرامہ یونٹ گاؤں والوں کے سامنے پیش کریں گے۔ اسٹیج، سوشل ایجوکیشن کا بہت ہی مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر اس کے اہتمام میں مشہور آرٹسٹوں کے علاوہ سوشل ایجوکیشن کے کارکن بھی حصہ لینے لگیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کارکنوں کو ڈرامہ کے اصولوں وغیرہ کی علمی واقفکاری ہو۔ سوشل ایجوکیشن کی سنستھاؤں کو چاہئے کہ وہ اپنے کارکنوں کے لئے وقتاً فوقتاً اس طرح کی ٹریننگ کا انتظام کریں تاکہ وہ ایسے پروگراموں کو دلچسپ اور خوشگوار بنا سکیں۔

پڑھنے کی صلاحیت سے ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ۱۹۵۶ء میں تیار کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق فی ایک ہزار افراد میں سے صرف ۱۶۶ ہی خواندہ ہیں یعنی وہ لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ عورتوں میں تو یہ حالت اور بھی گئی گذری ہے۔ تعلیم یافتہ سے مراد ہوتی ہے، مہذب، ترقی پسند اور بیدار مغز ہونا۔ یہ منزل تو ابھی ہم سے بہت دور ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسی حالت میں ہم جمہوری نظام کو کس طرح کامیاب بنا سکتے ہیں؟ اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہم ملک میں خواندگی اور تعلیم کی توسیع کریں۔

خواندگی کی توسیع کے لئے ہندوستان میں ایڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک ویسے تو ۱۹ویں صدی کے وسط میں ہی شروع ہوگئی تھی مگر اس وقت یہ کام بہت سست رفتار سے ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے تک اس کے تحت کچھ شہروں میں خاص طور پر بمبئی اور بنگال کے صوبوں میں صرف شام کی کلاسیں کھولی گئیں۔ اُس وقت کتب خانے جو ایڈلٹ ایجوکیشن کا ایک اہم ذریعہ ہیں بہت کم تھے اور بہت دور دور پر قائم تھے۔ صرف بڑودا ریاست ہی ایسی تھی جہاں گاؤں گاؤں میں کتب خانے قائم تھے۔ ایڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک میں میسور ریاست نے بھی نمایاں حصہ لیا اور وہاں ۶ ہزار سے ۷ ہزار تک خواندگی کی کلاسیں کھولی گئیں اور ساتھ ہی کتب خانوں کا جال بھی پھیلایا گیا۔ ۱۹۲۷ء تک بمبئی اور پنجاب کے صوبوں میں خاصا کام ہوا۔ اُن دنوں تحریک آزادی کے تحت مختلف تعمیری کاموں میں ایڈلٹ ایجوکیشن بھی ایک شمار کرلی گئی تھی اور جیسے جیسے سیاسی شعور اور بیداری لوگوں میں پھیلتی گئی ویسے ویسے خواندگی اور تعلیم کی طرف ان کی توجہ بڑھنے لگی۔ ملک میں کوآپریٹو تحریک سے بھی ایڈلٹ ایجوکیشن کو کافی تقویت ملی اور اُس کے تحت بالغوں کے لئے کئی مدرسے کھولے گئے۔ مگر ۱۹۳۰ء میں سیاسی بے چینی اور کھلبلی کا نتیجہ اس تحریک پر بھی پڑا اور مختلف اقتصادی اسباب سے بھی اس کی رفتار میں کافی رکاوٹیں پیش آئیں۔ ۱۹۳۷ء میں کچھ صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کے قیام سے ایک بار پھر اس تحریک کو تقویت ملی۔ کانگریسی وزیروں نے اسے لوگوں میں سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کا ایک آلہ کار بنایا اور اس کی ترقی کی حتی الامکان کوشش کی بیشتر صوبوں میں کتب خانے قائم کئے گئے مگر دوسری عالمی جنگ سے ایک بار پھر اس تحریک کو دھکا پہنچا اور ۱۹۴۲ء کے بعد تو لوگوں کی تمام تر توجہ سیاسی محور پر ہی مرکوز ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء میں سوراج کے ملنے اور قومی حکومت کے قیام کے بعد یہ کام پھر مختلف شکلوں میں شروع ہوگیا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

آج تعلیم کی مختلف شکلوں میں جیسے بنیادی تعلیم وغیرہ کے ذریعہ قومی تعلیم کی توسیع اور لوگوں میں

آج کا ہندوستان اور بالغوں کی تعلیم

ایک وقت تھا جب ہندوستان بہبودی اور خوش حالی کے بلند مقام پر پہونچ کر دنیا کے دوسرے ملکوں کے لئے علم کا گہوارہ اور تہذیب و تمدن کا نمونہ بنا ہوا تھا ــــــــــ دراصل کرہ ارض پر علم کے سورج کی پہلی کرنیں ہندوستان میں پھوٹیں اور بعد میں دھیرے دھیرے ساری دنیا اس سے روشن ہو اٹھی مگر وقت نے پلٹا کھایا اور عہد وسطیٰ میں ہندوستان ایک بار پھر تنزلی اور پستی میں جا گرا کئی سو سال بعد تک وہ غیر ملکی اقتدار کے زیر اثر ظالموں کی خود غرضانہ سیاست کا شکار بنا رہا اور ہر طرف تاریکی چھانے لگی۔ سماجی، اقتصادی، علمی اور سیاسی سبھی میدانوں میں لوگ غلامی کی گہری نیند میں ڈوب سے گئے مگر وقت نے پھر کروٹ بدلی اور لوگ صدیوں کی غفلت سے چونک پڑے۔ آج کا ہندوستان بیدار اور ترقی پذیر ہندوستان ہے۔ سیاسی میدان میں اس نے آزادی حاصل کر کے جمہوری نظام کی نئی داغ بیل ڈال دی ہے اور سماجی، اقتصادی اور علمی میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

آج ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ ماضی کے ہندوستان اور نئے اور ترقی پذیر ہندوستان کے بیچ جو ایک لمبا عرصہ گذرا ہے اور اس بیچ میں ہندوستان کی جو تنزلی ہوئی ہے اُسے کیسے دھیرے دھیرے دور کیا جائے؟ برسوں کی چیزیں یکایک دور نہیں کی جا سکتیں۔ مثال کے لئے آج لوگ غیر تعلیم یافتہ، غریب اور پس ماندہ ہیں۔ اُنھوں نے سیاسی میدان میں آزادی حاصل کر لی ہے مگر جس جمہوری نظام کا قیام کیا ہے اس کی پوری پوری کامیابی ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔ آج ہمارے زیادہ تر ساتھی نہیں سمجھتے کہ ریاست، حکومت اور جمہوریت کیا چیزیں ہیں؟ یہ ہمارے لئے نہ صرف دُکھ بلکہ شرم کی بات ہے۔ آج ہمارے سماجی اور اقتصادی نظام زندگی میں سدھار لانے کے لئے حکومت طرح طرح کے منصوبے بنا رہی ہے مگر لوگ ہیں کہ اپنی عدم واقفیت کی بنا ان میں پوری طرح ہاتھ نہیں بٹا پا رہے ہیں اس طرح ہماری ترقی میں کافی رکاوٹیں حائل ہو رہی ہیں۔ ان سب کا سبب عوام میں شعور اور تعلیم کی کمی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

آج ہندوستان کے زیادہ تر لوگ نہ صرف یہ کہ غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ ناخواندہ بھی ہیں ناخواندگی سے مراد لکھنے

سمت میں موڑ لینا آسان ہوتا ہے. مگر ایک سیانا آدمی سمجھدار اور باشعور ہوتا ہے۔ اپنے آس پاس کے ماحول سے وہ اثر پذیر ہوتا رہتا ہے، لہٰذا ان کا نفسیاتی مطالعہ کرکے اور ایک دوستانہ فضا پیدا کرکے ہی اُنھیں کسی بات کے لئے آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ اُن میں خود اعتمادی اور طرحداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اس کا بھی پورا پورا دھیان رکھنا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی دن بھر اپنی روزی روٹی کمانے کے بعد رات کو یا فرصت کے وقت ہی ان کی تعلیم کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس بات کا بھی دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ جس تعلیم کا ہم اُن کے لئے انتظام کر رہے ہیں وہ ان کے لئے بوجھل نہ ہو جائے اس کے لئے پہلے تفریحی سازوسامان کے ذریعہ ان کے ذہنوں کو تازہ کیا جائے اور پھر ان کی دلچسپی کے ایسے ہی مضامین کی تعلیم دی جائے جو ان کے کام دھندے یا روزمرّہ کی زندگی میں کام کے ہوں، تب ہی انھیں تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ کبھی اس میں دلچسپی نہیں لیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شروع میں اُنھیں ناٹک، بھجن، فلم، نمائش، مشاعرے اور میلوں ٹھیلوں کی مدد سے پڑھائی کی طرف متوجہ کیا جائے اور بعد میں زراعت، باغبانی اور گاؤں کے دوسرے گھریلو دھندوں کی تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد اپنے آپ ہی وہ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ملکی اور غیر ملکی مسائل میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ ایک بار خواندہ بنا دینے کے بعد اُن حاصل کی ہوئی صلاحیتوں کو برقرار رکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی آسان اور دلچسپ کتابوں کے کتب خانے اور اخبار و رسائل فراہم کئے جائیں. خوشی کی بات ہے ہماری حکومت اس طرف خاص طور پر توجہ دے رہی ہے.

آج ہندوستان کی ۳۶ کروڑ آبادی میں سے صرف ۷ کروڑ افراد خواندہ ہیں. سرکار نے پنج سالہ منصوبے میں ۱۴ سے ۴۰ سال کی عمر کے ۳۰ فیصدی آدمیوں کو خواندہ بنانے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس میں ۱۰ فیصدی عورتیں بھی شامل ہیں، مگر یہ کافی نہیں ہے۔ آئندہ منصوبوں میں بھی یہ کام جاری رہے گا جب تک کہ سارے عوام تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں. دراصل بالغوں کی تعلیم، سماجی تعلیم کے وسیع شکل کی پہلی منزل ہے. تعلیم بالغان کے پروگرام کے تحت خواندہ بن کر ہی لوگ کتب خانوں، ریڈیو، فلم، تقریر اور جدید سائنسی ذرائع سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ اس سے نہ صرف لوگوں کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوگی بلکہ سماجی معیار میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوگی، اور ملک و قوم کی تہذیب تمدن، وحدت اور امن و امان میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

لیڈرشپ، شہریت اور اعلیٰ سماجی زندگی کے شعور پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح آزادی پا لینے کے بعد سے بالغوں کی تعلیم نے سماجی تعلیم کی ایک وسیع شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے تحت نہ صرف لوگوں کو حرف شناسی کرائی جاتی ہے بلکہ اُنھیں ایک مہذب انسان اور ایک اچھا شہری بھی بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں "مرکزی صلاح کار کمیٹی نے" ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی" مقرر کی، جس نے سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کا ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس کے پروگراموں کا خاص مقصد خواندگی، صفائی اور اُس کی اہمیت کا احساس، اقتصادی زندگی میں سدھار، حقوق اور فرائض کا علم، شہریت کی تعلیم اور تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم کی توسیع کرنا قرار پایا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہم بدلتے ہوئے ہندوستان میں بالغوں کی تعلیم کا اپنا ایک مقام ہے۔ آج ہندوستان میں جس جمہوری نظام کا قیام ہوا ہے اس کی کامیابی کی کنجی ایڈلٹ ایجوکیشن کے ہاتھ ہی میں ہے۔ جب تک ہمارے ملک کا ہر شہری خواندہ بن کر سماج، ملک اور حکومت کے متعلق موٹی موٹی باتوں کی جانکاری نہیں پا لے گا، اس وقت تک وہ اپنے حقوق و فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ آج ہمارے یہاں انتخابات ہوتے ہیں مگر گاؤں میں وہ انتخابات غیر جانبدارانہ نہیں ہو پاتے۔ لوگ اپنی رائے کی اہمیت اور جمہوری نظامِ حکومت میں اپنی حیثیت کو نہیں سمجھتے اور زور دباؤ اور لالچ میں آ کر اپنی رائے کا غلط استعمال کر بیٹھتے ہیں۔ نمایندوں کو ایک بار چن لینے کے بعد وہ ان کے کاموں پر نظر نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔ ان سب کا اثر قوم و ملک اور نظامِ حکومت پر پڑتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں جمہوری نظام کی کامیابی اور بقا یہاں کے شہریوں کی صحیح تعلیم پر ہی منحصر ہے، جس کے بیج ایڈلٹ ایجوکیشن یا اور وسیع شکل میں سوشل ایجوکیشن میں بکھرے پڑے ہیں۔

اسی طرح آج ملک کی سماجی، صنعتی اور اقتصادی خوش حالی کے لئے ہماری قومی حکومت منصوبے بنا رہی ہے، جن کی کامیابی عوام کے گہرے تعاون اور ان کے جوشِ عمل پر منحصر ہے۔ یہ بھی اُسی وقت ممکن ہوگا جب یہاں کا ہر باسی تعلیم یافتہ ہو جائے۔ آج منصوبوں پر کام کرنے کے لئے کارکن جب گاؤں میں جاتے ہیں تو گاؤں کے غیر تعلیم یافتہ لوگ اُنھیں شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی غریبی اور کم مائگی اُنھیں کوئی بھی کام کرنے سے مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اندھی تقلید، فضول خرچی اور روایاتی اعتقادوں کے چنگل میں بُری طرح پھنسے ہوئے اپنی طاقت اور توانائی سے بے خبر ہیں۔ ایڈلٹ ایجوکیشن انھیں اس سمت میں بیدار کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ بالغوں کی تعلیم کی کیا شکل ہو؟ ظاہر ہے کہ بچوں اور سیانوں کی تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بچے تازہ دم، سیانے اور کسی بات کی طرف جلدی رجوع ہو جانے والے ہوتے ہیں، اس لئے انھیں کسی بھی

میں کہا، یہاں کون پڑھے گا!! سارے دن کھیتی کرتے ہیں، لڑکے بچے دن بھر جنگل میں گورو ڈنگر چراتے ہیں، پڑھنے والا ہے ہی کون؟ پھر بھی جو پڑھے اُسے پڑھاؤ۔"

خیر اُس رات کو کھاپی کر سو گیا۔ دوسرے دن لوگوں سے بات چیت کی لیکن کوئی اُمید افزا جواب نہ ملا۔ پھر محکمہ کی ہدایت کے مطابق پاس کے گاؤں کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ملا تو وہ اور اُن کے ایک مددگار اُستاد اور ہائر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل صاحب میری مدد کو گاؤں میں آئے۔ گاؤں میں گھوم پھر کر اپنے ذاتی اثر سے انھوں نے اسکول کے لئے لوگوں کو ہموار کیا اور ۵ طالب علموں کی فہرست میرے حوالے کر دی اور ایک کچا سا مکان جو برسات کے دنوں میں گاڑی رکھنے کے کام آتا تھا تین روپے ماہانہ کے کرایہ پر دلا کر واپس لوٹ گئے۔

دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی میں نے اسکول کی جگہ کی صفائی کرا کر بچوں کو بلایا اور دو لڑکوں کو لے کر اسکول شروع کیا۔ اب سوال تھا لڑکوں کو اسکول میں لانے کا۔ جس کے لئے میں نے اپنے بھر سک پوری کوشش کی۔ مگر بہت دنوں تک اسکول میں لڑکوں کی تعداد دس پندرہ سے اوپر نہ بڑھ سکی۔ میں لڑکوں کے والدین سے کئی بار مل چکا ہوں، پھر بھی وہ انھیں اسکول نہیں بھیجتے۔ لڑکوں کو بہت پیار اور محبت سے پڑھاتا ہوں پھر بھی وہ اسکول نہیں آتے۔ اُن کے بھلے بُرے کا احساس بھی اُنھیں دلایا ہے مگر کوئی اثر نہیں۔ یہی نہیں لوگوں کو لازمی تعلیم کے قانون کا بھی کوئی ڈر نہیں۔ ان قانونوں میں بتائی گئی سزا کا ڈر تو اُنھیں دلایا جاتا ہے مگر وہ عمل میں کبھی نہیں آتے، اس سے اُس کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

میں اس مسئلے پر اکثر سوچا کرتا ہوں، لڑکے پڑھنے کیوں نہیں آتے؟ یا والدین اُنھیں پڑھنے کیوں نہیں بھیجتے؟ تو ساری صورتِ حال میرے سامنے آجاتی ہے۔ لڑکوں کو ڈھور ڈنگر چرانے ہوتے ہیں۔ تین چار گایوں اور بچھڑوں کے پیچھے بھی وہ ایک لڑکے کو چرانے کے لئے بھیج دیں گے۔ بھینس اور پاڑے بھی الگ الگ بچے چراتے ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کو بھی یہی لڑکے کھلاتے ہیں، جس سے کہ سیانے آدمیوں کو اپنا کام کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے علاوہ فالتو وقت میں گوبر یا کنڈے اکٹھا کرنا، کام کی زیادتی کے وقت کھیتوں میں پانی دینا، نرائی اور چارے کا ٹنا وغیرہ سبھی کاموں میں بچے مددگار ہوتے ہیں۔ باپ کے کھانا کھاتے وقت کام بند نہ ہو اس لئے بھی بچے کا سارا دن کھیتوں پر رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان سب کاموں میں والدین کو ایک کھلا فائدہ دکھائی دیتا ہے۔ پھر وہ بچوں کو دن میں پڑھنے کیوں کیوں بھیجنے لگے۔

میرے لئے اب یہی ایک راستہ تھا کہ میں تعلیم کے فائدوں کا پرچار کروں۔ میں نے اُنھیں سمجھانا شروع کیا کہ بچے ہی نہیں اگر وہ بھی لکھنا پڑھنا سیکھ لیں تو کس طرح پڑھ لکھ کر وہ اپنے روپے پیسوں کا حساب کتاب رکھ کر بنیوں کے چنگل سے

کارکنوں کے خیالات

میں کیا کروں؟

"ہمارے گاؤں جیسا ماسٹر دُور دُور تک نہیں ہوگا، دیکھو وہ تو بچّوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ گاؤں میں اکیلا کر کے اس نے اسکول بنوا دیا۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو نیا گاؤں کے رہنے والے اپنی بھولی بھالی زبان میں بغیر کسی مبالغے کے گاؤں کے اسکول کے ماسٹر کا ذکر آتے ہی کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہی الفاظ جب اُستاد اپنے سامنے سنتا ہے تو اس کا دل مسوس کر رہ جاتا ہے اس لئے اُس کے اسکول میں نہ تو دوسرے اسکولوں کی طرح لڑکوں کی تعداد ہی زیادہ ہے اور نہ اس کا اسکول کوئی بہت بڑا اسکول ہی بن پایا ہے۔

یہ نیا گاؤں اجمیر میں کیکڑی تحصیل کے پاس آباد ہے۔ جہاں کی آبادی ۶۰۰ کے قریب ہے جس میں ۹۰ فیصدی لوگ ایک ہی ذات کے ہیں، جو کھیتر، کہار یا کماوت کہلاتے ہیں دوسرے فرقوں میں سادھو، کھاتی، کُمہار، چمار اور بلائی ہیں جو کل مل کر آبادی کا ۱۰ فیصدی ہیں۔ گاؤں پتھاری زمین پر بسا ہوا ہے اور اکثر مکان پہاڑی کی کھوہوں اور پٹ پڑوں پر بنے ہوئے ہیں ایک اچھا مندر ہے اور اب ایک اسکول بھی بن گیا ہے بس یہی دو جگہیں ہیں جہاں سب لوگ آجا سکتے ہیں۔ ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلہ پر ڈائی ندی بہتی ہے اور جنوب میں گاؤں سے بالکل ملا ہوا ایک نالہ ہے جس کا پانی برسات کے دنوں میں گاؤں میں گھس جاتا ہے۔ پورب میں یہ نالہ ندی میں مل جاتا ہے صرف پچھم کی طرف گاؤں کے لئے قابلِ کاشت زمین ہے جو کنوؤں سے سینچی جاتی ہے۔

اس گاؤں میں آج سے چار سال پہلے اجمیر ریاست کے محکمہ تعلیم نے مجھے مقرر کیا تھا کہ میں وہاں جا کر ایک بیسک اسکول قائم کروں۔ میں نیا نیا ہی بیسک ٹریننگ لے کر نکلا تھا، نیا ہی اسکول کھولنا تھا اور گاؤں تو نیا تھا ہی۔ اس طرح نیا اسکول، نیا اُستاد اور نیا گاؤں سبھی کچھ نیا تھا۔ میں رات کے ۸ بجے نیا گاؤں پہونچا۔ سردی کا موسم تھا لوگ جگہ جگہ الاؤ جلا کر آگ تاپ رہے تھے۔ اُن سے بات چیت کی، مگر ان کے روئیے میں ایک روکھاپن ملا جو میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اسکول کھولنے کی بات سن کر تو سبھی نے ایک آواز

آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس

چودھواں اجلاس

آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کا چودھواں اجلاس ۲۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کا افتتاح مشہور مورخ ڈاکٹر کالی داس ناگ نے فرمایا۔ ڈاکٹر ناگ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ "اس وقت پوری دنیا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہندوستان نے اپنی آزادی کے دس سال میں کیا کیا کارنامے کر دکھائے ہیں، اپنی نظریں جمائے ہوئے ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں ناخواندہ عوام کو تعلیم کی نعمت سے بہرہ یاب کیا جائے تاکہ وہ جمہوریت کے فیوض سے فیض حاصل کرسکیں۔

ڈاکٹر ناگ کی افتتاحی تقریر کے بعد اجلاس کے صدر منتخب ریورینڈ بلاس چندر مکرجی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس کا خلاصہ اسی شمارے میں الگ سے دیا جارہا ہے۔

خطبۂ صدارت کے بعد "انسانیت کی اقدار" کے عنوان سے ایک بزم مقالات منعقد ہوئی جس میں شری رنجیت ایم۔ چیت سنگھ، ڈاکٹر ایس۔ آر۔ رنگاناتھن اور شری کیسری ہنومان وغیرہ کے مقالات پڑھے گئے۔

اس کے بعد کانفرنس نے چند تجویزیں منظور کیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے

ایک تجویز کے ذریعے کانفرنس نے کہا

کانفرنس نے پروگراموں کے نتائج کا اندازہ کرنے والے بورڈ کی چوتھی رپورٹ اور نیشنل ڈیولپمنٹ کاؤنسل کی قائم کی ہوئی پلان، پروجیکٹ ٹیم کے مشاہدات کا مطالعہ کیا۔ وہ سمجھتی ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیموں کا خاص مقصد لوگوں میں وہ جوش و انہماک پیدا کرنا ہے جو انہیں کارکردگی اور مستعدی کی راہ پر لے جائیں، اُسے افسوس ہے کہ اسکیم کو لوگوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے میں اور انہیں اور ان کے اداروں کو اسکیم کی انجام دہی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے لئے آمادہ کرنے میں بس برائے نام

نجات پا سکتے ہیں۔ ایسی ہی ایک دلیل اور بھی دی کہ دیکھو پڑھے لکھے آدمیوں کی سماج میں کتنی قدر ہوتی ہے۔ اس پر اُن میں سے کوئی جواب دیتا کہ سرکار سے لکھ کر کھیتی کرنے والے منگوا لو یا ہمکو روٹی اور کپڑا دلوا دو تو ہم سبھی پڑھنے لگیں۔ ایسی حالت میں ان سے شام کی کلاسوں میں آنے کے لئے ہی کہتا جس میں کچھ مویشیوں اور کھیتوں کی رکھوالی کے بہانے ٹل جاتے ہیں کچھ "بوڑھے طوطے پڑھنا نہیں سیکھ سکتے" کہہ کر اپنے آپ کو بری سمجھ لیتے ہیں۔ پھر جو کچھ پڑھنے آتے بھی ہیں وہ دستخط کرنا بھر سیکھ کر اپنے آپ کو سپھل سمجھتے ہیں۔ کچھ ایک ایسے ہیں جنھوں نے پڑھ کر اپنی زندگی میں فائدہ اُٹھایا ہے جیسے یہاں دو دکانیں وغیرہ کھولی ہیں۔ ایک آدھ سیانے آدمی ایسے ہیں جو قصہ کہانی اور بھجن کیرتن کے ذریعہ اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اب اسکول کے لئے ڈیولپ منٹ ڈپارٹمنٹ کی امداد سے دو پکّے کمرے بن گئے ہیں۔ گاؤں والے اسکول کے ماسٹر کے رویے اور کام سے مطمئن ہیں۔ وہ گاؤں کے ہر معاملے میں چاہے وہ پنچ پنچایت کا معاملہ ہو یا کوئی تقریب اسکول ماسٹر کو کبھی نہیں بھولتے۔ گاؤں پنچایت نے بھی محکمۂ تعلیم سے رجوع کر کے ماسٹر کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ اور گاؤں پنچایت کے پردھان تو کئی موقعوں پر اس بات کو دہرا چکے ہیں کہ ماسٹر صاحب نہ ہوتے تو برسوں سے چلنے والے آپسی جھگڑے کبھی نہ مٹتے اور نہ ہی گاؤں میں ایکا ہو کر اسکول بنتا۔

مگر اسکول ہے کہ اُس میں لڑکوں کی تعداد بڑھتی ہی نہیں !!

زیر نظر مضمون سے بہت سے دوستوں کو یہ احساس بھی ہوگا کہ میں کچھ مایوس سا ہو چکا ہوں اور اپنی کوششوں میں ناکام رہنے کی وجہ سے کچھ اپنے کو، کچھ گاؤں کو یا کچھ سرکار کو کوستا ہوں۔ مگر ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں تو قومی حکومت کا بیداری کا پیغام عوام تک پہونچانا ہی ہے۔ اس راستے میں کتنے ہی کانٹے اور کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں۔ ایک نہ ایک دن ہندوستانی عوام تعلیم کے اس پیغام کو ضرور سنیں گے اور تعلیمی منصوبوں کی کامیابی میں زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹائیں گے۔ اس یقین کے ساتھ ہمیں آگے قدم بڑھانا ہے، جو بڑھتا ہی جائے گا۔

دس نصاب چلائے جائیں گے۔ ان کورسوں میں یونیورسٹی کے باضابطہ طالب علموں کے علاوہ دو روپے فی کورس فیس ادا کر کے دوسرے لوگ بھی شریک ہو سکیں گے۔

جن مضامین کی تعلیم کے لئے یہ کورس چلائے جائیں گے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سائنس اور سائنٹفک خیال کی تاریخ۔ ۲ سائنس اور سماج۔ ۳ علوم طب (میڈیکل سائنس) کا ارتقا۔ ۴ سائنس اور مشین کا زمانہ۔ ۵ ہندوستان کی مرتب و منضبط معیشت۔ ۶ ۱۹۴۵ء کے بعد سے اب تک کے بین الاقوامی حالات۔ ۷ جدید سیاسی نظریات۔ ۸ فلسفے کا تعارف۔ ۹ ہندی اور جدید انگریزی ادب۔

اس شمارے کے لکھنے والے:-

سری مدن لال کپور ــــ دہلی میونسپل کمیٹی کے سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں آپ اسسٹنٹ سوشل ایجوکیشن آفیسر ہیں۔ یہ مضمون شری کپور نے سوشل ایجوکیشن ڈے کے موقع پر پڑھا تھا۔

شری شمس الدین ــــ آپ مدھیہ پردیش کے ایک معلم ہیں۔ آپ بنیادی تعلیم کے موضوع پر اکثر (بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایم۔ ایڈ) لکھا کرتے ہیں

شری رام سہائے ــــ آپ اجمیر کے ایک بیسک اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ سوشل ایجوکیشن سے آپ کو کافی دلچسپی ہے۔

کامیابی ہوئی ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروجیکٹوں میں سوشل ایجوکیشن کے منصب کو وضاحت اور صفائی سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔

ان سب باتوں کے پیش نظر کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کا منصب لوگوں میں نئی سماجی اقدار کی تربیت کر کے جو ترقی و تعمیر کی اسکیموں کے منشا کے مطابق ہوں ان کے سماجی کارکردگی اور مستعدی کی جوت جگانا ہونا چاہیے۔

۳۔ ریزولیوشن کے ذریعے کانفرنس نے کہا کہ

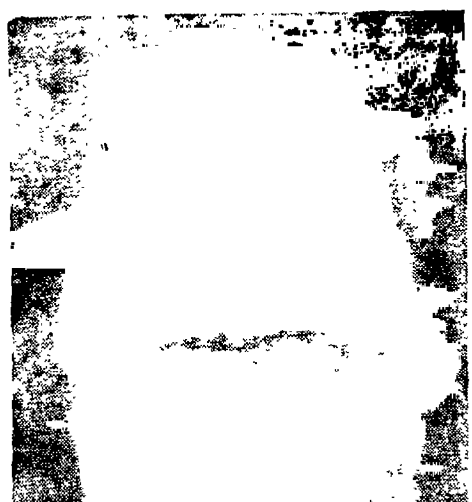
"یہ کانفرنس پلان کے منصوبوں کا جائزہ لینے والی ٹیم (پلان پروجیکٹ ٹیم) کی سفارشات کا خیر مقدم کرتی ہے کہ تعمیر و ترقی (ڈیویلپمنٹ) کی ذمے داری مقامی بااختیار جماعتوں پر ہونی چاہئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کی تقسیم لامرکزی اصول پر ہونی چاہئے۔ اس سلسلے میں کانفرنس اس بات کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ ان مقامی بااختیار جماعتوں کو اس بڑی ذمے داری کو اٹھانے کے قابل بنانے میں سوشل ایجوکیشن کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ کانفرنس حکومت سے پُرزور سفارش کرتی ہے کہ وہ ایسی پالسی پر عمل کرے جس کے اثر سے غیر سرکاری اداروں کو ابھرنے اور نئے اداروں کے قیام میں مدد ملے اس لئے کہ جب مقامی بااختیار جماعتیں کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کا پروگرام اپنے ہاتھ میں لیں گی اس وقت یہی غیر سرکاری ادارے عوام کو ان پروگراموں میں اپنی رضا و رغبت اور وابستگی کے ساتھ حصہ لینے کے لئے اچھی طرح تیار کریں گے۔"

دہلی یونیورسٹی کی ایک نئی اسکیم

دہلی یونیورسٹی نے عام تعلیم[۱] کی ایک اسکیم پہلے سے چلا رکھی ہے۔ اب اسی کے ساتھ اس نے "خصوصی تعلیم" کی ایک چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس اسکیم کے ماتحت چند مضامین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے فی نصاب دس لیکچر کے حساب سے

[۱] عام تعلیم (جنرل ایجوکیشن) ادھر کچھ عرصے سے ایک نئی اصطلاح کے طور پر استعمال کی جانے لگی ہے جس کا مقصد ہے کہ کسی ایک علم یا فن میں مہارت خصوصی حاصل کرنے والوں کو جو علم کی دوسری شاخوں سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں، عام تعلیم پہنچائی تاکہ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے یکسر ناواقف نہ رہیں۔

تعلیم و ترقی



The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

Printer and Publisher : BARKAT ALI Firaq : Printed at Rama Krishna printing Press Delhi.

ادارۂ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم وترقی (دہلی)

جلد ۹ — فروری سنہ ۱۹۵۸ء — شمارہ نمبر ۲

بانی: شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر
برکت علی فراق
رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ جامعہ نگر (نئی دہلی)
ٹیلیفون نمبر ۴۲۴۶۱
قیمت۔ سالانہ چار روپے

[illegible]

اشارات

مولانا ابوالکلام آزاد

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو رات کے ڈھائی بجے اس دارِ فانی کو چھوڑ کر جنت کی راہ لی۔ ان کی صحت کے بارے میں لوگوں کو تشویش تو اُسی وقت پیدا ہو گئی تھی جب ان کے اوپر تین دن پہلے فالج کا حملہ ہوا۔ ان تین دنوں میں ان کی حالت کے باب میں ہر آدھ گھنٹے پر جو خبرنامہ شایع ہوتا تھا اُسے پڑھنے اور ریڈیو پر جو خبریں نشر کی جاتی تھیں اُنھیں سننے کے لئے ہر چھوٹا بڑا بے تاب نظر آتا تھا۔ اور ۲۲ فروری کی صبح کو ان کی آخری زیارت کرنے اور ان کے جنازے میں شریک ہونے کی غرض سے لوگوں کا ہجوم انسانوں کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جن لوگوں نے گاندھی جی کے جنازے کا منظر دیکھا تھا ان کا متفقہ بیان ہے ——— اور جس کی تصدیق معتبر اور محتاط اخبارات کے نمایندوں نے بھی کی ہے ——— کہ دلی میں گاندھی جی کے بعد ماتم گساروں کا اتنا بڑا اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

اگر رسم کی پابندی کا خیال نہ ہوتا تو ہم مولانا کی وفات کی صرف خبر شائع کرنے پر اکتفا کرتے اس لئے کہ مولانا کی شخصیت اور عظمت کو سمجھنا اور اُس کا احاطہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ البتہ ظاہری شواہد سے اگر ان کی عظمت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو یہ واقعہ ہے کہ ہمارا محبوب وزیر اعظم مولانا کی جدائی پر مسلسل آنسو بہا رہا تھا۔ ملک کے اصحاب رائے میں سے قریب قریب سب نے اپنی اپنی رائے کا اظہار فرمایا مگر بیان کے نام سے نہیں کچھ کہا تو جواہر لال نہرو نے۔ سب پر ظاہر ہے کہ "اپنوں" کے غم کا جو اظہار آنسوؤں کی زبان سے ہوتا ہے وہ الفاظ کی زبان سے نہیں ہو سکتا اور نہ ایسے موقعوں پر مرنے والے کے "اپنے" اس زبان کا کبھی استعمال ہی کرتے ہیں۔

ترتیبِ مضامین

اشارات

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

کرکے انسان کامل انسان بنتا ہے۔ مولانا آزاد کی پوری زندگی انہی اصول و اقدار کی پرستش میں گذری، اور اس حیثیت سے دیکھئے تو وہ ہمارے درمیان نہ صرف اس وقت کہ ہم ان کا ماتم کر رہے ہیں، موجود ہیں بلکہ رہتی دنیا تک موجود رہیں گے اور ہم ان کی زندگی سے مسلسل رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

خدا مولانا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر ۲۳ فروری ۵۸ء کو جامعہ برادری نے ایک تعزیتی جلسہ میں جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کی تھی، ایک ریزولیوشن پاس کیا۔ ریزولیوشن میں کہا گیا ہے

مولانا آزاد کا ہم سے ایسے وقت جُدا ہو جانا، ہندوستان کے لئے سانحۂ عظیم ہے، جس کی تلافی آسان نہیں ہے۔ مولانا صاحب کی شخصیت، ان کا علم وفضل اور سیاسی زندگی میں ان کا مرتبہ ایسا ہے جس کی نشانیاں اور اثرات ہم ملک کے چپے چپے پر محسوس کرتے ہیں۔

مولانا کی سیاسی فکر و نظر اور ان کا عزم وثبات، ہندوستان کی تاریخ آزادی کے روشن پہلو ہیں اور اُسی عظیم الشان شخصیت کی بصیرت کی یادگاریں وہ بے شمار ادارے ہیں جن کو ان کی اعانت اور مشورے سے فائدے پہونچے۔ لیکن ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ان کے تخلیقی کارناموں کی نمایاں مثال ہے اور ان کا واسطہ جامعہ سے اتنا گہرا اور قریبی رہا ہے کہ ہمارے لئے جامعہ کو ان کی ذات سے علیحدہ ہو کر دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہم بھی ہندوستان کے لاکھوں اور عالم اسلام کے بے شمار سوگواروں کے ساتھ مولانا کی رحلت پر شریک ماتم ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کو بلند مرتبوں سے سرفراز کرے اور ہم کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم سوشل ایجوکیشن کے کارکن مولانا کی شان میں کیا کہیں؛ ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کہنے کا حق نہ ادا نہ ہو سکے۔ تعلیم بالغان کا نیا تصور جو "سوشل ایجوکیشن" کے عنوان سے ملک میں رائج ہوا، اس کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ بالغوں کو تعلیم دینے والوں کا کارواں جب بھٹکا بھٹکا پھر رہا تھا، جس کی سمجھ میں جو راہ نظر آتی تھی اسی پر چل پڑتا تھا، تو مولانا نے دیکھا کہ اگر اس قافلے کو راہ پر نہ لگایا گیا تو یہ اسی طرح بھٹکتا پھرے گا، انھوں نے اپنی زندگی میں غالباً بالغوں کی تعلیم کا کبھی تجربہ نہیں کیا تھا، مگر یہ ان کی بصیرت کا فیض تھا کہ سوشل ایجوکیشن کے عنوان سے تعلیم بالغان کی انھوں نے وہ تعبیر کی کہ جس کسی نے اسے دیکھا اور پڑھا، اس نے بزبانِ حال یہ کہتا ہوا ایمان لے آیا کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور آج بالغوں کی تعلیم کا یہی تصور ہے جو صرف ہندوستان کے علمائے تعلیم ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کے ماہرینِ تعلیم کی بھی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

سوشل ایجوکیشن کی تحریک میں مولانا آزاد کی ایک اور اہم دین غیر سرکاری اداروں کی دریادلانہ امداد تھی۔ حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم نے مولانا کی رہنمائی میں سوشل ایجوکیشن کے غیر سرکاری اداروں کی دل کھول کر مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جو ادارے اور شخصیتیں مالی مشکلات کی وجہ سے دبی ہوئی تھیں، وہ ابھر آئیں اور سوشل ایجوکیشن کی تحریک کو چار چاند لگ گئے۔ آگے چل کر جب سوشل ایجوکیشن کی تحریک میں حکومتیں بھی عملی طور پر شریک ہو گئیں تو بہت ممکن تھا کہ غیر سرکاری اداروں کو امداد دینا کام کی تکرار سمجھ کر موقوف کر دیا جاتا، مگر غالباً اسی خطرے کی روک تھام کی غرض سے مرکزی وزارتِ تعلیم نے اپنے یہاں سوشل ایجوکیشن کا باقاعدہ سیکشن قائم کرنے کے باوجود غیر سرکاری اداروں کو امداد دینا بند نہیں کیا اور ظاہر ہے، ریاستی حکومتوں نے بھی یہی راہ اختیار کی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ابوالکلام آزاد اگر گوشت و پوست کے ایک زندہ مجسمے کا نام تھا، تو ہم مولانا کی رہنمائی سے محروم ہو گئے۔ مگر ہدایت و رہنمائی مٹی کے بنے ہوئے چلتے پھرتے پتلے سے عبارت نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مراد ہیں وہ زندہ جاوید اصول و اقدار جن کی پابندی

زندگی کے شخصی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور روحانی پہلوؤں میں بھی نمایاں طور پر نظر آئے۔

اس سلسلے میں دوسرا قدم جو اُٹھایا گیا وہ تھا سوشل ایجوکیشن کے مفہوم کو ابہام سے پاک کرنا جو ابھی تک باقی چلا آرہا تھا۔ اس مقصد کے لئے واضح اور متعین سرگرمیاں مرتب کی گئیں جن کو حسب ذیل موٹے موٹے عنوانات کے ماتحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

معلومات میں اضافہ کرنے والی سرگرمیاں

ان سرگرمیوں کی فہرست مختصراً یہ ہے: ناخواندگی اور ناواقفیت کو دور کرنے کے لئے مہم بندی، خواندگی کی مہموں اور خواندگی کی کلاسوں کی تنظیم، طالب علموں اور اُستادوں کی مدد سے سوشل ایجوکیشن کے گرمائی کیمپ، صحت صفائی اور شہریت کے مضامین کی تعلیم دینے کے لئے بحث مباحثے کے حلقے قائم کرنا اور متعدد مشقی (فالو اپ) سرگرمیاں منظم کرنا اس غرض سے کہ کہیں سیکھی ہوئی باتیں لوگ بھول نہ جائیں۔ یہ مشقی سرگرمیاں متعدد اور مختلف قسم کی ہیں مثلاً نوسکھ بالغوں کے لئے مخصوص کتابوں اور دوسرے مواد کی تصنیف واشاعت، ایک دیواری اخبار اور سہل زبان میں ایک رسالے کی اشاعت، لکھائی پڑھائی کے کلبوں کی تنظیم، دیہی گشتی کتب خانے قائم کرنا۔ ریڈنگ روم اور ریڈیو کے پروگرام سنانے کے لئے ریڈیو سٹ لگانا اور دکھا سناکر تعلیم دینے والے آلات کا استعمال جیسے فلم، فلمچے (فلم اسٹرپ) بائیسکوپ، پوسٹر، گشتی نمائشیں وغیرہ۔ ان سرگرمیوں کا دوسرا اہم پہلو اس بات کی کوشش کرنا تھا کہ لوگ کھیتی باڑی، گھریلو صنعتوں، گھربار کے انتظام اور مکان کی تعمیر وغیرہ میں نئے نئے اور ترقی یافتہ طریقے سیکھیں اور اختیار کریں۔

تنظیم کا شعور اُبھارنے والی سرگرمیاں

ان سرگرمیوں کا منشا لوگوں کو حلقے اور ٹولیاں منظم کرنے کی تعلیم و ترغیب دینا ہے، تاکہ ان کے درمیان جو اچھی اور صحت مند سرگرمیاں شروع کی جائیں ان کی سنستھائیں بن جائیں اور اس طرح وہ ان کی سماجی زندگی کا جزو بن کر ایک زبردست سماجی قوت کی شکل میں رونما ہوں۔ لوگوں کی مدد کرکے اُن سے نوجوان کلب بنوانا، سہیلی سبھائیں قائم کرانا، بال سبھائیں، امداد باہمی کی انجمنیں، اور گرام رکشا دل منظم کرانا اور دوسرے انہی سرگرمیوں کی صنف میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤں میں ایک برادری گھر کی تعمیر بھی ہے جو

کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں سوشل ایجوکیشن کا مقام

ہندوستان میں سوشل ایجوکیشن کی ابتدا صبحِ آزادی کے طلوع کے فوراً بعد ہوئی۔ یہ اسکیم گویا کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم کی ندیم تھی جو پہلے پنج سالہ پلان کے جلو میں ۱۹۵۲ء میں جلوہ گر ہونے والی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب سوشل ایجوکیشن کی اسکیم پر عمل شروع ہوا تو اس وقت بستیوں کی ترقی کے لئے ایک ہر حیثیت سے مکمل منصوبۂ عمل کا کوئی خیال نہیں تھا۔ لیکن اڈلٹ ایجوکیشن کی جگہ سوشل ایجوکیشن کا اختیار کیا جانا بڑی بامعنیٰ بات تھی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ محض خواندگی کی مہموں اور معلومات بہم پہنچانے والی سرگرمیوں سے اطمینان بخش نتیجے نہیں نکلیں گے۔ شروع شروع میں تو سوشل ایجوکیشن کا مفہوم بہت دھندلا دھندلا سا تھا۔ سیاسی آزادی حاصل ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ یہ اصول بھی مان لیا گیا تھا کہ ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق ہوگا۔ ان دونوں باتوں کا سخت تقاضا تھا کہ ناواقف اور ان پڑھ عوام کو تعلیم دینے کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہونی چاہئے۔ اس صورت حال میں سوشل ایجوکیشن کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آجاتا تھا۔ جب اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ جمہوریت کی تعلیم ہے یا اس کا منشا لوگوں میں شہریت کی تربیت کرنا ہے لیکن اگر ان باتوں کو عملی جامہ اس طرح پہنایا جاتا کہ لوگوں کو سمجھایا جاتا کہ جمہوریت کسے کہتے ہیں، یا یہ کہ ان کے ووٹ کی کیا قدر و قیمت ہے یا ملک کے دستور کا آسان زبان میں ترجمہ کر دیا جاتا تو ان کی اصل روح ختم ہو جاتی۔ .... ناواقف اور نیم ترقی یافتہ لوگ سیاسی آزادی کی قدر و قیمت اس وقت تک نہیں پہچان سکتے جب تک ان کی سماجی اور معاشی بدحالی کو دور کرنے والی سرگرمیاں منظم کر کے اُسے ٹھوس شکل میں ان کے سامنے نہ پیش کر دیا جائے۔ اس بات کے پیشِ نظر یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ سوشل ایجوکیشن عوام کے لئے کوئی بامعنیٰ چیز اگر ہو سکتی ہے تو اسی وقت جب اس کا رشتہ براہ راست ان کی زندگیوں سے ہو۔ اس طریقۂ فکر کو اختیار کرنے سے جو نتیجہ نکلا وہ تھا سوشل ایجوکیشن کا ایک جامع تصور اس معنی میں کہ یہ ایک خوش حال تر زندگی کی تعلیم ہے۔ یعنی ایسی تعلیم جس کے فیض سے زندگی کا م ہو، یا آرام و تفریح، ہر اعتبار سے مسرت و فراوانی میں بسر ہو اور اس مسرت و فراوانی کا عکس فرد،

ریاستی سرکار نے سوشل ایجوکیشن کی اس نئی اسکیم کا انصرام و انتظام محکمۂ تعلیمات عامہ کے سپرد کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی اس محکمے کے ماتحت ابتدائی، ثانوی اور دوسری تعلیم کے بہت سے ادارے کام کر رہے تھے اور اس کے پاس طالب علموں، اُستادوں اور نگرانی کرنے والے اور انتظامی عملے کی ایک زبردست فوج موجود تھی جو سوشل ایجوکیشن کے کام میں خوشی سے ہاتھ بٹا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ محکمے کے عملے میں اس نئے کام کی وسعت و مقدار کے لحاظ سے اضافہ بھی کیا گیا جس کی نوعیت حسب ذیل نقشے سے واضح ہوگی۔

سطح	موجودہ عملہ جو پہلے سے کام کرتا تھا	سوشل ایجوکیشن کے لئے مزید عملہ
ریاست	ڈائرکٹر تعلیماتِ عامہ	ایک ڈپٹی ڈائرکٹر جو سوشل ایجوکیشن کی پوری اسکیم کا انچارج تھا چار علاقائی افسر۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک سینما گاڑی تھی جو خاص اسی مقصد کے لئے بنوائی گئی تھی اور دکھا سُنا کر تعلیم دینے والے ساز و سامان سے لیس تھی ایک چیف ایڈیٹر جس کے سپرد نو سکھ بالغوں کے لئے کتابوں اور دوسرے تعلیمی مواد کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام تھا۔ چار مددگار ایڈیٹر اور چار مصنف چیف لائبریرین۔ دیہی ریڈیو سیٹوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ریڈیو انجینئر۔ کلرک اور منشی حسب ضرورت
قسمت (چار سے چھ ضلعوں کا علاقہ)	ڈیویژنل سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن	مددگار ریڈیو انجینئر
ضلع (۲۲)	ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز	سوشل ایجوکیشن کی نگرانی کے لئے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ انسپکٹر
تحصیل	چار مددگار انسپکٹر آف اسکولز	سوشل ایجوکیشن کی نگرانی کرنے کے لئے دو مزید مددگار انسپکٹرز
حلقہ (اوسطاً ۳۰ گاؤں کا)		پانچ سے سات سوشل ایجوکیشن ٹیچر ۵ سے ۷ تک شہریت کی تعلیم دینے والے ٹیچر
گاؤں	ابتدائی اسکولوں کے اُستاد	....

مختلف سماجی آسائشیں فراہم کرنے کے لئے ایک مرکز اور بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

تہذیبی اور تفریحی سرگرمیاں

ان سرگرمیوں کا پہلا مقصد ہے لوگوں کو اس بات کے لئے آمادہ اور منظم کرنا کہ وہ اپنے لئے اچھی اور صحت مند تفریح اور اپنے تہذیبی ذوق کی تسکین کا سامان اپنے آپ کریں۔ ان سرگرمیوں کی فہرست میں یہ چیزیں آسکتی ہیں: کھیل کود کے اکھاڑے فرشی اور میدانی کھیل، تربیت جسمانی کے آلات و وسائل، اور ڈراما سوسائٹی، بھجن منڈلی، اور دوسری تہذیبی ٹولیاں بنانا، رامائن، مہابھارت اور دوسری رزمیہ داستانوں کے قصے، لیکچر، بحث مباحثہ کے حلقے اور شعر خوانی وغیرہ۔

ان سرگرمیوں کی تنظیم میں اس بات کی خاص طور پر کوشش کرنی چاہئے اور لوگوں کو حوصلہ دلانا چاہئے کہ وہ تفریح اور دل بہلاؤ کے اپنے روایتی ذرائع مثلاً لوک ناٹک، لوک ناچ اور لوک گیتوں کو جاری اور بحال رکھیں۔ البتہ روایتی تہواروں، میلوں اور دوسرے رسوم کو منانے کے بارے میں لوگوں کو آمادہ کرنا چاہئے کہ وہ انھیں سلیقے اور خوش ترتیبی کے ساتھ منائیں۔ نمائشیں منعقد کرنا اور لوگوں میں تہذیبی ذوق و شوق کی پرورش کرنا بھی سرگرمیوں کی اسی فہرست میں آتا ہے۔

سماج کے پسماندہ طبقوں کے لئے مخصوص سرگرمیاں

ہمارے سماج میں عورتیں، اچھوت اور قبائلی فرقے بڑی پچھڑی ہوئی حالت میں ہیں۔ جن میں عورتیں خواہ وہ اونچے سماج ہی کا حصہ کیوں نہ ہوں، رسم و رواج کے ہاتھوں سماج سے کٹ کر رہ گئی ہیں۔ ان پسماندہ طبقوں کی حالت کو سدھارنے کے لئے جی جان لگا کر کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مخصوص سرگرمیاں مختلف علاقوں میں مختلف ہوں گی اور منصوبہ بندی ان کے مخصوص حالات و مسائل کے گہرے مطالعے کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔

مدھیہ پردیش کی خدمات

پنج سالہ پروگراموں کے پہلے کے دور میں سابق ریاست مدھیہ پردیش میں سوشل ایجوکیشن کے نئے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرکاری پیمانے پر بڑی منظم کوشش ہوئی تھی۔ اس کوشش میں راقم الحروف ابتداء ہی سے شریک تھا

بستیوں کی ترقی (کمیونٹی ڈیولپ منٹ) کا ایک چو طرفہ اور مربوط و منظم پروگرام یہی پروگرام پہلے پنج سالہ پلان کے ایک جزو کے طور پر کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کی شکل میں رونما ہوا اور اس کی انجام دہی کے لئے ۱۹۵۲ء میں ایک مخصوص محکمہ "کمیونٹی پروجیکٹ ایڈمنسٹریشن" کے نام سے قائم کیا گیا جسے اب کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کے انتظام کی مرکزی تنظیم کی شکل صورت میں جیسے جیسے کام میں پھیلاؤ آتا گیا، تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ اب اس کی آخری شکل حسب ذیل ہے:

حکومت ہند کی سنٹرل کمیٹی ——— پلاننگ کمیشن کی بنائی ہوئی کاموں کا اندازہ کرنے والی تنظیم۔

کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت ——— وزیر

سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری اور کئی انڈر سکریٹری

مختلف خصوصی فنون، زراعت، افزائش نسل، صحت، تعلیم، سوشل ایجوکیشن۔ آبپاشی، گھریلو صنعتوں نفع بخش صنعتوں وغیرہ کے لئے

279398

مشیر، ماہرین، ڈائرکٹر اور افسران خصوصی

پہلے کی ۲۹ ریاستوں کی جگہ ریاستوں کی نئی تنظیم کے مطابق اب کل ۱۴ ریاستیں اور مرکز کی ماتحتی میں چھ علاقے ہیں۔ ہر ریاست میں اس پروگرام کی انجام دہی کے لئے معمولاً ایک ڈیولپ منٹ کمشنر ہوتا ہے جس کی ماتحتی میں ریاست کے سائز کی مناسبت سے مختلف تعداد میں ڈپٹی ڈیولپ منٹ کمشنر اور اگر ضرورت ہوئی تو دو ایک ایڈیشنل ڈیولپ منٹ کمشنر بھی ہوتے ہیں۔ ضلعوں میں ضلع کا کلکٹر جو کہیں کہیں ڈپٹی کمشنر کہلاتا ہے، اپنے عہدے کی بنا پر ڈسٹرکٹ ڈیولپ منٹ افسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

بلاکوں میں کارکنوں کی تقسیم و تنظیم بلاکوں کے حلقۂ عمل کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مختلف وقتوں میں مختلف رہی ہے۔ شروع شروع میں کمیونٹی پروجیکٹ ہوتے تھے جو اوسطاً سو سو گاؤوں کے تین ڈیولپ منٹ بلاکوں پر مشتمل ہوتے تھے اور جن کی مجموعی آبادی ۶۶ ہزار کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ اس وقت سو سو گاؤوں کے ڈیولپ منٹ بلاکوں کے اسٹاف کے علاوہ مرکزی عملہ ایک پروجیکٹ ایکزی کیوٹیو آفیسر اور ایک چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر پر مشتمل ہوتا تھا۔

اب یہ نقشہ بدل گیا ہے اور عملے کی تنظیم سو سو گاؤوں کے ڈیولپ منٹ بلاکوں کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے۔ یہ ڈیولپ منٹ بلاک ابتداء میں نیشنل ایکسٹنشن سروس بلاک (این۔ ای۔ ایس بلاک) کہلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ مدھیہ پردیش کی سوشل ایجوکیشن اسکیم کے ماتحت کارکنوں کی ٹریننگ کے لئے ایک ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بھی بنانے کا ارادہ تھا۔ مگر اس کی راہ میں بہت سی دشواریاں تھیں، ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی یہ اسکیم نوعیت کے اعتبار سے اپنی قسم کی پہلی چیز تھی۔ ٹریننگ کا نصاب اور طریقے نئے سرے سے وضع کرنا تھے جن کی بنیاد ٹھوس تجربات کے اوپر ہوتی، مگر یہ تجربات سوائے خواندگی کے محدود میدان کے دوسرے کاموں اور منصوبوں کے بارے میں دستیاب نہ ہو سکے۔ اگر سوشل ایجوکیشن کی یہ اسکیم بدستور محکمۂ تعلیم کے ماتحت چلتی رہتی تو غالباً یہ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم ہو جاتا۔ مگر پانچ سال کے تجربی عرصے کے بعد اسے ایک دوسرے نئے محکمے "سماج کلیان وبھاگ" (سوشل ویلفیر ڈپارٹمنٹ) کے سپرد کر دیا گیا۔ اس محکمے کے ماتحت رہ کر اس اسکیم کے کیا نتیجے نکلے، یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔

مدھیہ پردیش کی سوشل ایجوکیشن کی اس اسکیم میں فنی معاملات میں دوسرے محکموں سے امداد لینی پڑتی تھی، مثلاً زراعت، صحت عامہ، امداد باہمی، آبپاشی، گھریلو صنعتوں کے بارے میں اگر لوگوں کو کچھ بتانا ہوتا تھا، تو اس سلسلے میں سوشل ایجوکیشن کے کارکن ان کاموں کے لئے جو محکمے بنے ہوئے ہیں، ان کے کارکنوں کے مشورے اور خدمات کے محتاج ہوتے تھے۔

پنج سالہ پروگراموں سے پہلے کے زمانے میں دوسری ریاستوں نے بھی اڈلٹ ایجوکیشن کی جگہ سوشل ایجوکیشن کے اس جامع تصور کو اپنا لیا۔ اس کے لئے جو انتظامی ڈھچر بنا وہ مختلف ریاستوں میں مختلف تھا، مثلاً بمبئی میں ریجنل سوشل ایجوکیشن کمیٹیاں بنا دی گئیں جو سرکاری سرمائے سے چلتی تھیں، میسور میں یہ کام ایک غیر سرکاری جماعت اسٹیٹ اڈلٹ ایجوکیشن کاؤنسل کے سپرد کیا گیا اور اسے سرکار سے کافی مقدار میں گرانٹ (امداد) ملتی تھی۔ دوسری ریاستوں نے اس مقصد کے لئے جس پیمانے پر انھیں کام کرنا تھا، اس کی مناسبت سے اپنے موجودہ محکموں ہی میں اسٹاف کا اضافہ کر لیا۔

اسی زمانے میں کچھ پائلٹ پروجیکٹ بھی وجود میں آئے تھے جو سماجی اور معاشی ترقی کے مشترک پروگراموں کا تجربہ کر رہے تھے۔ ان منصوبوں کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ایک چھوٹا سا حد بند علاقہ لے کر اس میں زیادہ سرمائے، ماہر کارکنوں اور فنی خدمات کے ساتھ جم کر کام کیا جائے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم کا جنم

نیشنل پلاننگ کمیشن کے سامنے جہاں یہ تجربات تھے، وہاں ان کا اپنا بھی ایک منصوبہ زیر غور تھا اور وہ تھا

کام نتیجہ بخش اُسی وقت ہوسکتا ہے جب بلاک میں کام کرنے والے تمام کارکنوں کی ٹیم اس قابل ہو کہ وہ گاؤں پنچایتوں، اسکولوں کے اُستادوں اور دوسرے لیڈروں میں پوری طرح جوش اور زندگی پیدا کرسکے۔

بلاک کی سطح پر کام کرنے والے ہر ماہر خصوصی کا تعلق براہِ راست اپنے ریاستی محکمے کے ساتھ ہوتا ہے اور وہی محکمہ اُسے اُس کام میں اسے مشورہ دیتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ انتظامی نقطۂ نظر سے وہ بہرحال ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ آفیسر (کلکٹر) اور بلاک ڈیولپ منٹ آفیسر کے ماتحت ہوتا ہے۔ مگر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر ابتدا میں ... اس قسم کے کسی ریاستی محکمے سے متعلق نہیں ہوتے تھے چنانچہ ان کی نگرانی یا رہنمائی کرنے والا کوئی نہ ضلع میں ہوتا تھا اور نہ ریاست میں۔ اس کمی کو اب پورا کردیا گیا ہے اور ضلعے میں ڈسٹرکٹ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا عہدہ اور ریاست کے محکمۂ تعلیمات میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر کا عہدہ قائم کردیا گیا ہے۔

مذکورۂ بالا انتظامی ڈھیر کے علاوہ ہر سطح کے اوپر مشاورتی انجمنیں بھی ہیں۔ مرکزی حکومت کی سطح پر نیشنل ڈیولپمنٹ کاؤنسل ہے اور اسی طرح ریاستی سطح پر اسٹیٹ ڈیولپ منٹ کاؤنسل، ضلعے کی سطح پر ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کمیٹی، اور بلاک کی سطح پر بلاک ڈیولپ منٹ ایڈوائزری کمیٹی ہوتی ہے۔ اس سے نیچے گاؤں کی سطح پر گاؤں پنچایت یا "وکاس منڈل" ہوتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کے علاوہ مرکز اور ریاست دونوں جگہ کے ٹکنیکل ڈپارٹمنٹ بھی مشیروں کی حیثیت میں کام کرتے ہیں۔

(باقی اگلے پرچے میں)

آئندہ قسط میں مصنف نے کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی
اس اسکیم میں سوشل ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کی
اہمیت اور ان کے مرتبے کے بارے میں بحث کی ہے)

ان میں سے کچھ بلاک آگے چل کر زیادہ گہرائی میں جاکر ڈیولپمنٹ کا کام کرنے کے لئے منتخب کرلئے جاتے ہیں اُس وقت ان کا نام "کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک" ہوجاتا ہے، اور ان کے لئے مزید سرمایہ اور عملہ مہیا کیا جاتا ہے۔

این۔ای۔ایس بلاکوں میں عملے اور ان کے کام کی تقسیم

این ای ایس بلاکوں کا عملہ علاقے کی حیثیت اور اُس کے مسائل کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر بلاک میں بہرحال مختلف کاموں کے خصوصی ماہرین کی ایک ٹیم ہوتی ہے جن کے اوپر ایک بلاک ڈیولپمنٹ افسر ہے جو پورے بلاک کا انتظامی افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ بلاکوں میں کام کرنے والے کم سے کم عملے اور مزید عملے کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بلاک ڈیولپمنٹ افسر۔ اس کے نیچے، زراعت، افزائش نسل، تعمیرات، تعلیم اور سوشل ایجوکیشن، صحت اور صفائی کے فنون کے خصوصی ماہرین ہوتے ہیں جنہیں اپنے اپنے فن کی تعلیم و تبلیغ کی ٹریننگ ملی ہوتی ہے۔ سوشل ایجوکیشن کے ماہرین سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کہلاتے ہیں۔ ان کی دو اشخاص کی ٹیم ہوتی ہے یعنی ایک مرد اور ایک عورت۔

مزید عملہ بالعموم جن ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے وہ ہیں آبپاشی کے ماہر، گھریلو صنعتوں کے ماہر اور جہاں ضرورت ہو وہاں مچھلی پالنے کے تین ماہر، امداد باہمی کے ماہر، مقامی حکومتوں کے فن کے ماہر اور مقامی سنستھاؤں او اداروں کے مسائل کے ماہر۔

علاقے میں پھیل کر جو لوگ کام کرتے ہیں، وہ ہیں مشیر صحت، بیج اور کھاد وغیرہ تقسیم کرنے والے اسٹاک مین گھریلو صنعتوں اور دھندوں کی تعلیم دینے والے اور دس ویلیج لیول ورکر (گرام سیوک) جس وقت بلاک کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کی شکل اختیار کرلیتا ہے تو دو گرام سیوکاؤں کا اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تمام خصوصی ماہرین حتی کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر بھی ویلیج لیول ورکر (گرام سیوک) کے توسط سے کام کرتے ہیں اور اس اعتبار سے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے اس ہندوستانی پروگرام میں گرام سیوک بڑی نمایاں شخصیت کا حامل ہے۔

دس گاؤں کا علاقہ ایک واحد گرام سیوک کے لئے بہت بڑا علاقہ ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ

ایک ساتھ اس کی بات مان لیتے ہیں۔ ہنستی، ٹھٹھولیں کرتیں کچھ کھسیائی اور جھینپتی سی عورتیں، جو شہر سے آئی ہوئی چنچل اور چلبلی نرسوں سے تھوڑی سی باتیں کرکے اس کی فیملی پلاننگ کی بات کو مانتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

میں بھی ایک شہر کی رہنے والی ٹھہری اور جب بارا پلی پراجیکٹ کا کام دیکھنے کے لئے نکلی تو میرے سامنے بھی کم وبیش کچھ اسی قسم کا نقشہ تھا۔ مگر جو کچھ میں نے دیکھا اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتی ہوں کہ اس سلسلے میں جو اونچی اونچی باتیں میں نے سن رکھی تھیں اس میں حقیقت کا ایک رنگ موجود تھا ایک ایسا رنگ، جس کی عکاسی پنج سالہ پروگراموں کا پروپیگنڈا کرنے والے کھیل تماشے ابھی نہیں کر سکے ہیں۔

جیسا کہ عموماً ہر پروجیکٹ کے ساتھ ہوتا ہے، بارا پلی پراجیکٹ نے بھی اپنا تجربہ انسانی تعلقات کے مسئلے تک رکھا ہے۔ میں نے ایک صحافی کی حیثیت جو مشغول زندگی شہروں میں گذاری ہے، اس میں مجھے کہیں بھی ان بنیادی قدروں کی قدر ومنزلت اس حد تک نہیں ملی، جتنی اور جس حد تک میں نے ان گاؤوں کے اندر ان بنیادی قدروں کی قدر ومنزلت دیکھی جو ایک انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ قائم کرتی ہیں۔ اور مجھے قائل ہونا پڑا کہ جغرافیہ کی کتابوں میں جو یہ بات لکھی ملتی ہے کہ "اصل ہندوستان گاؤوں میں بستا ہے" بالکل صحیح ہے۔

سمبل پور اسٹیشن سے جاتے ہوئے جب ہماری جیپ مہا ندی پل پر سے گذری، سامنے ہیرا کنڈ باندھ نظر آرہا تھا۔ میں نے یہاں زندگی کا وہ حقیقی رنگ دیکھا جس کی عکاسی شاید دنیا کے بڑے سے بڑے کیمرے بھی نہیں کر سکے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ ہیرا کنڈ ڈیم دنیا کا سب سے بڑا مٹی کا بنا ہوا بندھ ہے اور اس کی شان میں یہی کہنا کافی ہے، مگر جب ہم سوچتے ہیں کہ یہ باندھ کس طرح تھوڑے ہی دنوں میں اپنے اتھاہ پانی سے چھوٹے چھوٹے گاؤوں کی زندگی میں ایک انقلاب لا دے گا تب ہی ہمیں اس کی اصل قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گاؤں جو آج بھی زراعت کے صدیوں پرانے اور فرسودہ طریقوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ گاؤں جہاں عورتیں اب بھی کہتی ہیں کہ بچے کو دودھ مت دو اس سے انھیں سردی ہو جائے گی۔" وہ گاؤں جہاں اب بھی گوبر کے اپلے جلائے جاتے ہیں اور ان تالابوں جہاں دن رات بھینسیں پڑی رہتی ہیں گاؤں کی عورتیں اپنے پیتل کے گھڑوں میں پانی بھر کر بڑے انداز سے لے جاتی ہیں۔

خوفناک درندے

اور یہ وہی گاؤں ہوں گے، جو ہندوستان میں پہلی بار بجلی کی روشنی میں جگمگا اٹھیں گے — جہاں کے

نمونے

دامودر گھاٹی کے آنچل میں

ایک کہاوت ہے، جو ڈرا سو مرا، اس سے ملتی جلتی کہاوت اُڑیہ میں بھی ہے "جو شیروں اور درندوں سے ڈرتا ہے پہلے مارا جاتا ہے۔" اڑیسہ کے سمبل پور ضلع کے، اس چھوٹے سے گاؤں میں جس کا نام تنکانی ہے، جب آپ کا گذر ہوگا تو یہی کہاوت آپ کو اس گاؤں کے نوٹس بورڈ پر لگی ملے گی۔

تنکانی اس ضلع کے ان چالیس چھوٹے چھوٹے گاؤوں میں سے ایک ہے جہاں کی زندگی میں ادھر کچھ برسوں میں ایک انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ گاؤوں میں جو تحریکیں چلتی ہیں اور جو انقلابات آتے رہتے ہیں ان کا شور دوسرے علاقوں میں بہت کم ہو پاتا ہے اور شہر کی زندگی پر ان کا اثر بیشتر نہیں محسوس کیا جاتا ہے۔ گاؤوں میں ادھر کچھ برسوں سے کمیونٹی پراجیکٹ کی تحریکیں چل رہی ہیں اور شہر والے ان کا نام سنتے سنتے عاجز آ چکے ہیں پنج سالہ پلان کا اتنا کچھ پروپیگنڈا ہونے اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا نام اتنی بار سُن لینے کے بعد بھی جب "کمیونٹی پراجیکٹ کا ذکر ان کے سامنے آتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ "ہاں! ہاں! میں سمجھ گیا، آپ اس کا ذکر کر رہے ہیں جو نیلوکھڑی اور فرید آباد میں ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں ان باتوں کی تفصیل کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اس بارے میں تو پارلیمنٹ میں بھی کافی بحث رہی ہے۔ بھئی یہ تو حکومت کا کام ہے اور اُسے ہی اُس پر نظر رکھنی چاہئے"

ایک کج بحثی کرنے والے ہندوستانی کے نزدیک کمیونٹی پراجیکٹوں کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک نئے ڈھنگ کے اقتصادی پروگرام کی ہے، جس کا اپنا کام پورا کر لینے کے بعد چلن سے باہر ہو جانا یقینی ہے۔ یہی نہیں لوگوں نے فلموں میں دیکھ رکھا ہے کہ کس طرح ایک شہری ٹھاٹھ کا آدمی جیپ میں سوار گاؤں والوں کو کہیں گڑھا کھودنے پر تیار کرتا ہے اور کہیں سڑک بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ ان موقعوں پر دیہات کے جو لوگ دکھلائے جاتے ہیں وہ بھی بالکل جانی پہچانی سی شکلیں ہوتی ہیں ——— ہٹے کٹے جوان پھاوڑا کدال لئے اُس کام کو کرنے کے لئے گویا پہلے سے تیار۔ شک کی نظروں سے دیکھنے والا پنچایت میں بیٹھا ہوا بوڑھا آدمی جو لوگوں کو کسی بات پر سمجھا سمجھا کر راضی کرنا چاہتا ہے، اور لوگ ہیں کہ ایک دو بار "ہاں، نہیں" میں بڑی پابندی سے گردن ہلانے کے بعد

کالج کے پہلے گریجویٹوں میں ہیں۔ ڈاکٹر مہاپترا وہ ہندوستانی ڈاکٹر ہیں جنھوں نے اپنے مغربی دوست (ڈاکٹر ڈوکٹر) کو پہلی بار بتایا کہ کوڑھ کا مرض اتنا مہلک اور زہریلا نہیں ہے جتنا ہم اُسے سمجھتے ہیں۔ ایک کوڑھ کے مریض سے سماج جس طرح گھنتا تا اور دُور دُور رہتا ہے وہ ناقابل برداشت ہے۔ آج گاؤں کے شفاخانے سے دوا لینے کے لئے کوڑھ کے مریضوں کو الگ لائن نہیں لگانی پڑتی۔

یہاں ایک دوسری رضاکار خاتون ڈاکٹر بیسٹ کی بیوی جاپان کی ڈاکٹر میو ہیں جو اپنی کھدر کی ساری میں بالکل نے فا (N.E.F.A) کی قبائلی عورتوں جیسی لگتی ہیں۔ ڈاکٹر میو ڈاکٹروں کی اس چھوٹی سی جماعت میں سے ایک ہیں جن کی دواؤں میں لوگ جادو کا اثر محسوس کرتے ہیں اور جسے لینے کے لئے لوگ ساٹھ ساٹھ ستر ستر میل سے بیل گاڑیوں میں چل کر صبح ہی سے لائن لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس گاؤں میں ایک دوسرے سیوا گرام سے آئے ہوئے شری اندو بھوشن مسرا دیہی تعلیم کے ماہر ہیں جنھیں گاؤں والوں کا فطری رہنما کہا جا سکتا ہے۔ شری مسرا کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ گاؤں والوں کو نئے نئے خیالات اور نئی نئی باتوں کو بغیر کسی ہچک کے اپنانے کے لئے تیار کرلیں اور گاؤں کا کارکن چہرہ ہے جو لوگوں کو کسی موضوع پر بڑی آسانی سے متوجہ کرلیتا ہے۔ ان باتوں کا پرچار جسے وہ میلوں اور نمائش سے سیکھ کر آتا ہے بڑی ہوشیاری سے کرلیتا ہے۔ اس گاؤں میں زراعتی سدھار کے پروگراموں میں دلچسپی لینے والوں میں ایک توکیلیفورنیا سے آیا ہوا امریکی کسان رائے۔ وزے ڈیل اور دوسرے مشرقی بنگال میں زراعتی ترقی کے کاموں کے تجربہ کار شری داس گپتا ہیں۔ رائے روزے ڈیل ایک جسیم قامت کسان ہے اور داس گپتا سفید بالوں والے ایک تجربہ کار بزرگ جن کی خدمات حکومت اڑیسہ سے مستعار لے لی گئی ہیں۔

سب کے سب لوگ قطع نظر اس بات کے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو مقامی لوگوں میں کس حد تک رچا بنا لیا ہے ایک طرح سے باہری ہی ہیں۔ مگر دل کو سب سے زیادہ خوشی گاؤں کے لڑکوں کو دیکھ کر ہوتی ہے جو بیشتر پراجیکٹ کے کارخانے کے پاس دکھائی دیتے ہیں۔

موجو گاؤں کا ایک کاریگر ہے اس نے انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین کے بنائے ہوئے نمونے کے پاخانوں میں کچھ سدھار کئے ہیں جس سے ایک تو ان کے بنانے میں وقت کم لگتا ہے اور لاگت بھی ایک تہائی کم آتی ہے (یہ پاخانے سنگ مرمر نما ایک پتھر سے تیار کئے جاتے ہیں جس پر کوئی ساڑھے سات روپے لاگت آتی ہے) گھنگرالے بالوں والا اپنی نام کا ایک دوسرا باورچی لڑکا ہے جو جیپ کے پرزے پرزے الگ کرکے پھر انھیں ترتیب دے سکتا ہے۔ سادوبا

بچے بجلی کی روشنی میں پڑھا کریں گے اور عورتیں بجلی کے چولھوں پر کھانا پکایا کریں گی اور اس طرح ایک سپنا حقیقت کا روپ لے لے گا۔ گنے کے کھیت لہلہا اٹھیں گے اور اس علاقے میں چھوٹے سے کارخانے کی جگہ بجلی سے چلنے والی پہلی شکر مل قائم ہو جائے گی جس کے لئے وہاں ابھی سے بجلی کے کھمبے دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر یہاں جو پکی پکی سڑکیں اور بہبودی اور خوش حالی کے جو آثار نظر آتے ہیں وہ محض ایک دعوکہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور وہی شیر والی کہاوت کہ "وہ جو شیروں سے ڈرتا ہے مارا جاتا ہے" حقیقت بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان گاؤں میں زندگی کو تلخ بنا دینے والے خونخوار درندوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر باراپلی اور ان گاؤں کے باسیوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خونخوار درندے کبھی انھیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکیں گے، اس لئے کہ وہاں لگن والے . . . . . . تیاگی لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو بڑی مستعدی اور تن دہی کے ساتھ ان عناصر پر فتح کرنے پر تلی ہوئی ہے جو زندگی کو خوفناک درندوں کی طرح چچوڑ چچوڑ کر چوس رہے ہیں۔

"نکانی گاؤں میں، سرپنچ کی بیوی" حیمہ کا پاس پڑوس کے گاؤوں میں کافی دبدبہ ہے" اس طرح کے کاموں میں آگے آگے رہتی ہے۔ اُس نے ایسے وقت میں گاؤں کی عورتوں کو کام کرنے کے لئے آمادہ کیا جبکہ اسکول کی عمارت کی چھت آدمیوں کے نہ ملنے کی وجہ سے بننے سے رُک گئی تھی۔ گاؤں کے مردوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ کھیتوں کو چھوڑ کر اس کام میں لگتے۔ وہ عورت ذات تنہا نکلی اور چھت پیٹنے کے لئے ڈٹ کر بیٹھ گئی۔ اس طرح اُسے کام کرتے دیکھ کر گاؤں کی دوسری اونچی ذات کی عورتوں کو بھی سوچنا پڑا کہ اس طرح کے کام میں محنت کرنا کوئی عیب نہیں ہے اور کچھ جھینپتی سی وہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹانے نکل پڑیں۔ پھر ایک دوسری خاتون گیتا مزومدار ہیں، ان کے شوہر سامر مزومدار شانتی نکیتن کے تربیت یافتہ ہیں جنھیں باراپلی کے جولاہے اپنا ہمدرد، آڑے وقتوں میں صلاح مشورہ دینے والا ایک رہنما اور معلم سمجھتے ہیں۔ گیتا مزومدار کو سبھی "دیدی" کہتے ہیں۔

ڈاکٹر رالف وکٹر، سی ٹیل (seattle) سے آئے ہوئے ایک نہایت کامیاب معالج ہیں شکاگو اور واشنگٹن یونیورسٹیوں میں آپ کئی ایک لیکچر دے چکے ہیں۔ آپ ان چند کو نکر دوں میں سے ہیں جنھوں نے یہاں کے کو نکر کمیونٹی پراجیکٹ میں اپنے آپ کو خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ دراز قامت ڈاکٹر وکٹر لڑکے ہی تھے کہ انھیں ہٹلر شاہی جرمنی سے بھاگ کر پناہ گزیں ہونا پڑا۔ وہ آج اس گاؤں کے شفاخانہ میں ڈاکٹر شنکر مہاپتر کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مہاپترا بھی اپنے فن میں کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ اڑیسہ میں نئے میڈیکل

تعارف

مزدوروں کی تعلیم کا ایک مرکز

دنیا کے مختلف خطوں کی مزدور سبھاؤں کے یوں تو بہت سے بین الاقوامی وفاق بنے ہوئے ہیں لیکن ایک وفاق آزاد مزدور سبھاؤں کا ہے جسے انٹرنیشنل کانفیڈریشن آف فری ٹریڈ یونینس (آزاد مزدور سبھاؤں کا بین الاقوامی وفاق) کہتے ہیں۔ اس کا صدر مقام بلجیم کی راجدھانی بروسیلز میں ہے۔ یہ وفاق مزدوروں کی تعلیم کا کام بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ایشیا کے ملکوں کے مزدوروں کو تعلیم اور بالخصوص مزدور سبھائیت کی تعلیم دینے کی غرض سے اس نے کلکتہ میں ایشین ٹریڈ یونین کالج کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی ہے۔ ہم ایشین ٹریڈ یونین کالج کا تعارف ستمبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع کر چکے ہیں۔ یہ مضمون مزدوروں کی تعلیم کے ایک مرکز سے متعلق ہے جو اسی بین الاقوامی وفاق کی طرف سے ایشین ٹریڈ یونین کالج کی رہنمائی میں قائم کیا گیا ہے اور ۱۹۵۳ء سے کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

یہ مرکز شہر کلکتہ کے محلہ خضرپور (کدّرپور) میں واقع ہے جہاں زیادہ تر کلکتے کی بندرگاہ میں کام کرنے والے مزدور رہتے ہیں۔ اس کے قیام کے پیچھے دو مقاصد ہیں۔ ایک عام یعنی مقامی مزدوروں کو تعلیم دینا اور دوسرا اسے اُن لوگوں کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کرنا جو ایشین ٹریڈ یونین کالج میں مزدور سبھائیت اور مزدوروں کی عام تعلیم کے میدان میں ٹریننگ لینے کے لئے ایشیا کے مختلف ملکوں سے آتے رہتے ہیں۔

اوّل الذکر مقصد مرکز کے ایک کتابچے میں مختصراً یوں بیان کیا گیا ہے:

"اس کا مقصد ہے مزدوروں میں بیداری پیدا کرنا، ان کے دلوں میں احترامِ نفس اور آپ اپنے اوپر بھروسہ کرنے کے جذبات کی پرورش کرنا، انھیں ان کے جمہوری حقوق و اختیارات سے باخبر اور متعارف کرانا، اور انھیں ایسے مواقع فراہم کرنا جن کے ذریعے ان کی شخصیت کی بخوبی نشوونما ہو سکے۔"

اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے مرکز قریب قریب ان تمام ذرائع تعلیم سے کام لیتا ہے جو سوشل ایجوکیشن کے میدان میں معروف و مقبول ہیں۔ مثلاً بامقصد خواندگی، مشاعرے، بحث مباحثے کی مجلسیں، ناٹک اور ڈراما، موسیقی

گاؤں کے کمہار کا لڑکا ہے جو نئے ڈھنگ کے پاخانوں کے لئے برتن اسی ہوشیاری اور کاریگری سے بنا لیتا ہے جس ہوشیاری اور کاریگری سے وہ معمولی قسم کی مٹی سے اپنے گھر کے باہر بیٹھا کھلونے وغیرہ بنایا کرتا ہے۔

یہی وہ معمولی معمولی چیزیں ہیں جو گاؤں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر رہی ہیں۔ بارا پلی گاؤں کا کنواں جسے گاؤں ہی کے ایک آدمی نے بنوایا ہے ایک چھوٹے سے میدان میں ۳۰۰ روپے کی لاگت سے تیار کیا جاسکتا ہے اور اس سے کوئی ۷ اکینے سال بھر تک بڑی آسانی سے پانی لے سکتے ہیں۔ گاؤں کا پاخانہ جو پانی سے بہا دیا جاتا ہے، ایسا بنایا گیا ہے جس سے نہ تو بدبو پھیل سکتی ہے اور نہ اس پر مکھیاں ہی بھنبھنا پاتی ہیں اور پھر اس کا غلیظ کھیتی کے لئے بہت مفید کھاد کے کام بھی آتا ہے۔ گاؤں کے اسکول کی زیر تعمیر عمارت اس ڈھنگ پر بن رہی ہے کہ روپے پیسے اور دوسری سہولت کے لحاظ سے تین قسطوں میں تیار کی جاسکے۔ اس کا نقشہ ایک کینیڈین اور اس کی بیوی نے تیار کیا ہے۔

پھر وہ کھیل تماشے بھی جو گاؤں کی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں اپنی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کتھا کتھا کا ان کے یہاں بہت پرانا رواج ہے۔ اس میں بھاٹ پرانے ڈھنگ کی کہانیوں کو بنیاد بنا کر اپنے کرتب اور ہوشیاری سے گاؤں والوں کے بیچ میل جول بنانے اور ذات برادری کے کٹھور بندھنوں کو توڑنے کے لئے راستہ ہموار کرنے میں ذرا نہیں چوکتا۔ گاؤں کی زندگی کے متعلق فلمیں کھلے میدانوں میں دکھائی جاتی ہیں۔ گاؤں والوں کی لکھی جاترائیں بہت سے گاؤوں میں پسند کی گئی ہیں۔ لکھی اور مچھر پر تیار کی ہوئی ان کی ایک طنزیہ نقل بہت سے گاؤوں میں پسند کی گئی ہے۔

ایک شاندار کام

اس سلسلے میں بہت سے اعداد و شمار پیش کئے جاسکتے ہیں اور ان اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ ان کاموں میں حکومت اڑیسہ، کوئکر[ل] اور ہندوستان میں گاؤوں کی ترقی کے کاموں سے دلچسپی رکھنے والے ماہرین کا کتنا حصہ رہا ہے۔ مگر خدمت کے اس جذبے کی شاید کوئی ناپ تول نہیں ہو سکتی جو جذبہ نیک کر ان مختلف ملک اور مختلف رنگ روپ والے انسانوں کو اس دور دراز کے گاؤں میں اس طرح مل جل کر خدمت خلق کا کام کرنے کے لئے کھینچ لایا ہے۔ اور اس طرح کے منصوبوں کی کامیابی کی اصل کسوٹی بھی چاہے کاموں کو ناپ تول کر بتانے والے کچھ ہی کیوں نہ کہیں، یہی جذبۂ نیک ہے۔

ل کوئکر عیسائیوں کی ایک جماعت جو محبت اور ایثار کے نیک جذبے سے انسانیت کی خدمت کرنا اپنا دھرم سمجھتی ہے۔ (اسٹیٹسمین کے شکریہ کے ساتھ)

ہُشیار اے مزدورو ، ہُشیار اے مزدورو
پھر خواب سے ہو جاؤ بیدار اے مزدورو
غداروں کی دنیا میں ہم آگ لگا دیں گے ، سوئے ہوئے انسان کو......
ساحل ابھی ہو جائے دریا کا ہر اک دھارا
ہمت ہے تو اے موتی طوفاں کی نہیں پروا
مزدور کی نیا کو ہم پار لگا دیں گے سوئے ہوئے انساں کو ہم پھر سے جگا دیں گے

مرکز کے طالب علموں نے اپنی نظمیں اور گیت سنانے کے بعد ایک ایکٹ کا ایک ڈراما بھی دکھایا۔ ڈرامے کا عنوان تھا "خط پڑھیئے" اس کا کمال یہ تھا کہ اس کے لئے نہ کسی ساز و سامان کی ضرورت تھی نہ الگ سے تیار کئے ہوئے لباس اور میک اپ کی، جس طالب علم نے مونچھوں والے اَن پڑھ دیہاتی کا پارٹ کیا تھا، اگر اس کے مونچھیں ہوتیں تو شاید بناوٹی مونچھ کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر اس سادگی اور بے سرو سامانی کے باوجود ڈرامے میں وہی تاثیر اور قوتِ نفوذ تھی جو زبردست تیاری، ساز و سامان اور بے تحاشا ریہرسل کے بعد پیش کئے جانے والے کسی ڈرامے میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ڈرامے کا پلاٹ خود مرکز کے طالب علموں نے تیار کیا تھا۔ مگر وہ لکھی ہوئی شکل میں نہیں تھا بلکہ ہر ایکٹر نے اپنا اپنا پارٹ سمجھ کر اُسے خود اپنی زبان میں یاد کر لیا تھا۔

اس مرکز کا عملہ تین کارکنوں پر مشتمل ہے۔ ایک مرکز کا انچارج' اور دو مددگار۔ ان کارکنوں سے بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے فرائض کی تعمیل میں دن رات کی تمیز نہیں کرتے اور نہ اپنے مقررہ اوقات کار کی پابندی کرتے ہیں۔ مرکز کے انچارج شری سوشیل بھٹاچاریہ اور اُن کے ساتھی شری کرم اور شری چکرورتی' ایسا معلوم ہوتا تھا ہی کارِ خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کا نظریہ ہے کہ عوام کی خدمت خصوصاً تعلیمی خدمت کا کوئی میدان ہو' اس میں کارکن یا اُستاد کی سیرت اور شخصیت کو شرطِ اولین کا درجہ حاصل ہے۔ جب تک کارکن یا اُستاد اپنی شخصیت اور سیرت کا پورا زور نہ لگائے' اور صرف اس لئے کام کرے کہ اُسے کام کا معاوضہ ملتا ہے' کوئی تعلیمی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اپنے اس نظریئے کو بھٹاچاریہ جی نے سیمینار میں ایک سجھاؤ کے طور پر پیش بھی کیا تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ اُن کا یہ سجھاؤ کامیابی کی منجملہ اور شرائط کے ایک ضروری شرط کی حیثیت سے تسلیم بھی کیا گیا۔

اور دوسری تفریحی سرگرمیاں، دیواری اخبار، اور ریڈیو کے پروگراموں سے متعلق بات چیت کی مجلسیں، فرشی کھیلوں کا انتظام وغیرہ۔

کلکتہ نیشنل سیمینار کے موقعے پر ہمیں اس مرکز کی سرگرمیوں کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا۔ اسے ایک منظم بین الاقوامی انجمن کی سرپرستی اور رہنمائی کا فیض کہئے یا اس کے کارکنوں کے بےلگانہ جوش عمل کا نتیجہ کہ اگرچہ تعلیم دینے کے اصول، طریقے اور سازوسامان سب وہی ہیں جو دوسرے کمیونٹی سنٹروں میں پائے جاتے ہیں، مگر جو رونق اور چہل پہل اور طالب علموں میں مرکز سے وابستگی اور اپنایت کا جو جذبہ یہاں نظر آیا وہ شاذ و نادر ہی کسی اور جگہ ملے گا۔

ہمیں بتایا گیا کہ مرکز کے طالب علموں میں ایسے نوجوانوں کی تعداد خاصی ہے جو ابتدا میں صرف برائے نام خواندہ تھے مگر اب وہ اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ جامعہ اردو علی گڈھ کے مختلف امتحانوں کی تیاری کر رہے ہیں۔ مشاعروں اور ناٹکوں سے انھیں خاص طور پر زیادہ دلچسپی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ مشاعروں میں یہ لوگ زیادہ تر اپنی ہی کہی ہوئی نظمیں پڑھتے ہیں اور ڈرامے بھی خود لکھتے، تیار کرتے اور کھیلتے ہیں۔

اس موقعے پر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک نظم ایک ایسے نوجوان مزدور شاعر کی شریک تعارف کریں جس نے مرکز ہی میں اردو کی تعلیم پائی اور کچھ عرصے کے بعد جامعہ اردو علی گڈھ سے ادیب کا امتحان پاس کر لیا۔ ان کا نام ہے شیخ محمد موسیٰ، موسیٰ۔

سوئے ہوئے انسان کو ہم پھر سے جگا دیں گے

سوئے ہوئے انسان کو ہم پھر سے جگا دیں گے
مزدور ہیں ہم ساری دنیا کو جگا دیں گے
مل جل کے بڑھو آگے، وہ سامنے ہے منزل
مزدور تمھیں ورنہ ہوگی نہ خوشی حاصل
جب تک نہ امیروں کو انسان بنا دیں گے — سوئے ہوئے انساں کو...
دولت کے نشے میں جو ٹھوکر بھی لگاتے ہیں
ہنس ہنس کے غریبوں کو دنیا سے مٹاتے ہیں
ہم ایسے امیروں کو انسان بنا دیں گے — سوئے ہوئے انساں کو...

چھوٹی صنعتیں

آپ ارادہ کیجئے، سرکار آپ کی مدد کرے گی

چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے اور ان کے ذریعے عوام کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کی غرض سے سرکار نے مختلف اسکیمیں چلا رکھی ہیں۔ مگر عام طور پر لوگ ان اسکیموں اور ان کے ماتحت دی جانے والی امداد سے واقف نہیں ہوتے، اور واقف بھی ہوں تو اُن سے فائدہ اُٹھانے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ زیرِ نظر مضمون سے ظاہر ہوتا ہے، ان امدادوں اور سہولتوں کے مراکز گاؤں گاؤں پھیلے نہیں ہوئے ہیں، بلکہ زیادہ تر ضلعوں یا تحصیلوں کے صدر مقامات میں قائم ہیں۔ اور اگر کوئی ان سہولتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہے تو اُسے ضلعے یا ریاست کے صدر مقام کا سفر کرنا پڑے گا جس کا ارادہ بھی کرتے کرتے گاؤں والوں کو پسینے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے سوشل ایجوکیشن اور ڈیولپمنٹ کے کارکنوں سے امید ہے کہ وہ اس مضمون کی بنیاد پر پہلے خود ان اسکیموں کے بارے میں تفصیلات معلوم کریں۔ اس کے بعد لوگوں کو ذہنی طور پر ان کاموں کے لئے آمادہ کرنے کی غرض سے تعلیمی مہمیں چلائیں، مثلاً ان اسکیموں کے افسروں کے لیکچر، تبادلۂ خیالات کی مجلسیں، اسی موضوع پر چھوٹا موٹا کوئی ڈراما وغیرہ۔ غرض کوشش یہ ہو کہ چار پانچ آدمی تیار ہو جائیں تاکہ اگر کہیں آنا جانا ہو تو کسی کو اکیلے نہ جانا پڑے بلکہ ایک خیال کے چار پانچ آدمیوں کا قافلہ ہو جائے۔ گاؤں کے لوگوں کی ایک نفسی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اکیلے کوئی نیا کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ مرگِ انبوہ جشنے دارد کے زیادہ قائل ہوتے ہیں۔

جب چار پانچ آدمی اس نئی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے تو ممکن ہے ان کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ اس کی طرف جھکیں گے، اور اسی طرح دیئے سے دیا جلتا رہے گا۔

آپ کیا کریں

پہلے لوگوں کے اندر، گرمی اور زندگی پیدا کیجئے

ایکس ٹنشن کے ایک امریکی ماہر کی رائے

ایکس ٹینشن (تبلیغ) کے ایک امریکی ماہر جنھوں نے ہندوستان کے دیہی علاقوں میں دو سال تک کام کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کا کسان نئے طریقے سیکھنے کا بڑا شوق رکھتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ ڈیولپ منٹ کا کام کرنے والے کارکن اس کے ساتھ گہرا میل ملاپ اور ربط ضبط پیدا کریں۔

موصوف جن کا نام مسٹر فرینک ایچ۔ شومان ہے۔ الہ آباد اگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ کے ایک تبلیغی پروجیکٹ (ایکس ٹنشن) میں مدد کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

انھوں نے اپنے ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے فرمایا "جب میں پہلی بار گاؤں میں پہنچا تو بچوں کے ساتھ ان کے کھیل میں شریک ہو گیا۔ آخر میں بچے اور "بالغ لوگ بھی" خوب ہنسے، قہقہے لگائے اور تالیاں بجائیں۔ اس طرح بچوں کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں سے شروع کرکے میں گاؤں کے لوگوں سے قریب آگیا اور مجھے ان کا اعتماد اور بھروسہ حاصل ہو گیا۔"

مسٹر شومان کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے دو سال کے زمانۂ قیام میں اس نظریئے کو رواج دیا کہ اگر لوگوں کو کسی مقصد کے لئے آمادہ کرنا ہے تو ان کے سامنے ٹھوس مثالیں رکھئے۔ انھوں نے کہا "میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے لوگوں میں تبدیلی کو تسلیم کرنے کی بڑی صلاحیت ہے بشرطیکہ ان کے دلوں میں اپنی حالت کو سدھارنے کا سچا جذبہ پیدا ہو جائے۔"

انھوں نے کہا "اس کے لئے بہترین ترکیب میرے نزدیک یہ ہے کہ ترقی کا کوئی منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کے سامنے ٹھوس مثالیں پیش کی جائیں اور ان کے اندر گرمی اور زندگی پیدا کرنے" کی مہم چلائی جائے۔" "اسٹیٹسمین"

ناظرین تعلیم و ترقی کو یاد ہوگا کہ ڈنمارک کا معلم کرسٹن کولڈ جس نے سب سے پہلا فوک ہائی اسکول قائم کیا تھا، اس کا بھی یہی نعرہ تھا "پہلے ان کے اندر گرمی اور زندگی پیدا کرو، پھر انھیں تعلیم دو۔" —— ایڈیٹر

کرسکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گاؤں کے لئے سنستھانے پہلے سے کوئی منصوبہ بھی تیار کر رکھا ہو۔

قرض

آپ کو خیال ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں یوں سننے میں تو بہت اچھی لگتی ہیں، مگر کام اتنا آسان نہیں ہے۔ لوگوں کو صنعت شروع کرنے کے لئے روپیہ چاہئے، سازوسامان چاہئے، حالانکہ ان کے پاس نہ روپیہ ہے نہ سازوسامان اور نہ وہ پہلے سے کوئی فن ہی جانتے ہیں۔

آپ کا یہ کہنا بے جا بھی نہیں ہے، مگر اس کا حل بھی موجود ہے۔ مثلاً پہلی چیز کو لیجئے روپیہ! یہی سب سے بڑا میاؤں کا مغور ہے۔ مرکزی حکومت جو دیس کی راجدھانی دلی میں ہے، وہ چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کی غرض سے ریاستی سرکاروں کو قرض دیتی ہے۔ اب ریاستی سرکار قرض کی اس رقم میں سے ان لوگوں کو قرض دیتی ہے جو چھوٹی صنعتیں پہلے سے چلا رہے ہیں یا نئے سرے سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ بھی چاہیں تو چھوٹی صنعتوں کے ریاستی ڈائرکٹر کے یہاں سے قرض لاسکتے ہیں۔

پھر اسٹیٹ بینک آف انڈیا ہے۔ اس نے بھی مختلف گاؤوں میں تجربے کے طور پر چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینے کی ایک اسکیم بنا رکھی ہے۔ اگر آپ کا گاؤں بھی ان گاؤوں کی فہرست میں آتا ہے تو آپ اپنے مقصد کے لئے اسٹیٹ بینک آف انڈیا سے بھی قرض لے سکتے ہیں (اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخیں قریب قریب ہر ضلعے کے صدر مقام میں قائم ہیں)

اس کے علاوہ مختلف ریاستوں میں حکومت کی امداد سے کوآپریٹیو بنک کھلے ہوئے ہیں۔ یہ کوآپریٹیو بینک بھی چھوٹی صنعتوں کو شروع کرنے کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ آپ کو جو قرض ملے گا، اس کے لئے معمولی سی ضمانت لی جائے گی۔ سود بھی برائے نام ہی دینا ہوگا یہی بس ۳ روپے سینکڑہ سالانہ کے حساب سے۔ اور اگر آپ اپنے کام میں کچھ اور لوگوں کو بھی شریک کر کے ایک کوآپریٹیو سوسائٹی بنالیں تو سود کی شرح اور بھی کم ہو جائے گی۔

سامان

اب رہی سازوسامان جٹانے کی دقت تو یہ بھی دور ہو سکتی ہے۔ حکومت ہند نے چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کی غرض سے ایک محکمہ قائم کیا ہے جو مشینیں وغیرہ قسطوں پر فراہم کرتا ہے۔ مشینیں اور دوسرا سامان خرید تے وقت

محنت تو یقیناً کرنی ہوگی مگر حکومت کی ان اسکیموں سے فائدہ اُٹھانے کی تحریک لوگوں میں بہر حال کرنی چاہئے۔

ایڈیٹر

ہندوستان نے ایک ایسی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں سب کا بھلا ہو۔ ایسی خیر خواہ ریاست میں ہر شہری کی اس کی پیدائش سے لے کر آخری دم تک دیکھ بھال اور حفاظت کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات ابھی تک ایک نصب العین ہی کی حد تک ہو اور دُور کے ڈھول معلوم ہوتی ہو، مگر اسے حاصل کرنے کی بہر حال کوشش کی جارہی ہے۔

عام لوگ جو چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں کام کرتے ہیں، ان کے فائدے کے لئے حکومت نے مختلف قسم کی اسکیمیں چلا رکھی ہیں۔ چنانچہ صنعت کو شروع کرنے سے لے کر ان کی مصنوعات کی فروخت تک، ہر منزل پر انھیں سہولتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

چاہے اپنے ہتھ کرگھے پر کام کرنے والا جلاہا ہو، یا اپنی جھونپڑی میں بیٹھی چرخا کاتنے والی بڑھیا، کولھو سے تیل نکالنے والا تیلی ہو یا چھوٹے موٹے کارخانے لے کر بیٹھنے والے کاریگر اور دستکار، ان سب کی امداد کے لئے حکومت نے سنستھائیں قائم کر رکھی ہیں۔ یہ سنستھائیں اس مقصد کو سامنے رکھ کر کہ گھریلو دستکاریوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ ہو، لوگوں کو فنی اور مالی امداد بھی دیتی ہیں اور ان کی مصنوعات کی نکاسی میں بھی ان کی مدد کرتی ہیں۔

اگرچہ مختلف صنعتوں کو مدد دینے کے طریقے اور فارمولے مختلف ہیں، مگر امداد بہم پہنچانے کا اصول سب کے لئے ایک ہی ہے۔

فرض کیجئے آپ ایک چھوٹی سی صنعت شروع کرنا چاہتے ہیں، مگر آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کی ابتدا کس طرح کی جاتی ہے۔ اس کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس سنستھا میں جائیں جو آپ کے گاؤں کے پاس چھوٹی صنعتوں کو امداد دینے کی غرض سے قائم ہے۔ دلی، مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں تو اس مقصد کے لئے علاقائی سنستھائیں بنی ہوئی ہیں مگر ان کے ماتحت چھوٹی اور بڑی بہت سی سنستھائیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اس سنستھا میں آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ اپنے گاؤں میں جو صنعت شروع کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے آپ کو کس قسم کی مشینیں لینی ہوں گی، اس کے لئے کس طرح کے اور کتنی مقدار میں کچے مال کی ضرورت پڑے گی، وہ مال کہاں سے مل سکے گا، صنعت میں کتنا سرمایہ درکار ہوگا اور اُسے چلانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اسی سنستھا میں آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ صنعت کو شروع کرنے میں وہ خود اور دوسری سنستھائیں آپ کی کیا مدد

خرید نے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا کارپوریشن سرکار سے مال کا آرڈر لیتا ہے اور آپ جیسے چھوٹے کارخانے داروں سے مال لے کر سرکار سپلائی کرتا ہے۔

چھوٹی صنعتوں کا قومی کارپوریشن چھوٹے کارخانے داروں کا مال لے کر اُسے باہر کے ملکوں میں بھی بھیجتا ہے۔ اگر آپ اس کارپوریشن کی خدمات سے فائدہ اُٹھانا چاہیں تو اپنا نام درج کرا دیں اور اچھے سے اچھا مال تیار کریں۔ اس سلسلے میں بھی آپ کو صلاح مشورہ اور امداد دی جا سکتی ہے۔

سرکار کی پالیسی

چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لئے سرکار نے جو پالیسی اختیار کی ہے، وہ بھی ایسی ہمت بڑھانے والی ہے کہ آپ اس سے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے: سائیکلیں اور سلائی کی مشینیں لے لیجئے۔ ان کے بارے میں حکومت نے یہ پالیسی بنائی ہے کہ سائیکلوں اور سلائی کی مشینوں کے جو بڑے بڑے کارخانے ہیں، وہ ان کے چھوٹے چھوٹے پرزے چھوٹی صنعتوں سے خریدیں۔ اگر کوئی مال تیار کرنے میں دیسی چیزوں کے علاوہ بدیسی چیزوں کے بھی منگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہاں بھی ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ بدیسی چیزوں کی درآمد سے چھوٹی صنعتوں کو نقصان نہ پہنچے۔

چھوٹی صنعتوں کو امداد دینے والی سنستھائیں، چلتی پھرتی گاڑیاں اور اسٹانڈرڈ ایکس ٹینشن سنٹر، اس بات کا بھی اہتمام کریں گی کہ آپ جو مال تیار کریں وہ اچھے سے اچھا ہو اور اس کے اوپر خرچ بھی کم آئے۔ آپ کو ٹکنیکل اور فنی مشورہ تو دیا ہی جائے گا، اس کے علاوہ آپ کو کاروبار کی تنظیم کے بارے میں بھی صلاح مشورہ دیا جائے گا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مختلف صنعتوں کو امداد دینے کا طریقہ اگرچہ مختلف ہے ....
مگر امداد دینے کا اصول سب کے معاملے میں ایک ہی ہے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی گھریلو دستکاریوں کے لئے بھی قرض اور ساز و سامان دیا جا سکتا ہے اور ان کی نکاسی وغیرہ کے معاملے میں مفت امداد پہنچائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا سہولتوں کے علاوہ اس بات کی ریسرچ بھی ہو رہی ہے کہ پرانے صنعتی آلات میں کیا اصلاحیں کی جائیں کہ مال اچھا اور زیادہ مقدار میں تیار ہو سکے۔ اس سلسلے میں امبر چرخے کی مثال ہے۔ امبر چرخے سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس سے پرانے قسم کے معمولی چرخوں کی نسبت تین چار گنا زیادہ سوت تیار ہو سکتا ہے۔ غرض ملک کے کونے کونے میں صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ گاؤں کے مردوں اور عورتوں کو کام سکھایا جا رہا ہے اور انھیں کام پر لگایا بھی جا رہا ہے۔ اس طرح گاؤں میں بے کاری اور بیروزگاری کا جو زبردست مسئلہ تھا، اُسے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ـــــ آپ بھی اگر اپنی آمدنی بڑھانا چاہتے ہیں تو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائیے۔

خریدار کو اس کی کل قیمت کا صرف پانچواں حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ باقی رقم چھوٹی چھوٹی قسطوں میں ادا کی جاسکتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اپنی ضرورت کے مطابق مشینیں وغیرہ تھوڑی سی رقم لگا کر خرید سکتے ہیں، باقی رقم جب آپ کمانے لگیں تو تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کر سکتے ہیں۔

چھوٹی صنعتوں کو امداد دینے والی سنستھا کے ٹکنیکل افسر، اگر ضرورت پڑے تو آپ کو مشین لگانے اور انہیں چالو کرنے میں بھی مدد دے سکتے ہیں۔ مشینوں کے چل پڑنے کے بعد بھی یہ افسران آپ کے کارخانے میں وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے اور اگر کوئی مشکل پیش آئے گی تو اسے دور کرنے میں آپ کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کسی ایسے گاؤں میں رہتے ہیں جو کسی مخصوص چھوٹی صنعت کے لئے منتخب کیا گیا ہے تو آپ صلاح مشورہ لینے کے لئے اس گاؤں کے بستار سنٹر (ایکس ٹینشن سنٹر) میں جاسکتے ہیں۔ گاؤوں میں چھوٹی صنعتیں شروع کرانے کی غرض سے ایسے بہت سے بستار سنٹر کھولے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤوں میں چلتی پھرتی گاڑیاں بھی بھیجی جاتی ہیں جو لوگوں کو مشینیں چلانے کا طریقہ بتاتی ہیں اور انہیں مختلف قسم کے کام بھی سکھاتی ہیں۔

مال کی نکاسی کا مسئلہ

اب آپ نے فرض کر لیجئے اپنا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھڑا کر لیا ہے آپ کے پاس سرمایہ بھی کافی مقدار میں جمع ہو گیا ہے۔ تالے یا جوتے یا بنیان یا بلیڈ یا سائیکلیں یا سلائی کی مشینیں غرض جو مال بھی آپ کے کارخانے میں تیار ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ یہ مال بکے گا بھی یا یوں ہی پڑا رہے گا

مگر آپ کو فکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ آجکل بازاروں میں روزانہ کے استعمال میں آنے والی چیزیں خوب بکتی ہیں اس لئے کہ لوگوں میں ان چیزوں کے خریدنے کی طاقت اب پہلے سے بہت زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود اگر آپ کو اپنے مال کی نکاسی میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو آپ کو سہارا دینے کی غرض سے نکاسی کی سنستھائیں بھی قائم ہیں۔ مرکزی حکومت نے چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے "چھوٹی صنعتوں کا ایک قومی کارپوریشن" بھی قائم کیا ہے۔ اس کارپوریشن کی طرف سے ملک کے مختلف حصوں میں مال بیچنے والی "گاڑیاں" چلتی ہیں۔ یہ گاڑیاں چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا مال جمع کرتی ہیں اور اسے گاؤوں میں لے جاکر بیچ آتی ہیں۔

اس کارپوریشن کے ماتحت تھوک فروخت کے گودام بھی قائم ہیں۔ ان گوداموں میں آپ اپنا مال دے آسکتے ہیں جب وہ بک جائے تو جاکر اس کے دام لاسکتے ہیں۔ سرکار نے چھوٹی صنعتوں میں تیار ہونے والے مال کا کچھ حصہ خود

ان گاؤں میں پروگراموں کے چلانے کا کام سرکاری محکموں کے ایکس ٹینشن ڈپارٹمنٹ کو سونپ دیا جائے گا، جن افسروں کے ذمہ یہ کام دیا جائے گا' انہیں اس کام کے لئے ٹریننگ بھی دی جائے گی۔ اس کام میں سروڈ سیوا سنگھ، ایکس ٹینشن ڈپارٹمنٹ کی مدد کرے گا اور کچھ معاملوں میں وہ خود ایکس ٹنشن کا کام بھی کرے گا۔

کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور گرام دان تحریکوں کے کارکنوں کو ان تحریکوں کے اغراض ومقاصد اور کام کے طریقوں سے واقف رکھنے کے لئے مختلف کانفرنس سیمینار کئے جائیں گے اور اس سلسلے میں کتابیں وغیرہ بھی شائع کی جائے گی۔

سروڈ سیوا سنگھ کے جو کارکن یہ کام کریں گے، وہ حسب ضرورت اعلیٰ افسران سے صلاح مشورہ کرتے رہیں گے۔

لوگوں سے دان میں گاؤں لینے کا کام سرکاری شعبے نہیں کریں گے۔ بلاک کے افسران بھودان اور گرام دان میں ملی زمینوں کو لوگوں کے بیچ تقسیم کرنے میں امداد پہونچائیں گے۔

گرام دان سے کچھ مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جیسے کوآپریٹیو کمیٹیوں کا قرض اور پنچایت وغیرہ۔ ان مسائل کے حل کے لئے متعلقہ قانونوں میں ترمیم کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

دان میں ملے پچھڑے ہوئے گاؤں کی اقتصادی حالت میں تیزی سے سدھار لانے کے لئے کچھ گاؤں میں آزمائشی منصوبے (pilot project) شروع کئے جائیں گے۔ ان منصوبوں کے مطابق غریب خاندانوں کی امداد کی جائے گی۔ ان منصوبوں سے جو نتائج سامنے آئیں گے وہ اگلے پنج سالہ منصوبے میں پس ماندہ طبقوں کی ترقی کے پروگرام کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

شہری علاقوں میں سماجی تعلیم

مرکزی وزارت تعلیم نے شہری علاقوں میں سماجی تعلیم کی مختلف سرگرمیوں کے بیچ باہم اشتراک قائم کرنے کے لئے بیس شہروں میں کوآرڈینیٹنگ کونسلوں کے قیام کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ یہ کونسلیں سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں ہوئے افراد اور اداروں کی رہنمائی کریں گی ان کو صلاح ومشورہ دیں گی، اس سلسلے میں ضروری کتابچے اور دوسری ں کی اشاعت کریں گی اور ان کاموں میں روپے پیسے سے بھی امداد کریں گی جس کام کو دوسرے ادارے ابتک ں کر رہے ہیں۔

ان کونسلوں کا قیام کچھ چنے ہوئے شہروں میں یا تو ریاستی حکومتیں خود کریں گی یا یونیورسٹیوں اور میونسپل ڈوں کے ذریعے کرائیں گی۔

گرام دان اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی سرگرمیوں میں اشتراک و تعاون

ایک جائزہ

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت نے گرام دان اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم کے بیچ اشتراک بنانے کے لئے کئی ایک ابیر کی ہیں۔

پچھلے دسمبر میں نئی دہلی میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت اور سرو سیوا سنگھ کے نمایندوں کی ایک بیٹھک ہوئی ی۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے وزیر شری سریندر کمار ڈے نے اپنے ایک مراسلے میں سبھی ریاستی حکومتوں کو اس بیٹھک سفارشات کی طرف متوجہ کیا۔ اس مراسلے کے مطابق سرو سیوا سنگھ کے رہنما ان سفارشات پر عمل کرانے کے لئے ریاستوں کے ریراعلیٰ سے بات چیت کریں گے۔

یاد ہوگا کہ پچھلے ستمبر میں گرام دان کانفرنس ہوئی تھی اس کانفرنس میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ ر گرام دان کی تحریکیں باہم اشتراک و تعاون سے چلنی چاہئیں۔ اس کے بعد سے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے وزیر شری ایس ۔ ڈے اور سیووانی رہنما شری جے پرکاش نارائن اس مسئلہ پر کافی تبادلۂ خیال کر چکے ہیں۔

کافی غور و بحث کے بعد ایک خاکہ تیار کیا گیا، جس میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور گرام دان تحریکوں کے خاص غاصد اور کام کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان دونوں تحریکوں کے کام میں ایک اشتراک بنا رہے۔ ایک وسری بیٹھک میں اس منصوبے پر غور کیا گیا۔ اس بیٹھک میں وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو شری گوبند ولبھ پنت شری وی۔ ٹی۔ کرشنماچاری ــــ شری گلزاری لال نندا، شری سریندر کمار ڈے اور سرو سیوا سنگھ کے نیتاؤں نے حصّہ لیا۔

اس بیٹھک میں یہ طے کیا گیا کہ گرام دان میں ملے گاؤں کی چوکھی ترقی کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں کے ذریعہ کی جائے اور اُسے ہی اس کے لئے پوری طرح ذمہ دار قرار دیا جائے۔ یہ پروگرام اس طرح چلایا جائے کہ گاؤں والوں میں بھائی چارہ بڑھے، وہ خود کفیل ہوں اور انھیں کام کے کرنے کی تحریک ملے۔

وزیر تعلیم شری ویکیٹپا نے فورڈ فاؤنڈیشن کے کاموں کی تعریف کی اور بتایا کہ کس طرح یہ ادارہ ہندوستان اور اُس کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگا ہوا ہے۔ میسور اسٹیٹ ایڈلٹ ایجوکیشن کونسل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ یہ کونسل ان سنستھاؤں میں سے ہے جس نے ملک سے ناخواندگی کے کلنک کو مٹانے میں پہل کی ہے۔ فورڈ فاؤنڈیشن (یو۔ ایس۔ اے) کے صدر مسٹر ہیلڈ، ڈاکٹر اسپنجر، شری ملی مادھیا گاوڈا اور شری این۔ بھدریا اور دوسرے سرکاری افسروں نے اس میں شرکت کی۔

شری ویکیٹپا نے اپنی تقریر میں ودیا پیٹھ کے منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان ودیا پیٹھوں کا مقصد ملک کے دیہی علاقوں میں نوجوانوں کی لیڈرشپ کی تربیت کرنا ہے اور امید ظاہر کی کہ جلد ہی یہ سنستھائیں ملک کی نئی تعمیر کا گہوارہ بن جائیں گی۔

میسور ایڈلٹ ایجوکیشن کونسل کے چیرمین شری بھدریا نے شروع میں اپنی تقریر میں فورڈ فاؤنڈیشن کے کاموں کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ بالغوں کی تعلیم کے کاموں میں یہ ادارہ کس طرح امداد پہنچا رہا ہے۔

بنگال میں لٹریسی ورک شاپ

بانی پور بنگال میں ۶ ہفتوں کا ایک لٹریسی ورک شاپ ۱۶ دسمبر ۵۷ء سے شروع کیا گیا۔ شری ایس بی۔ دتہ جو کلکتہ یونیورسٹی کے ٹیچرس کالج میں نفسیات کے اُستاد رہ چکے ہیں، اس ورک شاپ کے ڈائرکٹر تھے۔ ۲۰ مصنفین اور دو آرٹسٹوں نے اس کام میں مدد دی۔ نوخواندہ بالغوں کے لئے کتابوں کو تیار کرنا اس پراجیکٹ کا خاص مقصد تھا۔ اس ٹیم کے کاموں میں بالغوں کا نفسیاتی مطالعہ، ان کی دلچسپی، ضرورت اور ان کی سمجھ کا مطالعہ اور بول چال کی بھاشا میں کتابوں کی تیاری وغیرہ شامل تھی۔

اُتکل یونیورسٹی کا قابلِ قدر فیصلہ

اُتکل یونیورسٹی نے سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کو بی۔ ایڈ کے امتحان میں پرائیویٹ شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ اسکول کے اساتذہ کو امتحانات وغیرہ میں بیٹھنے کی جو مراعات حاصل تھیں اب وہ ساری کی ساری سوشل ایجوکیشن کے کارکن بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

اُترپردیش میں لٹریسی ورک شاپ

اترپردیش کے محکمۂ تعلیمات نے پہلی بار نوخواندہ بالغوں کے لئے کتابیں تیار کرنے کے لئے ایک لٹریسی ورک شاپ

وزارت تعلیم ریاستی حکومتوں کے مشورہ سے کچھ چنی ہوئی کونسلوں کو بالغوں کے مستقل اسکول قائم کرنے کا کام سونپے گی یہ اسکول شہر کے رہنے والے سیانے آدمیوں کے لئے ہر معیار کی تعلیم اور دوسری تعلیمی سرگرمیوں کا اہتمام کریں گے۔

یاد ہوگا کہ حکومت ہند کے سامنے یہ تجویز دو سال پہلے انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے رکھی تھی۔ پچھلے سال مرکزی مشاورتی بورڈ کی سوشل ایجوکیشن کمیٹی نے اس تجویز کی منظوری دے دی تھی۔ مگر اب تک ایک بھی ریاست نے اس کونسل کے قیام میں گرمجوشی نہیں دکھائی ہے، جبکہ مرکزی وزارت اس کام کے لئے پوری کی پوری امداد دینے کو تیار ہے۔

سوشل ایجوکیشن کا ریفریشر کورس

دہلی کے سوشل ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ نے سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا پہلا ریفریشر کورس ابھی تھوڑے دن ہوئے لباس پور گاؤں میں کیا تھا۔

یہ کیمپ کارکنوں کے اندر گاؤں کی نئی تعمیر کے کاموں کے لئے ایک نیا جوش اور نئی اُمنگ پیدا کرنے کی غرض سے لگایا گیا تھا۔ اسی طرح اور دوسرے کیمپ بھی گاؤں کے ایک علاقے کو لے کر شروع کئے جائیں گے۔ تقریبا ۱۵۰ کارکن دہلی کے مختلف علاقوں میں ان کاموں کے لئے بکھرے پڑے ہیں

دہلی میں سوشل ایجوکیشن کے لئے اشتراک و تعاون کی کمیٹی

حکومت ہند نے دہلی میں سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں ایک ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ایک کوارڈینٹنگ کونسل کی تشکیل کی ہے۔ اس کمیٹی میں مختلف سرکاری شعبوں اور رضا کار انجمنوں کے ۱۳ نمایندے شریک ہوں گے۔

وزارت تعلیم کے ریاستی وزیر ڈاکٹر کے۔ ایل شریمالی اس کمیٹی کے چیرمین ہوں گے۔

میسور میں ودیاپیٹھ منصوبے میں فورڈ فاؤنڈیشن کی امداد

میسور میں ودیاپیٹھ اسکیم لئے فورڈ فاؤنڈیشن نے میسور ایڈلٹ ایجوکیشن کونسل کو ۱۰۸۹۰۰ روپے بطور امداد پیش کئے ہیں۔ فورڈ فاؤنڈیشن کی امداد کے تحت پہلی ودیاپیٹھ کی تعمیر کا کام مانڈیا ضلع کے سوگندا مقام پر شروع کیا جا چکا ہے۔ ۱۳ر جنوری کو اس ودیاپیٹھ میں پانی کی سپلائی کا افتتاح کرتے ہوئے میسور کے

چلایا ہے۔ الہ آباد میں اس ورک شاپ کا افتتاح ۱۲ جنوری ۶۰ء کو محکمۂ تعلیم کے جوائنٹ ڈائرکٹر مسٹر ڈی۔ ایس۔ سیال نے کیا۔
اس ورک شاپ میں ریاست کے مختلف علاقوں سے آئے ۲۰ مصنفین کو نوخواندہ بالغوں کے لئے کتابیں تیار کرنے کے لئے ڈیڑھ ماہ کی ٹریننگ دی جائے گی۔

جنتا کالج ڈبوک کے طلباء دہلی میں

پچھلے دنوں راجستھان (شو و دیا پیٹھ اُدے پور) کے ڈبوک جنتا کالج سے کچھ طالب علم علی پور جنتا کالج آئے ہوئے تھے۔ ان طالب علموں نے ایک کیمپ کی شکل میں یہاں پندرہ دن تک قیام کیا۔ اس کیمپ کا افتتاح دہلی کے محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر شری اے۔ این۔ بنرجی نے کیا۔ اس موقع پر ایک نمائش بھی لگائی گئی تھی۔

کیمپ کے دوران میں ان طالب علموں نے اپنے پروگرام میں پربھات پھیری اور شرم دان کو بھی جگہ دی۔ جنتا کالج کے فارم میں کوئی ... فٹ لمبی نہر کھودی اور آس پاس کے گاؤں والوں سے بھی اپنے تعلقات قائم کئے۔ کیمپ کے دوران میں ایک چھوٹا سا دواخانہ بھی چلایا گیا اور مختلف تہذیبی اور تفریحی سرگرمیاں منظم کی گئیں۔ حکومت ہند کے مددگار مشیر تعلیم ڈاکٹر پی ڈی شکلا نے اختتامی جلسے کو خطاب کیا۔



The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

Printer and Publisher : BARKAT ALI Firaq : Printed at RamaKrishna Printing Press Delhi.

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جلد نمبر ۹ مارچ سنہ ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر ۳

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارہ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر
برکت علی فراق
رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ (جامعہ نگر) نئی دہلی

ٹیلی فون نمبر ۴۲۴۶۱

قیمت سالانہ: چار روپے

کوآرڈینیشن

سوشل ایجوکیشن کا جدید تصور جب سے سامنے آیا ہے، یہ کام بہت تیزی سے پھیلا ہے۔ ریاستی حکومتوں کے محکمۂ تعلیمات اور مرکزی وزارتِ تعلیم اس کام میں رضاکارانہ جماعتوں کے ساتھ ساتھ پہلے ہی سے لگی ہوئی تھیں کہ کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کی اسکیم سامنے آگئی اور یہ کام کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کی وزارت کے مخصوص کاموں میں شمار کیا جانے لگا۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ والے بھی اس میدان میں آئے اور اُنھوں نے اپنے تحت اس پروگرام کو اپنانے اور پھیلانے کی کوشش کی۔ آج اِس پروگرام کو چلانے والے پانچ طرح کے خاص ادارے ہیں (۱) مرکزی وزارتِ تعلیم (۲) ریاستوں کے محکمۂ تعلیمات (۳) کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کے منصوبے (۴) میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور (۵) رضاکارادارے۔ یہ رضاکارادارے جو کام کرتے ہیں وہ بیشتر حکومت کی امداد سے کرتے ہیں، ان کو کہیں ریاستی حکومتوں سے گرانٹ ملتی ہے تو کہیں مرکزی وزارتِ تعلیم سے، میونسپلٹیوں سے یا سوشل ویلفیر بورڈ جیسے نیم سرکاری اداروں سے۔

اِدھر کچھ سال سے کام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ پروگرام کی کامیابی کے جائزے بھی لئے جاتے رہے ہیں، اور اب تو اس میدان میں تحقیق کے کام بھی شروع ہو گئے ہیں۔ مگر اس میدان میں جو سب سے بڑا مسئلہ ہے اُس کے حل ہونے میں آج بھی بہت سی دقّتیں درپیش ہیں، وہ ہے ان بکھری ہوئی سنستھاؤں کو ایک رشتہ میں ہم آہنگ کرنا، ان کے پروگراموں میں باہم اشتراک قائم کرنا اور کاموں کی تکرار سے بچانا۔

شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی کوآرڈینیٹنگ کونسلوں کے قائم ہو جانے اور جیسا کہ مرکزی وزارتِ تعلیم کا دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت ہر ضلع میں ایک چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے تقرر کا پروگرام ہے یہ ضرورت کچھ حد تک پوری ہو جائے گی

ترتیبِ مضامین

(مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

کوآرڈینیشن

سوشل ایجوکیشن کا جدید تصور جب سے سامنے آیا ہے، یہ کام بہت تیزی سے پھیلا ہے۔ ریاستی حکومتوں کے محکمۂ تعلیمات اور مرکزی وزارتِ تعلیم اس کام میں رضا کارانہ جماعتوں کے ساتھ ساتھ پہلے ہی سے لگی ہوئی تھیں کہ کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کی اسکیم سامنے آگئی اور یہ کام کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کی وزارت کے مخصوص کاموں میں شمار کیا جانے لگا۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ والے بھی اس میدان میں آئے اور اُنھوں نے اپنے تحت اس پروگرام کو اپنانے اور پھیلانے کی کوشش کی۔ آج اِس پروگرام کو چلانے والے پانچ طرح کے خاص ادارے ہیں (۱) مرکزی وزارتِ تعلیم (۲) ریاستوں کے محکمۂ تعلیمات (۳) کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کے منصوبے (۴) میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور (۵) رضاکار ادارے۔ یہ رضاکار ادارے جو کام کرتے ہیں وہ بیشتر حکومت کی امداد سے کرتے ہیں، ان کو کہیں ریاستی حکومتوں سے گرانٹ ملتی ہے تو کہیں مرکزی وزارتِ تعلیم سے، میونسپلٹیوں سے یا سوشل ویلفیر بورڈ جیسے نیم سرکاری اداروں سے۔

اِدھر کچھ سال سے کام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ پروگرام کی کامیابی کے جائزے بھی لئے جاتے رہے ہیں، اور اب تو اس میدان میں تحقیق کے کام بھی شروع ہو گئے ہیں۔ مگر اس میدان میں جو سب سے بڑا مسئلہ ہے اُس کے حل ہونے میں آج بھی بہت سی دقتیں درپیش ہیں، وہ ہے ان بکھری ہوئی سنستھاؤں کو ایک رشتہ میں ہم آہنگ کرنا، ان کے پروگراموں میں باہم اشتراک قائم کرنا اور کاموں کی تکرار سے بچانا۔

شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی کوآرڈینیٹنگ کونسلوں کے قائم ہو جانے اور جیسا کہ مرکزی وزارتِ تعلیم کا دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت ہر ضلع میں ایک چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے تقرر کا پروگرام ہے یہ ضرورت کچھ حد تک پوری ہو جائے گی

ترتیبِ مضامین

(مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

ہم حکومت کی اس اسکیم کا خیرمقدم کرتے ہیں اور ریاستی حکومتوں سے اِس بات کی درخواست کرتے ہیں کہ وہ کوآرڈینیٹنگ کونسلوں کے قیام میں پیش قدمی کریں۔

کوشش کی جاتی ہے کہ گاؤں کی زندگی اپنے آپ میں ایک 'کل' ہے اور اس کے کسی ایک جز کو نظر انداز کردینے کا اثر اور اُس کے دوسرے تمام پہلوؤں پر بھی پڑتا ہے۔

شروع شروع میں سوشل ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اور ان کے کاموں سے متعلق لوگوں کے ذہن صاف نہیں تھے۔ بلاک کی سطح پر جس عملے کا تقرر ہوا اس میں زراعت، صحت، صفائی، امداد باہمی افزائش نسل اور دوسرے کاموں کے ماہرین شامل تھے، جنھیں توسیع (ایکس ٹنشن) کے کاموں کی تعلیم بھی ملی ہوتی ہے۔ اس سے بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ شک پیدا ہو چلا تھا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا کام خواندگی کی کلاسوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس (خواندگی) کام کو بھی زراعت کا توسیعی پروگرام چلانے والے اپنا فرض جانتے کہ ناخواندگی کو مٹانا ان کے کاموں کا ایک ضروری جز ہے۔ ایک اور رائے کے لوگ تھے جو سوشل ایجوکیشن کی ضرورت سے ہی منحرف تھے اور ڈیولپ منٹ کی گاڑی میں اسے ایک پانچویں پہیئے سے تعبیر کرتے ہیں۔

سوشل ایجوکیشن کے راستے میں اس طرح کی دقت کا آنا کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی اس لئے کہ اسے بہت وسیع معنی نہ پہنانے سے اس کی جو شکل سامنے آتی وہ اس کے شایانِ شان نہیں ہوتی ہے اور اس سے نکلنے والے نتائج شاید کسی بھی علاقے کی اصل ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس کے وسیع معنی اس کی اصل شکل اور رنگ روپ کو بہت گنجلک اور غیر واضح بنا دیتی ہے۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام

انہیں باتوں کے پیش نظر ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کاموں کا ایک خاکہ بنالیا جائے اس سلسلے میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کاموں کا ایک مختصر اور جامع خاکہ بناکر ہر ریاستی حکومت کے پاس بھیجا گیا اور ڈیولپ منٹ کمشنروں سے مشورہ مانگا گیا۔ اور اب ہر بلاک میں کچھ ایسے کام ہیں جنھیں متفقہ طور پر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا کام تسلیم کیا جا چکا ہے۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے فرائض متعین ہو جانے پر یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کاموں کے عملی میدان میں اس کی حیثیت پہلے سے زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ اُس کے فرائض میں دو طرح کے کام شامل ہیں۔ ایک وہ کام جو اس کے لئے مخصوص ہیں۔ دوسرے وہ جو عام نوعیت اور عام بیداری پیدا کرنے کے کام ہیں۔ اُس کے لئے جو کام مخصوص ہیں یعنی وہ کام جو دوسرے فنون کے ماہرین کے علاقے میں نہیں آتے ان میں خواندگی کی

کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں سوشل ایجوکیشن کا مقام

(دوسری قسط)

شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے جی کے مضمون کی یہ دوسری اور آخری قسط ہے مضمون کے پہلے حصے میں فاضل مصنف نے سوشل ایجوکیشن کے تصور کے ارتقا اور مدھیہ پردیش کی مثال دیتے ہوئے سوشل ایجوکیشن کے تنظیمی ڈھانچے کی وضاحت کی تھی۔ اس کے بعد کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم کے سامنے آجانے کے بعد کس طرح یہ پروگرام بھی اس کا ایک لازمی جز قرار دیا گیا اور اس کی تنظیم کس ڈھنگ پر کی گئی وغیرہ باتوں پر بحث کر لینے کے بعد فاضل مصنف نے اس دوسرے حصے میں سوشل ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام اور ان کی حیثیت اور مرکزی وزارت تعلیم کے کاموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایڈیٹر

گاؤں والوں کی ترقی کا پروگرام

ہندوستان میں سوشل ایجوکیشن کے تصور اور اس کے انتظامی ڈھچر کی وضاحت کر دینے کے بعد اب میں ذرا آسانی سے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے ہندوستانی پروگرام میں سوشل ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام اور ان کی حیثیت سے متعلق بحث کر سکوں گا۔ ہندوستان میں ان پروگراموں کے مقاصد بہت وسیع ہیں۔ اور جیسا کہ کہا گیا ہے یہ پروگرام گاؤں کی ترقی کا پروگرام نہیں گاؤں والوں کی ترقی کا پروگرام ہے۔ اس کا مقصد گاؤں والوں کی زندگی کے ہر پہلو کو روشنی اور فراوانی بخشنا اور آگے بڑھانا ہے۔ اسے سماجی اور اقتصادی ترقی کا نام دینے میں بھی ذرا احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اس پروگرام کا مطمح نظر زندگی کے کسی ایک یا دو شعبے کو اجاگر کرنا نہیں بلکہ ساری زندگی کو ہمہ گیر ترقی دینا ہے۔ یہ مانتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں زندگی کے کچھ شعبوں جیسے غذائی پیداوار، صحت، امداد باہمی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور بار بار اس مطمح نظر کو سامنے رکھنے کی

ایکس ٹنشن ورکر ہی ہوتے ہیں۔ زراعت سے متعلق نئی نئی تحقیقات سے جو نتائج سامنے آتے ہیں، ان کی توسیع کے لئے اکثر و بیشتر وہی طریقے اپنائے جاتے ہیں، جو ایڈلٹ ایجوکیشن کے لئے مخصوص ہیں۔ اتنا ہی نہیں کبھی کبھی بہت سے تعلیمی کام بھی جیسے لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا زراعت کے توسیعی پروگراموں کے تحت آ جاتا ہے اور آگے چل کر بستی کی تنظیم کے دوسرے پہلو جیسے صحت، فن خانہ داری اور مکانوں کی تعمیر وغیرہ بھی اس کے توسیعی پروگراموں کے تحت آ جاتے ہیں اسی طرح ماہر صحت اپنے توسیعی کاموں میں اُن بہت سے کاموں کو لے لیتا ہے اور اس طرح وہ بہت سے کام اس کے تحت آ جاتے ہیں جو سوشل ایجوکیشن، زراعت یا کسی دوسرے فنی کام کے تحت بھی آ چکے ہوتے ہیں۔ کاموں کی یہ تکرار اور ایک کا دوسرے مخصوص فن کی حد میں گذر۔ ان باتوں نے کچھ خاص حالت میں اپنی جڑیں جما لی ہیں، جبکہ ہندوستان میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کے تحت سوشل ایجوکیشن کے ڈھنگ پر ایڈلٹ ایجوکیشن کا کوئی پروگرام شامل نہیں کیا گیا تھا۔

بیشتر یہ بھی ہوتا ہے کہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام میں بلاک ڈیولپ منٹ افسر، جو اُس بلاک کے انتظامی امور کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے، سمجھتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے وہ کام جو عام بیداری پیدا کرنے یا عام نوعیت کا کام ہے وہ اُسے ہی کرنا چاہئے۔ یہ دراصل اُس فرق کو نہ سمجھ پانے کا نتیجہ ہے جو ایک انتظامی افسر اور تعلیمی کام کرنے والے کے مابین ہوتا ہے ایک انتظامی افسر اعلیٰ کا کام ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہر فن کے کام کو انتظامی اعتبار سے ممکن بنا دے، جبکہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا کام ہے۔ ان کاموں کو تعلیمی اعتبار سے پختہ بنانا۔ یہ بات کچھ زیادہ ممکن نہیں ہے کہ ایک انتظامی افسر ایک اچھا معلم بھی ہو۔ انتظامی امور کے افسر سوشل ایجوکیشن کے اس عام نوعیت کے کام کرنے کے پوری طرح اہل اس لئے بھی نہیں ہوتے کہ انھیں تعلیمی طریقوں اور تعلیمی اصول سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا اور نہ انھیں ان کاموں کی ٹریننگ ہی ملی ہوتی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بستی کی ہمہ گیر ترقی کے ایک مکمل اور جامع پروگرام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ماہر فن اپنے اپنے شعبے کا تعلیمی کام خود کرے۔ مگر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ دقتیں ضرور پیش آتی ہیں۔ ایک ماہر فن بنیادی طور پر اپنے مخصوص فن کا ماہر ہوتا ہے، تعلیمی کاموں سے اس کا لگاؤ اور اس کی جانکاری ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کارکن زراعت یا حفظان صحت کے کاموں میں خاصی مہارت رکھتا ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ دیہات والوں کے بیچ تعلیمی اصولوں اور تعلیمی طریقوں کے پیش نظر کام کرنے میں بھی اسی طرح منجھا ہوا ہو۔ گاؤں کے سیانے آدمیوں کو اس بات کے لئے تیار کرنا کہ وہ نئے نئے خیالات کو اپنائیں، ایک بہت سست کام عمل ہے۔ اس کے لئے بہت صبر اور استقلال سے کام کرنے اور کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

کلاسیں چلانا، خواندگی کے اساتذہ کو ٹریننگ دینا، شہریت کی تعلیم، دیہی کتب خانے اور ریڈنگ روم چلانا اور دوسری مشغلی سرگرمیوں کا اہتمام کرنا، تہذیبی اور تفریحی سرگرمیاں منظم کرنا، نوجوانوں کی بہبود، عورتوں اور بچوں کی بہبود کے کام دکھا اور سنا کر تعلیم دینے کے ذرائع، ریڈیو سنانا، کمیونٹی سینٹر چلانا وغیرہ۔ اس کے ان مخصوص کاموں میں بھی کبھی کبھی تکرار دیکھنے میں آتی ہے۔ زراعت کے توسیعی پروگراموں کا ماہر سمجھتا ہے کہ خواندگی کی کلاسیں چلانا، نوجوان سبھاؤں (خاص طور سے نوجوان کسان منڈل) کا قیام دکھا سنا کر تعلیم دینے کے ذرائع جیسے فلم، فلمچے اور پوسٹروں کا استعمال اس کے کاموں میں شامل ہے۔ اسی طرح حفظان صحت کا ماہر سمجھتا ہے کہ لوگوں کو حفظان صحت کی تعلیم دینا، اسی کا کام ہے نہ کہ یہ کام سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو کرنا چاہئے۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے عام نوعیت کے کاموں یا عام بیداری پیدا کرنے کے کاموں میں سبھی فنی کاموں کے لئے سماج تعلیم کا ایک وسیع پروگرام پیش کرنا ہوتا ہے۔ بلاک کی سطح پر ترقیاتی پروگراموں کو سمجھانے اور اس کے لئے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے اُسے اُس علاقے کے ترقیاتی پروگراموں کو ان کی زندگی سے مربوط کر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام وہ بستی کے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر ساری بستی تنظیم کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ اس کام میں اُسے رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے دونوں طریقوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ سوشل ایجوکیشن اس طرح سماج میں ایک سوچی سمجھی تبدیلی لانے کا بہت کارگر ذریعہ ہے۔

اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں تھا کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں میں سوشل ایجوکیشن کا یہی اہم اور ضروری کام ہے، مگر عملی حیثیت سے اسے تسلیم ہونے میں دیر ضرور لگی۔ اور یہ باتیں ابھی کچھ دنوں پہلے تک ڈیولپمنٹ افسروں کی کانفرنسوں اور سیمناروں میں بحث مباحثے کا موضوع ہوا کرتی تھیں۔ مگر اب بھی سوشل ایجوکیشن کے اس عام نوعیت یا عام بیداری پیدا کرنے کے کاموں کا انحصار اس بات پر ہے کہ ریاستی سطح کے ڈیولپمنٹ کمشنروں سے لے کر بلاک ڈیولپمنٹ افسر تک جو انتظامی عملہ ہے اس کا رویّہ کیا رہتا ہے، وہ اس سلسلے میں کیا سوچتے اور سمجھتے ہیں، اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو اس کام کے لئے کیا کیا سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر، مختلف فنون کے ماہر اور بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر

سوشل ایجوکیشن کے آرگنائزر کے اس عام نوعیت والے کاموں سے متعلق بہت سے بنیادی اختلافات کچھ حلقوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بلاک کی سطح پر ہر ماہر فن، جس میں ماہر زراعت خاص طور سے شامل کیا جا سکتا ہے،

سے کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔

گرام سیوک

یہ صحیح ہے کہ گاؤں میں جو بھی کام کئے جاتے ہیں، وہ سب کے سب گرام سیوک کے توسط سے ہوتے ہیں یہاں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ بلاک کی سطح پر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے جبکہ سارا کا سارا کام گاؤں میں گرام سیوکوں کے توسط سے ہوتا ہے اور اگر ان کی ضرورت باقی رہتی ہے تو گرام سیوک سے ان کا کیا رشتہ ہے۔ جہاں تک بلاک کی سطح پر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی ضرورت کا تعلق ہے اس کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسرے ماہرین خصوصی کا۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو اپنے فن میں خاص ٹریننگ ملی ہوتی ہے۔ وہ پورے علاقے کے لئے پروگرام تیار کرتا ہے، الگ الگ گرام سیوکوں کی رہنمائی کرتا ہے اور کبھی کبھی گاؤں میں جاکر بہت سارے کاموں کی پیشقدمی کے لئے آگے بڑھتا ہے اور ان حالات کا سامنا کرتا ہے جن کو گرام سیوک اکیلے نہیں کر پاتے۔

سوشل ایجوکیشن کے تین طرح کے پروگرام

سو گاؤں کا علاقہ، جو ڈیولپمنٹ بلاک کے اندر آتا ہے، سوشل ایجوکیشن کے دو آرگنائزروں کے لئے خاصہ بڑا علاقہ ہے جہاں سوشل ایجوکیشن کی ایک خاتون آرگنائزر ہوتی ہیں وہ اپنی ذمہ داریوں کو عموماً عورتوں اور بچوں تک ہی رکھتی ہے۔ اس اتنے بڑے علاقے کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا کام ہر گاؤں میں ایک ہی طرح کے جوش اور انہماک سے کیا جائے۔ اس لئے پروگرام کے اعتبار سے گاؤں کو تین قسموں میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ کچھ گاؤں میں سوشل ایجوکیشن کا بھرپور پروگرام شروع کیا جاتا ہے، کچھ میں ذرا بڑے پیمانے پر اور باقی گاؤں میں سوشل ایجوکیشن کا محض معمولی کام ہوتا ہے۔

ہر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاقے کے کم سے کم ایک گاؤں میں نمونے کے طور پر سوشل ایجوکیشن کا پورا پروگرام چلائے اور سوشل ایجوکیشن کا پروگرام ذرا بڑے پیمانے پر اپنے علاقے کے ان دس گاؤں میں چلائے جسے گرام سیوک اپنا مرکز بناتے ہیں اور باقی گاؤں میں سوشل ایجوکیشن کا معمولی پروگرام چلانا تینوں طرح کے ان پروگراموں میں جو فرق ہے وہ محض ذرائع کی کمی کی وجہ سے ہے اور جوں جوں یہ ذرائع بڑھتے جائیں گے یہ فرق بھی ختم ہو جائے گا۔

اس لئے بہتر اور مفید یہی ہوگا کہ لوگوں کے ذہنوں کو تیار کرنے کا کام سوشل ایجوکیشن آرگنائزر پر چھوڑ دیا جائے، جسے اُس کام کی خاص طور پر ٹریننگ ملی ہوتی ہے۔

ایک مثال

ایک مثال کے ذریعہ میں اپنی بات اور صاف کرنے کی کوشش کروں گا۔ زمین کی زرخیزی بڑھانا گاؤں کا ایک مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ ہے اچھی اور عمدہ کھاد کی تیاری اور فراہمی۔ لوگوں کو تیار کرنا کہ وہ گوبر اور کوڑے کرکٹ سے کمپوسٹ کھاد تیار کریں۔ انھیں بتانا کہ وہ گوبر کے اُپلے جلا کر اُسے اس طرح ضائع نہ کیا کریں۔ یہ کام زراعتی پروگرام کے تحت آتا ہے۔ ماہر زراعت کا یہ کام ہے کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ کھاد بنانے کے لئے گڑھا کس طرح کا ہونا چاہئے۔ اُسے کس طرح کھود کر تیار کرنا چاہئے، اس میں کوڑا کرکٹ کس طرح ڈالنا چاہئے اور کتنے دن اُسے اس میں پڑے رہنے دینا چاہئے۔ دوسرا کام ہے لوگوں کو اس طرح کی نئی باتوں کے لئے آمادہ کرنا اور اس طرح کام کرنے کی عادت ڈالنا۔ اس کے لئے بحث مباحثے کی مجلسیں کرنی ہوں گی۔ ان کی دقتوں اور مسائل کو سمجھنا اور انھیں رفع کرنے کی تدابیر پر غور کرنا ہوگا۔ تعلیم کے رسمی اور غیر رسمی دونوں طریقوں کو اپنانا ہوگا۔ غیر رسمی تعلیم کا طریقہ شاید زیادہ موزوں ہوگا۔ لوگوں کے ذہن میں غیر ارادی طور پر ان باتوں کے نقش کرنے کے لئے ان خیالات کو مختلف کھیل تماشوں، ڈراموں، گانوں اور فلموں وغیرہ کے ذریعہ پیش کرنا ہوگا۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو ان سب کاموں کی ٹریننگ ملی ہوتی ہے۔ وہ گانے بنا سکتا ہے۔ کہانی سنا سکتا ہے اور سیدھے سادے ڈرامے بھی ان موضوع کو سامنے رکھکر تیار کر سکتا ہے۔ وہ ماہر زراعت کے ان کاموں میں مدد پہونچا کر دوسرے فنی کاموں کے لئے اس کا وقت اور اس کی محنت بچا سکتا ہے۔

ہندوستان کے اُن علاقوں میں جہاں کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاکوں میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اپنا عام نوعیت اور ہمہ گیر ترقی کے لئے لوگوں کو بیدار کرنے اور عام فضا تیار کرنے کا کام کر رہے ہیں اور جن دوسرے علاقوں میں یہ کام کسی وجہ سے ممکن نہیں ہو سکا ہے ان میں یہ نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اول الذکر حالت میں منصوبوں سے متعلق ڈیولپمنٹ افسر مختلف فنوں کے ماہرین اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے مابین گفت و شنید ہوتی ہے۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر ان سب باتوں پر تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے جو لوگوں کو کسی بات پر آمادہ کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ وہ اس کام کو گرام سیوک، اسکول ماسٹر اور دوسری ایجنسیوں کی مدد

تعلیم بھی شامل ہوتی ہے۔

چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر

پروگرام کے پہلے تین سال میں سو سو گاؤں کے تین بلاک کو ملا کر ایک کمیونٹی پراجیکٹ کا علاقہ قائم کیا جاتا تھا اور اس کے لئے ایک چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اس چیف سوشل ایجوکیشن آفیسر کے کاموں میں پراجیکٹ کے علاقے کے لئے سوشل ایجوکیشن کا پروگرام تیار کرنا اور تین حلقوں میں بنٹے ہوئے سوشل ایجوکیشن کے ۶ آرگنائزروں کے کاموں کے بیچ اشتراک و تعاون بنانا، ان کو مشورہ دینا اور ان کے کاموں کی رہنمائی کرنا وغیرہ شامل تھا۔ کمیونٹی پراجیکٹوں کے ختم ہو جانے کے بعد سے چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا عہدہ بھی ختم ہو گیا۔ اب ادھر مرکزی وزارت تعلیم نے دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت ہندوستان کے ہر ضلعے میں ایک چیف سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا عہدہ قائم کر دینے کی اسکیم بنائی ہے۔ ضلعے کے یہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر، ضلعے میں ہونے والے سوشل ایجوکیشن کے تمام کاموں، یہ کام چاہے ڈیولپمنٹ بلاک میں ہو رہے ہوں یا ان حلقوں سے باہر، سب کا انتظامی افسر ہوگا، اور ریاستی محکمۂ تعلیمات اور بلاک کے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے بیچ ایک کڑی کا کام کرے گا۔ یہ اپنے ضلع میں سوشل ایجوکیشن کے کاموں کی توسیع کے لئے ذمہ دار ہوگا اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کے کاموں میں وقتاً فوقتاً جو الجھنیں پیش آئیں گی ان کو دور کرنے میں بھی ان کی مدد کرے گا۔

مرکزی وزارت تعلیم کا کام

سوشل ایجوکیشن کے میدان میں مرکزی وزارت تعلیم کا کام سارے ملک میں ہونے والے سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنا اور اس سلسلے میں خیالات کو ہموار کرنا ہے۔ یہ وزارت پلاننگ کمیشن کے تعاون اور کسی حد تک ڈیولپمنٹ کی وزارت کے تعاون سے سوشل ایجوکیشن کی مختلف اسکیمیں چلاتی ہے۔ وزارت تعلیم اپنی مرکزی مشاورتی کمیٹی اور سوشل ایجوکیشن کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے توسط سے سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں پیدا ہونے والے مشترکہ مسائل کو سمجھتی اور ان کا مداوا کرتی ہے۔ وزارتِ تعلیم کا کام سارے ملک کی امداد اور رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ مختلف تحقیق گاہیں قائم کرتی ہے، مثلاً ہدایات اور جائزوں کے پراجیکٹ

ٹریننگ سینٹر

سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کی ٹریننگ کے ۵ مرکز ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم ہیں۔ ان میں سے ایک سینٹر کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت کی براہ راست دیکھ دیکھ میں چل رہا ہے۔ باقی مرکزوں کا انتظام اُن مختلف رضاکار انجمنوں کے ہاتھ میں ہے جو پہلے ہی سے اس طرح کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ ٹریننگ پروگرام میں مختلف تعلیمی مضامین گاؤں کے کام اور تہذیبی اور تفریحی سامانوں کی تیاری وغیرہ کے عملی کام شامل ہوتے ہیں۔ تعلیمی مضامین میں سماجی علوم کے بہت سارے مضامین' دیہی معاشیات' شہریت' امداد باہمی' سوشل ایجوکیشن (اور دوسرے متعلقہ مضامین) مذہب' تواریخ' تہذیب' اور گاؤں کے توسیعی پروگراموں کی تعلیم شامل ہوتی ہے۔ اس کا مقصد سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو ان مضامین کی بنیادی باتوں سے متعارف کرنا ہوتا ہے' ان میں سے اکثر یونیورسٹیوں کے گریجوئٹ ہوتے ہیں۔ یہ ٹریننگ پانچ مہینے کی مدت کی ہوتی ہے۔ کام کے پانچ سالہ منصوبے کو سامنے رکھتے ہوئے اس مدت کو اور بڑھانا کچھ زیادہ مناسب نہیں سمجھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ پانچ مہینے کی یہ ٹریننگ ہر طرح سے مکمل ہو۔ اگر ایک تربیت یافتہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر میں کسی قسم کی کمی ہوتی ہے تو اس کمی کو ٹریننگ سینٹر اپنے بعد کے پروگراموں کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لئے سیمنار اور دوران ملازمت کے چھوٹے چھوٹے کورس چلائے جاتے ہیں۔

گرام سیوک اور گرام سیویکاؤں کی ٹریننگ

آج گرام سیوکوں کی ٹریننگ کے ۵۶ مرکز ہیں' جہاں انھیں زراعت اور توسیعی کاموں کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ زراعت کی ابتدائی تعلیم کے لئے یہ کورس ۱۰ مہینے کے ہوتے ہیں اور توسیعی کاموں کے لئے چھ مہینے کے۔ گرام سیویکاؤں کو فن خانہ داری میں ٹریننگ دینے کے ۳۰ مرکز ہیں۔

بلاک ڈیولپ منٹ افسروں کے لئے دو ماہ کا اعادی کورس پورا کرنے کا انتظام تین سینٹروں میں کیا جا چکا ہے دوران ملازمت میں ٹریننگ دینے کی غرض سے مختلف سیمنار منعقد کئے جاتے ہیں۔ گاؤں کی سطح پر گاؤں کے لیڈروں اور اسکول ماسٹروں کی ٹریننگ کے لئے کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ بہت سے جنتا کالج گاؤں لیڈروں کو لمبی مدت کی ٹریننگ دینے کا کام کر رہے ہیں۔ ان سب ٹریننگ کورسوں کے نصاب میں سوشل ایجوکیشن کی

بیلجین کانگو کی ایک صنعتی بستی میں

قبائلی عورتوں کا تربیتی پروگرام

کاتنگا کے علاقے میں بڑی بڑی صنعتوں کے قائم ہو جانے سے آج وہاں ہر طرف سے لوگ کھنچ کھنچ کر چلے جا رہے ہیں۔ کاسائی، لومانی، لیک البرٹ اور پچھلے سال سے رواندرا ندی کے دور دراز علاقوں سے مزدور برابر یہاں آ آ کر بس رہے ہیں۔

یہ مزدور اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر دور دراز کے اس صنعتی مرکز میں اپنے بال بچوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ان لوگوں کے بیچ وہی زبان، وہی رسم و رواج اور وہی تہذیب پائی جاتی ہے جو بیلجین کانگو کے قبائلی علاقوں کی خصوصیت ہے۔

اس صنعتی مرکز میں یہ لوگ اپنی روایاتی زندگی کے نشانات نہیں پاتے، جو ان کی قبائلی زندگی میں ایک ٹھوس بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ اس سے یہ لوگ اور ان کے کنبے والے اپنے آپ کو یہاں کچھ اکھڑا اکھڑا سا محسوس کرتے ہیں۔ اسی الجھن میں ان کی مدد کرنے کے لئے ضروری تھا کہ نئی سماجی اور گھریلو زندگی کے لئے ایک پس منظر تیار کیا جائے اور بدلے ہوئے مادّی حالات کے پیش نظر ان کو اپنی زندگی ڈھال لینے کے لئے تیار کیا جائے۔ عورتوں کی وجہ سے یہ مشکل اور بھی کٹھن ہو گئی تھی، جو اس قبائلی زندگی سے تازہ تازہ یہاں لائی گئی تھیں مرد نسبتاً زیادہ روشن خیال ہوتے ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو زیادہ آسانی سے ڈھال لیتے ہیں۔ جو عورتیں یہاں آتی ہیں وہ ساری کی ساری جاہل اور ان پڑھ ہوتی ہیں، انھیں اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوتا کہ اس تصباتی زندگی میں اپنے آپ کو ڈھالنا اور اس کی ضرورتوں کے مطابق گھر گرہستی اور سماجی اور گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے انھیں بھی کچھ کرنا چاہیئے۔

چلاتی ہے، نوسکھ بالغوں کے لئے ضروری کتابیں اور دوسرے امدادی سامان تیار کراتی ہے۔ سیمینار اور ورکشاپ کے ذریعہ کارکنوں کی ٹریننگ کا انتظام کرتی ہے اور رضاکار انجمنوں کو امداد دیتی ہے۔

سوشل ایجوکیشن کے میدان میں، مرکزی وزارت تعلیم کا سب سے بڑا کارنامہ نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سینٹر کا قیام ہے۔ اس سینٹر کے قیام کا خاص مقصد ملک میں سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں ایک نکھار لانا ہے۔ . . . . اس مقصد کے لئے اُس نے سوشل ایجوکیشن کے بڑے بڑے افسروں کی ٹریننگ کے لئے لمبی اور چھوٹی مدت کے مختلف ٹریننگ کورس چلانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ عہدہ داروں سے مراد ہے سوشل ایجوکیشن کے ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ضلع کے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر، جنتا کالجوں کے پرنسپل، مختلف ٹریننگ سنٹروں کے سوشل ایجوکیشن کے اساتذہ اور سوشل ایجوکیشن کی رضاکار انجمنوں کے عہدہ دار۔ یہ سینٹر سوشل ایجوکیشن کے میدان میں تحقیقی کام بھی کرے گا۔ اور سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں میں کام آنے والے مختلف امدادی سوالوں اور نمونے کی کتابوں کی تیاری کرے گا اور اسی کے ساتھ سوشل ایجوکیشن کے میدان میں کام کرنے والوں کو نشر و اشاعت کے ذریعے سوشل ایجوکیشن کی مختلف سرگرمیوں سے باخبر رکھنے کا کام بھی کرے گا۔

ہندوستان میں سوشل ایجوکیشن کا کام دن بدن پھیلتا جا رہا ہے۔ ایک پس ماندہ ملک کی قدیم تہذیبی روایات اور اُس ملک کی وسیع تعلیمی ضروریات کے پیش نظر سوشل ایجوکیشن کا نظریہ وجود میں آیا ہے اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کی ترقی پر ہی کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی ترقی منحصر ہے اور اُسی کے ذریعہ ریاستی پروگرام عوام کا پروگرام اور خود اپنی بہتری اور خوش حالی کا پروگرام بن جائے گا

"The article has been supplied by the Education Clearing House. Unesco as a part of its programme in the exchange of Technical information Education."

ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ تھا ان عورتوں میں پہونچنا اور ان کا اعتماد حاصل کرنا کسی بھی ماں کے لئے اور ایک افریقی عورت کے لئے تو بالخصوص سب سے عزیز اس کا بچہ ہوتا ہے جس سے وہ کسی قیمت پر بھی الگ ہونے کو تیار نہیں ہوتی۔ ہم نے ان بچوں کو ہی ماؤں[1] تک پہونچنے کا ایک بہانا بنایا اور پہلے ان ہی بچوں سے دلچسپی لینی شروع کی۔

ہمارے سینٹر کا کام پہلے پہل ایک نرسری اسکول کو لے کر شروع ہوا تین سال کی عمر کے کوئی ۵۰ بچے داخل ہوئے۔ پھر کیا تھا ان خوش قسمت بچوں کی مائیں اسکول کی کھڑکیوں کے پاس آکر جمع ہونے لگیں۔ وہ اپنے "لال" کو اسکول کی استانی کے ساتھ کھیلتے کودتے دیکھتیں اور خوش ہوتیں۔ اسکول ختم ہوتے ہی وہ اپنے بچوں کو اُٹھاتیں اور گود میں لے کر چلتے چلتے مسکراتیں اور ان "یوروپین ماماؤں" کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کرتیں اُن عورتوں سے قریب آنے کی یہی پہلی جگہ تھی۔

مگر یہ پہلا ہی قدم تھا۔ اُس صنعتی بستی کے افسران نے وہاں کے خاندان کی ایک فہرست ہمارے حوالے کی۔ اس اسکول کے کھلنے کے ایک مہینے کے بعد عورتوں کے کاموں کی ایک نمائش میں والدین کو بلایا گیا۔ اس نمائش میں ہم لوگوں نے اپنی غرض وغایت کو واضح کر دیا تھا۔ ایک طرف ایک پھٹا لباس رکھا گیا اور دوسری طرف وہی پھٹا پرانا لباس، اچھی طرح سلا ٹکا ہوا۔ ایک طرف ایک چراغ رکھا گیا، جو دھوئیں سے بالکل اٹا ہوا تھا، دوسری طرف روزانہ صاف کیا جانے والا ایک صاف شفاف چراغ۔ ایک طرف جوتے جو صاف نہیں کئے جاتے تھے اور دوسری طرف وہ جوتے جو پابندی سے صاف کئے جاتے ہیں۔ ایک طرف کھانے پینے کے برتن بے ترتیب بکھرے ہوئے . . . . تو دوسری طرف سلیقے سے صاف کئے ہوئے برتن الماریوں میں رکھے ہوئے۔ نمائش میں سلائی اور کڑھائی کے کچھ نمونے بھی رکھے گئے تھے، بچے کی ٹوپی، فراک اور پائجامہ وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ سارا گھر گرہستی کا ایک پروگرام تھا جو ایک عورت اگر ذرا سلیقے سے کام کرے تو باآسانی کرسکتی تھی۔

---

[1] ادارۂ تعلیم و ترقی نے بھی انھیں لائن پر تجربے کئے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے دہلی کے شہر میں کئی ایک مرکز "بالک ماتا سینٹر" کے نام سے قائم کئے ہیں۔ ان سینٹروں میں بچوں کو نرسری اسکولوں کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں اور عورتوں کے لئے دستکاری کی کلاسوں اور مختلف امتحانوں کی تیاری کے علاوہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے دوسرے پروگراموں کے ذریعے سماجی بستی کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔

کام کی شروعات

ہماری ٹیم میں سے تین، جن میں ایک سوشل ورکر اور ایک فنِ خانہ داری کی اُستانی بھی شامل تھیں ۱۹۴۷ء میں پہلے پہل کلویزی کیمپ میں سماجی بہبود کا کام شروع کرنے کی غرض سے آئیں۔ جلدی ہی اور دوسرے بھی شامل ہوتے گئے۔ اور آج اس ٹیم میں ہم سات کارکن ہیں ــــــ ۱۴٫۴۰۰ افراد کی آبادی کا یہ علاقہ ... ۲۴ کنبوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ آبادی برابر بڑھ رہی ہے۔

ہمارا پہلا کام تھا ان کی بولی چال کی زبان "سوہیلی" سیکھنا جس سے ہمیں ایک طرف ان عورتوں سے ربط ضبط بڑھانے میں آسانی ہوا اور دوسری طرف ہم ان کی پچھلی زندگی کے حالات کو سمجھ سکیں اور یہ اندازہ لگا سکیں کہ آئندہ کے بارے میں وہ کیا سوچ رہے ہیں، جس سے کہ ان کی مدد کرنے میں آسانی ہو۔

عملی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جو عورتیں یہاں اس صنعتی بستی میں آتی ہیں ان کو نئے سرے سے سارا کام کرنا ہوتا ہے۔ ان کی قبائلی زندگی اپنے گاؤں تک محدود ہوتی ہے، جہاں ان کی حیثیت گھر کی لونڈی جیسی ہوتی ہے۔ مرد گھر کا مالک ہوتا ہے۔ وہ دن بھر کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور مرد شکار کھیلنے جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔

اس صنعتی بستی میں معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے، یہاں کھیت نہیں ہیں جہاں وہ دن بھر کھٹ کر کام کریں، مگر یہاں جس طرح کے ماحول میں اور جس طرح کے گھروں میں زندگی گذارنی ہوتی ہے اُس میں اُن کے کرنے کے بہت سارے کام ہوتے ہیں۔

گاؤں کی زندگی میں ان کا کام ایک ہانڈی پکانے سے چل جاتا تھا، یہاں اپنے کھانے کو خوش ذائقہ اور اپنے گھر کو ٹھیک ڈھنگ سے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئی نئی باتیں سیکھیں اور ان پر عمل کریں۔ اپنے گھر کے آنگن میں چھوٹے موٹے باغ بغیچے لگائیں اُس میں اچھی اچھی کھانے کی سبزیاں اور دوسری چیزیں پیدا کریں۔ مردوں اور بچّوں کے کپڑوں کو ٹھیک رکھنا اور اُنھیں سینا ٹانکنا سیکھیں۔ گاؤں کی زندگی میں اُنھیں خرید و فروخت میں ناپ تول یا روپے پیسے کا حساب نہیں رکھنا ہوتا اور نہ اس طرح کی باتوں کا اُنھیں کوئی علم ہی ہوتا ہے۔ یہاں جو خرید و فروخت ہوتی ہے وہ روپے پیسے اور ناپ تول کے حساب سے ہوتی ہے۔ ان نئی باتوں کا جاننا بھی ان کے لئے ضروری تھا۔ پھر اس نئی زندگی میں انھیں کچھ اس طرح ڈھلنا تھا کہ اُس سے اُن کے روایاتی اعتقادوں اور اقداروں پر کوئی ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔

جاتا کہ کس طرح چیزوں کی قسم دیکھ کر دام لگائے جاتے ہیں۔

یہ ان کی دلچسپیوں کو ملحوظ رکھ کر ہی پڑھانے کا طریقہ تھا کہ آج وہاں انھوں نے بہت سی باتوں کے بارے میں عملی جانکاری حاصل کرلی ہے۔ اور لوگوں کی زندگی میں (اور جہاں سارے کے سارے خاندان نے اس میں حصّہ لیا ہے وہاں سارے خاندان کی زندگی میں) ایک خوشگوار تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے۔ گھر گرہستی کے کام پہلے سے اچھے ہونے لگے ہیں اور لوگوں نے صفائی ستھرائی سے رہنا سیکھ لیا ہے۔

سال کے اخیر میں سال بھر کے کاموں کی نمائش ہوتی ہے۔ عورتیں اب مرکز کی سرگرمیوں میں زیادہ گرمجوشی سے حصّہ لینے لگی ہیں۔ اور ہر سال ڈیڑھ سو عورتیں ان کورسوں میں شامل ہوتی ہیں۔ اس وقت تک کوئی دو ہزار عورتیں ان کورسوں سے فارغ ہو چکی ہیں اور مرکز سے اپنے تعلقات قائم کئے ہوئے ہیں۔

اُستانیاں

یہ بات صاف تھی کہ ہمارے اسٹاف میں جو چند اُستانیاں موجود تھیں ان کا کام مقامی عورتوں کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے سوچا گیا کہ پہلے بیچ میں جو عورتیں ان کورسوں میں آئی ہیں، انھیں اپنا معاون و مددگار بنایا جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر ان میں سے تین عورتوں کو منتخب کرلیا گیا جنھیں ان کاموں میں بہت دلچسپی تھی اور جن کی ان عورتوں کے بیچ خاصی مان جان تھی۔ چونکہ یہ عورتیں پڑھی لکھی نہیں تھیں اس لئے یہ ٹریننگ بھی ایسی ہی رکھی گئی جس میں لکھنے پڑھنے کا کام بالکل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے انھیں دوسری عورتوں کو سکھانے کا کام بھی سونپا گیا اور کہیں کہیں تو انھیں ساری کلاس کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ ان عورتوں کی سرگرمیاں صرف مرکز تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ سارے کیمپ کی زندگی پر ان کا اثر ہے۔

آج ایسی ۴۶ عورتیں ہیں جو نرسری اور ابتدائی اسکولوں اور فن خانہ داری کی کلاسوں کے چلانے کی ذمہ داری لئے ہوئے ہیں۔ ہماری اُستانیاں جس بستی میں رہتی ہیں وہ مرکز کی سرگرمیوں کے علاوہ اس بستی کی عورتوں کی بھی ذمہ داری لیتی ہیں اور اس طرح ان بہت سی عورتوں کو بھی جو کسی وجہ سے کلاس میں نہیں جا سکتی ہیں، نئی نئی باتیں سیکھنے کا موقع مل جاتا ہے ۱۹۵۲ء-۵۳ء میں جبکہ ۱۸۰ عورتیں ہی ان کلاسوں میں داخل تھیں ۲۵۰ عورتیں اور ایسی تھیں جن سے اُستانیاں کسی نہ کسی صورت میں اپنا تعلق قائم کئے ہوئے تھیں۔

اُستانیاں گھر میں عورتوں کے پاس جاتی ہیں۔ پاس پڑوس والوں کو گھر بار صاف رکھنے کی باتیں بتاتی ہیں،

اس نمائش نے عورتوں میں نئی نئی باتیں سیکھنے کا ایک شوق پیدا کر دیا۔ اور پہلے ہی دن ۶۰ عورتوں نے داخلہ لے لیا۔ دس مہینے کی سخت محنت کے بعد جبکہ انھوں نے بہت ساری باتیں سیکھ لیں، ان کے کاموں کی ایک نمائش لگائی گئی۔ اس بار مرد اپنی گھر والیوں کے ہاتھ کے کمال اور صفائی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور خود اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ ان کی عورتوں کے لئے کچھ اور طرح کی کلاسیں بھی چلائی جائیں۔

اب کام ایک ڈھرے پر لگ چلا تھا۔ اس نرسری اسکول کو کریچے (بال واڑی) کی شکل دے دی گئی۔ اس وقت سے مائیں ہیں کہ صبح اور سہ پہر کے وقت کمروں میں ٹھنسی رہتی ہیں۔

جلد ہی سینے ٹانکنے کے ان ابتدائی کورسوں میں، مشین کی سلائی، کپڑوں کو سنوار سدھار کر بنانا، چھوٹے بچوں کے کپڑوں کی تیاری اور بچوں کی نگہداشت کی تعلیم بھی شامل کر لی گئی۔ بعد میں گھر گرہستی کو ٹھیک ڈھنگ پر رکھنے کا فن جس میں کھانا تیار کرنا، برتن اور فرنیچر وغیرہ کو صفائی سے رکھنا، باغبانی وغیرہ کی تعلیم بھی اس سماجی مرکز میں دی جانے لگی۔ عملی کاموں کی یہ تعلیم جوں جوں بڑھتی گئی، اس بات کی ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی کہ انھیں تعلیمی مضامین بھی پڑھائے جائیں۔ اس پڑھائی کے لئے ان کی دلچسپیوں کو ملحوظ رکھ کر تعلیم دینے کا طریقہ اپنایا گیا۔

ان کی دلچسپیوں کے مضامین

اس کے لئے ضروری تھا کہ جو مضامین چُنے جائیں وہ آسان اور عام فہم اور ان کی روزمرّہ کی زندگی میں کام آنے والے ہوں اور وہ مضمون ایسے ہوں جن پر وہ اپنی کچھ نہ کچھ رائے بھی دے سکیں۔

گھر گرہستی میں کفایت شعاری کے لئے ایک موضوع "ہم کیسے سودا خریدیں" لیا گیا۔ یہ موضوع اس لئے بھی چنا گیا کہ کانگو کے رہنے والے بیچا بکری میں روپے پیسوں اور تول ناپ کے طریقوں سے یکسر ناواقف ہوتے تھے اور خرید و فروخت میں وہی اپنا پرانا طریقہ (حالانکہ اس کا رواج اب دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے) اختیار کرتے اور دوکاندار سے ایک مٹھی نمک مانگتے یا دو آنے کا تیل، چار آنے کی مچھلی یا ایک آٹھ برس کی لڑکی کے لئے کپڑا وغیرہ وغیرہ۔ پہلے ان کو دوکانوں پر لے جایا جاتا۔ سوشل ورکر انھیں بہت سی باتوں کے بارے میں بتاتی اور انھیں سمجھایا

سونپے جاتے ہیں۔

گھر گرہستی کے کاموں کی ٹریننگ

اس علاقے میں لڑکیوں کی شادی عموماً پندرھویں یا سولھویں سال ہوتی ہے۔ اس بستی میں بارہ سال کی عمر تک لڑکیوں کو جو ابتدائی تعلیم مل چکی ہوتی ہے اور قبائلی علاقوں سے جوان پڑھ کر لڑکیاں یہاں آتی ہیں، ان کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں لڑکیوں کو گھر گرہستی کے کاموں میں ٹریننگ دینے کے لئے ایک اسکول قائم کیا گیا۔

اس اسکول کا مقصد لڑکیوں کو —— ایک بیوی اور ایک ماں کی حیثیت سے —— ان کی آئندہ زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جس کے لئے انھیں اخلاقیات، بچوں کی نگہداشت، حفظانِ صحت، فن خانہ داری، کھانا پکانا اور باغبانی وغیرہ کی تعلیم اور عملی تربیت دی جاتی ہے۔

اس میں شریک ہونے والی لڑکیوں کو، جو تعداد میں لگ بھگ ۱۳۰ کے ہوتی ہیں —— ان کی پچھلی تعلیم اور استعداد کے اعتبار سے مختلف گروپ میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ ان کلاسوں میں تعلیم کا جو طریقہ اپنایا جاتا ہے وہ وہی ان کی دلچسپیوں پر مرکوز طریقہ ہوتا ہے۔ پہلے سال میں جن مضامین کے بارے میں ابتدائی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ دوسرے سال میں انھیں کا ذرا تفصیلی مطالعہ ہوتا ہے۔ اور تیسرا سال تمام تر عملی تربیت پر صرف کیا جاتا ہے۔

والدین سے ربط

جو لڑکیاں اِن ٹریننگ کورسوں میں آتی ہیں ان کے والدین سے ربط برابر قائم رکھا جاتا ہے۔ ان کی باقاعدہ میٹنگ ہوتی ہیں۔ تعلیم کے کاموں میں والدین کے تعاون سے —— حالانکہ اس کا حاصل کرنا کبھی کبھی بہت دشوار ہوتا ہے —— ہمارے بہت سے کام آسانی سے بن جاتے ہیں۔ اس سے ہمیں ان بہت سی باتوں کا پتہ لگتا ہے جو بصورت دیگر کبھی ہماری نوٹس میں نہ آتیں۔ اس سے ہمیں ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا ہے جن کے بیچ رہ کر ہمیں کام کرنا ہوتا ہے جس سے ہم ان کے بیچ زیادہ موثر اور کارآمد طریقے پر کام کر سکتے ہیں۔

ایک پرانی روایت، نئے سانچے میں

اس بستی کے نوجوان بچے عجیب مصیبت بنے ہوئے تھے۔ مقامی روایات انھیں اپنے والدین کے ساتھ

کلاس میں جو باتیں بتائی جاتی ہیں اور جو طریقے اپنائے جاتے ہیں وہ انھیں یہاں بھی استعمال کرتی ہیں، انھیں بتاتی ہیں کہ کس طرح سودا خریدنا چاہئے۔ یہ اُستانیاں اس بات پر بھی نظر رکھتی ہیں کہ بچے اسکول پابندی سے جاتے ہیں کہ نہیں۔ وہ ہم لوگوں کو پاس پڑوس کے لوگوں کے مادّی اور اخلاقی معیار سے باخبر کرتی ہیں اور ہمیں بتاتی ہیں کہ ان کے خیال کیا ہیں۔ ان کی شکایتیں کیا ہیں وہ کیا محسوس کر رہے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ مرکز کی کلاسوں کے لئے وہ عورتوں کا داخلہ کرتی ہیں، انھیں ان کے گھروں میں یا خود اپنے یہاں نئی نئی باتیں سکھاتی رہتی ہیں۔

ہمارے اسٹاف کے لوگ اُن کی ذاتی، سماجی اور تکنیکی ٹریننگ کا انتظام کرتے ہیں۔ ہفتے میں دو آدھے آدھے دن اس کام کے لئے وقف ہیں اور ہر چھ ہفتے پر وہ پورے چھ دن کے ایک کورس میں شامل ہوتی ہیں اس کے علاوہ سال میں دو یا تین ہفتے کا ایک پورا کورس بھی ہوتا ہے۔

بالغوں کے بیچ

جو عورتیں ابتدائی کورسوں کو پورا کر چکی ہوتی ہیں ان کے لئے آگے کی کلاسیں لگائی جاتی ہیں۔ یہ کورس ساری بستی کی زندگی کو سامنے رکھ کر چلائے جاتے ہیں جن کا مقصد ایسے موضوع پر بات چیت کرنا ہوتا ہے جو ساری بستی کی زندگی کے لئے مشترک ہوتے ہیں جیسے "ہمیں تہوار کیسے منانا چاہئے"، "چھٹیوں کے دن کیا کریں"، "بچوں کی تعلیم میں والدین کا تعاون" وغیرہ وغیرہ

بستی کے لوگوں کی سہولت کے لئے مرکز نے ایک چھوٹا سا اِسٹور بھی کھولا ہے جہاں سے لوگ سستا مال خرید سکتے ہیں۔ چھوٹی بچت کی اسکیم بھی پورے زور سے چل رہی ہے اور معالجاتی خدمات کے سلسلے میں بہت سے لوگوں سے بات چیت کی جا چکی ہے۔

لوگوں میں مختلف کاموں کی دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے مرکز مختلف تحریکیں بھی چلاتا رہتا ہے۔ کبھی باغبانی کے مقابلے تو کبھی گھر کو ٹھیک ڈھنگ سے رکھنے کے مقابلے۔ اُنھیں مقابلوں مقابلوں میں گھر کو ٹھیک رکھنے کی ایک تحریک چل پڑی۔ اس میں لوگوں سے فرصت کے وقت میں مختلف چیزیں جیسے الماریاں بنانے، چھوٹی موٹی میزیں اور بچوں کی گاڑی بنانے کو کہا جاتا ہے، عورتیں ان چیزوں کے لئے غلاف اور پردے تیار کرتی ہیں۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور اکثر خاندان والوں نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی مانگ کی۔ اس کے علاوہ لوگوں میں سماجی ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے مختلف جلسے کئے جاتے اور چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر ان کے ذمّے اپنے پاس پڑوس کے لئے مختلف کام

بالغوں کو پڑھانے کی کیا ضرورت ہے

سوال :-

ہندوستان میں بالغوں کی تعلیم کا کام بہت دنوں سے ہو رہا ہے مگر اس کا کوئی خاص نتیجہ ہم نہیں دیکھتے۔ اور اب جبکہ بچوں کو لازمی تعلیم دینے کا اصول تسلیم کیا جا چکا ہے میرے خیال میں بالغوں کی تعلیم کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی، اس صورت میں تو اور بھی جبکہ ہمارے سامنے کوئی ایسا منصوبہ نہیں ہے جو ہندوستان سے جہالت کو تھوڑے ہی دنوں میں جڑ سے مٹا دینے کے لئے بنایا گیا ہو۔

ہم تعلیم بالغان پر کیوں اتنی محنت اور اتنا روپیہ پیسہ صرف کر رہے ہیں۔ اس محنت اور روپے کو کیوں نہ ہم بچوں کی لازمی تعلیم پر صرف کریں اور اس دن کا انتظار کریں جبکہ آنے والی نسل ساری کی ساری پڑھی لکھی ہوگی اور آئندہ ہمارے ..... ملک میں کوئی بے پڑھا لکھا نہیں رہ جائے گا۔

آپ کا مخلص
نول کشور

جواب :-

آپ کی اس بات سے میں پوری طرح متفق ہوں کہ بچوں کی تعلیم پر ہمیں زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہئے اور کم سے کم یہ کوشش تو کرنی ہی چاہئے کہ ان میں سے کوئی ان پڑھ نہ رہ جائے۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اور انہیں کل کے لئے کسی قابل بنانا آج کے سماج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر اس ضرورت کے پورا کرنے میں آج کے بڑوں اور سیانوں کی کچھ ضرورتوں کو نظرانداز بھی کرنا پڑے تو اس میں ہچکنا نہیں چاہئے، اس لئے کہ یہ بڑا نقد سودا ہے، جس کا سود اصل سے کئی گنا زیادہ ملے گا۔

مگر بچہ اپنے آپ میں بالکل الگ نہیں ہوتا۔ وہ اس پورے سماج کا ایک حصہ ہے۔ وہ ماں باپ کا لختِ جگر

رہنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ گاؤں میں ان کے لئے علیحدہ جھونپڑی ہوا کرتی ہے۔ اس صنعتی اور قصباتی زندگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں اِدھر اُدھر آوارہ گھوما کرتے تھے۔ دور کے رشتہ داروں میں آیا جایا کرتے تھے اور زیادہ تر وہیں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے اوپر کسی قسم کی نگرانی نہیں رکھ سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں بستی کے لوگوں کی درخواست پر لڑکیوں کے لئے ایک گھر قائم کیا گیا اس کی نگرانی ایک سوشل ورکر اور ایک مقامی استانی کو سونپی گئی۔ لڑکیوں نے اس مرکز کو اپنا گھر بنا لیا ہے۔ یہاں وہ شادی سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے دن گذارتی ہیں۔ وہ چاہیں تو یہاں اپنا کھانا بھی پکا سکتی ہیں اور مختلف کلاسوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ رات میں ان کے رہنے سہنے کا بھی یہاں انتظام ہوتا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۵۶ء میں ایک اور ٹریننگ سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس ٹریننگ سنٹر کا مقصد کچھ چنی ہوئی مقامی عورتوں کو سماجی خدمت کے کاموں کے لئے تیار کرنا ہے۔ یہ سنٹر ہماری اس تحریک کے رہنما اور ہمارے ادارے کے نائب صدر کی یاد میں قائم کیا گیا ہے جن کا جوشِ عمل ہمیں اس دور دراز کے علاقے میں کام کرنے کے لئے کھینچ لایا ہے۔

آج وہی سماجی مرکز جو کچھ سال پہلے محض ایک تجربے کے لئے شروع کیا گیا تھا ساری بستی کی زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ اس بستی کی عورتوں نے اپنی ہمت اور بلند حوصلے سے ثابت کر دیا ہے کہ کس طرح اپنی ساری روایات کی حامل اور فن خانہ داری کے جدید طریقوں سے باخبر عورت کی حیثیت سے اپنے گھر کی زندگی کو خوشگوار بنا کر ساری بستی کی زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہیں۔

ہمارا کام تو دراصل ان لوگوں کے کاموں میں مدد پہونچانا ہے جو اپنی ترقی کے راستے خود ہموار کر رہے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور خواہشوں کو سمجھنا اور انھیں ڈھونڈ نکالنا ہے، مقامی لیڈروں کی ہمت افزائی کرنی ہے اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے ان باتوں کو خاموش دیکھتے رہنا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ترقی کے راستے ہموار کر رہے ہیں اور کون سے راستے ان کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہو سکتے ہیں۔

اس شمارے میں شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے: آپ مرکزی وزارت تعلیم کے تحت قائم نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔ ہندوستان میں سوشل ایجوکیشن کی تحریک کے رہنماؤں میں ہیں۔ ملینکے لیکس اور مارگریٹ سیریٹ: آپ دونوں مذکورہ سوشل سنٹر کی کارکن ہیں۔
شری محمد رفیق خاں: سوشل ایجوکیشن میں ریسرچ کے لئے جامعہ میں جو ریسرچ ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سنٹر قائم کیا گیا ہے آپ اس سنٹر میں سائیکالوجسٹ ہیں۔

سماج سیوا سے سماجی تعلیم تک

سماج سیوا کا نام شاید میں نے گاندھی جی کے نام کے ساتھ ساتھ سنا تھا اور بہت دنوں تک اسے انہیں کی شخصیت سے وابستہ بھی سمجھتا رہا۔ اس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ سماج سیوا ہر کوئی کر سکتا ہے اور اس کے لئے گاندھی جی کی پارٹی میں بھرتی ہونا اور سفید ٹوپی پہننا ضروری نہیں ہے۔ مگر نہ جانے کیوں اس لفظ کے معنی سمجھے بغیر اس لفظ سے مجھے ایک اُنس سا ہو چلا تھا۔ لفظ بڑا بھلا معلوم ہوتا تھا اور سوچتا تھا ایک دن میں بھی گاندھی جی کی پارٹی میں بھرتی ہو کر یہ کام کرنے لگوں۔

ایک بار ہمارے شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی، شہر کی نالیاں اُبلنے لگیں۔ ہر طرف کوڑا کرکٹ اور بدبو پھیلنے لگی۔ ایک دن گذرا، دو دن گذرے، چار اور پانچ دن بھی گذر گئے مگر ہڑتال ختم نہ ہوئی۔ ادھر غلاظت اور گندگیوں کے انبار لگ گئے۔ ایک دن محلّے والوں کی میٹنگ ہوئی اور کھدر ٹوپی والوں نے فیصلہ سنایا کہ ہمیں خود اپنی گلیوں کی صفائی کرنی چاہئے اور دوسرے دن انھیں لوگوں میں سے کچھ جھاڑو اور بانس کی چھڑیں لئے سڑکوں اور نالیوں کی صفائی کرتے دکھائی دیئے۔ تو یہ ہے سماج سیوا، اب میرے ذہن میں سماج سیوا کا ایک مبہم سا خاکہ بن چلا تھا۔

۱۹۴۲ء کے کسی مہینے کا ذکر ہے، میں حسب معمول صبح اسکول چلا گیا تھا۔ سُنا کہ شہر میں بھگدڑ ہو گئی ہے اور گولی چل رہی ہے۔ اسکول کے دروازوں میں تالے ڈال دیئے گئے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کیا ہو گیا ہے۔ مگر ہمیں کیا۔ کھیلنے کا موقع مل گیا اور لگے گیند کھیلنے۔ پھر کانگریس والوں کی لاری آئی اور باری باری سے لڑکوں کو ان کے محلوں میں جا کر چھوڑ آئی۔ راستے میں بالکل سناٹا تھا اور صرف ہماری لاری تھی جو سکوت کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار سڑک کو اتنا سنسان دیکھا تھا۔ بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ صرف پولیس اور فوج والے سنگینیں لئے گھوم رہے تھے۔ کہیں چھتوں پر فوج تھی تو دوکان کے برآمدوں پر پولیس۔ معلوم ہوا کانگریس اور سرکار میں لڑائی چھڑ گئی۔ وہی کانگریس گاندھی جی کی پارٹی، جو سماج سیوا کرتی ہے۔ تو کیا یہ بھی سماج سیوا ہے......؟ پتہ نہیں کیوں اس وقت میرے دل میں ایک جوش سا پیدا ہوا۔

ہے تو سارے خاندان اور ساری بستی کا بھی ایک جزء ہے۔ اُس کے چاروں طرف جو چیزیں ہیں وہ اُسے اپنے ساتھ لے چلنے پر مجبور کرتی ہیں وہ چھوٹا اور ناتواں ہوتا ہے، دوسروں کی دیکھا دیکھی کرتا ہے اور دوسروں کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہے۔ ہم اُسے اُس کے چاروں طرف کے ماحول سے کاٹ کر الگ نہیں کر سکتے اور نہ اُس کے اسکول کی چہار دیواریاں اتنی اونچی کر سکتے ہیں کہ باہر کی دنیا کے اثرات سے اسکول محفوظ رہ سکیں۔ بچے کے چاروں طرف جو سماج ہے، جن لوگوں کے بیچ وہ اُٹھتا بیٹھتا، اور رہتا سہتا ہے، اس کا اثر بچے کی عادات و اطوار، پڑھنے لکھنے میں اُس کے شوق، اُس کی سیرت اور چال چلن پر پڑتا ہے۔ اور ایک بچے کی صحیح تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس ماحول کو بھی تعلیم کی روشنی سے روشناس کرایا جائے

بالغوں کی تعلیم کی ضرورت کی یوں تو بہت سی وجہیں ہیں، مگر چھوٹے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا ہی اگر ہم اپنا مقصد بناتے ہیں تب بھی بالغوں کی تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے جو ضروری شرط ہے اُسے یہی پورا کر سکتی ہے۔

جہالت کو جڑ سے مٹا دینے کے منصوبے سے آپ کی مراد ایسے منصوبے سے ہے جس میں سارے ہندوستان سے جہالت کو ختم کرنے کی ایک مدت متعین کرلی گئی ہو اور اس مدت کے اندر سبھی عمر اور سب ہی طبقے کے لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے کے پیش نظر تعلیم کا ایک منظم پروگرام بنا لیا گیا ہو۔ اگر آپ کا مطلب ایسے منصوبے سے ہے تو بیشک ہمارے سامنے ایسا کوئی قطعی پروگرام نہیں ہے۔ اتنا ہی کیوں کسی ایک علاقے یا کسی ایک گاؤں سے جہالت کا اس طرح خاتمہ کر دینے کا پروگرام بھی شاید نہیں ہے۔

مگر ایسے کسی منصوبے کے نہ ہونے کی حالت میں بالغوں کی تعلیم کی ضرورت بجائے ختم ہونے کے اور بڑھ جاتی ہے۔ بچوں کی لازمی تعلیم کا اگر انتظام کیا گیا تو اُس کے تحت ۶ سے ۱۴ سال کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہی ہو سکے گا۔ جو بچے اس وقت ۱۵ سال یا اس سے اوپر کی عمر کے ہوں گے، وہ اس میں نہیں آئیں گے۔ اس صورت میں انہیں زندگی بھر پڑھنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ پھر بچوں کی لازمی تعلیم کے ذریعہ سارے ملک سے جہالت اور ناخواندگی کے خاتمے کے لئے ایک لمبی مدت درکار ہوگی۔ بالغوں کی تعلیم کے ذریعہ یہ کام جلدی ہو سکتا ہے۔ جو بچے ہیں ان کی تعلیم کا انتظام تو کیا ہی جانا چاہئے، جو بڑے ہیں اور کسی وجہ سے جنھیں پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے، ان کی پڑھائی کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے، نہیں تو یہ لوگ ساری عمر جاہل رہ جائیں گے۔ ضرورت دراصل تعلیم بالغان کے پروگراموں کو اور تیز کرنے کی ہے، نہ کہ اُسے بند کر دینے کی۔ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

دا بے ان کلاسوں میں جاتے دکھائی دیتے۔ پھر یہ رات کی کلاسیں کب اور کیوں بند ہو جاتیں مجھے اس کا علم نہ ہوتا۔

کچھ دنوں بعد کاٹن مل کی بستی میں اسطرح کی ایک کلاس چلتی دکھائی دی۔ میں نے سمجھا یہ بھی دو چار مہینے چل کر بند ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور بے موسم[1] کھلی ہوئی یہ کلاس کوئی ڈیڑھ سال تک چلتی رہی پھر یکایک یہ کلاس بند ہوگئی۔ معلوم ہوا جو ماسٹر جی شام کو آکر پڑھاتے تھے وہ ستیہ گرہ کرتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے ہیں۔

اُسی بستی میں تھوڑے دنوں بعد ایک نو تعمیر عمارت میں، جس میں کھیل کود اور تفریح کے سامان بھی موجود تھے ایک باقاعدہ کلاس مل مالک کی طرف سے کھول دی گئی۔ مزدور یہاں آکر پڑھتے ہیں۔ مگر یہاں صرف پڑھائی نہیں ہوتی، لوگ کھیلتے کودتے بھی ہیں، کبھی کبھی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ سال میں ایک آدھ ڈرامے بھی ہونے لگے ہیں، گانا بجانا تو گویا اس کلاس کے خاص پروگراموں میں ہے۔ اس کلاس میں صرف دستخط کرنا اور معمولی سا لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھایا جاتا ہے بلکہ حساب کتاب اور دوسرے مضامین کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ماسٹر کو باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔

—— * —— ❦ —— ✦ ——

سُنا ہے سیانے آدمیوں کو پڑھانے لکھانے کا کام اب گاؤں میں بھی شروع کیا گیا ہے۔ مگر اس پڑھائی میں اب سماج سیوا کو بھی ملا دیا گیا ہے اور اس کا نام سماج شکشا رکھا ہے۔ سماج سیوا اور بالغوں کی تعلیم کے اس ملے جُلے پروگرام میں لوگوں کو صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھایا جاتا بلکہ انھیں ایک اچھا جیون گذارنے کی شکشا بھی دی جاتی ہے کہ کسی طرح وہ لوگ مل جُل کر اپنی اور ساری بستی کی زندگی کو خوش حال اور صحت مند بنا سکتے ہیں۔

سماج سیوا اور بالغوں کی تعلیم کا یہ ملا جُلا پروگرام بھی اپنے آپ میں ایک مستقل فن ہے جس میں لوگوں کو باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ سماج سیوا میں جہاں ان افراد اور جماعت کی جو کسی وجہ سے اس ہمہ گیر سماجی زندگی سے بیزار ہو چلے ہوتے ہیں ان کی مدد کرنے پر زور دیا جاتا ہے، تو سماج شکشا میں اس بات کا احساس پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے کہ لوگ خود اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں، اپنی صلاحیتوں کو سمجھیں اور ایک خاندان ایک بستی اور ایک قوم کے رکن کی حیثیت سے ان کے اوپر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں انھیں پوری طرح سمجھیں اور انھیں پورا کریں۔

---

[1] یہ کلاس ان دنوں نہیں کھلی تھی، جبکہ جہالت کو مٹا دینے کی مہمیں چلتی تھیں اور نتیجے میں دو چار محلوں میں تھوڑے دنوں کے لئے شام کی کلاسیں کھل جاتی تھیں۔

پھر میونسپلٹی کا الیکشن آیا، اسمبلی کا الیکشن ہوا، ہندو مسلم فساد ہوئے، قحط پڑا، سیلاب آئے اور سماج سیوا والے مختلف شکلوں میں میرے سامنے آتے رہے۔ یہ شکل بنتی رہی بگڑتی رہی۔ بعد میں یہ گتھی دھیرے دھیرے سلجھی سماج سیوا، جو اب تک میرے نزدیک ایک لفظ تھا، اس کے دونوں حصے "سماج" اور "سیوا" کے معنی الگ الگ میرے ذہن میں بیٹھ گئے اور سماج سیوا کی ان مختلف شکلوں میں ایک ربط سا دکھائی دینے لگا۔ پھر گاندھی جی کی سماج سیوا اور تعمیری کاموں کی بات بھی سمجھ میں آنے لگی، اچھوت ادھار اور گاؤں سدھار کی ضرورت کو بھی سمجھنے لگا۔ یتیم خانوں، ودھوا آشرموں کی سیوائیں، رام کرشن مشن کے اسپتال اور ملاپ کمیٹیوں کے کام (جو ہندو مسلم فساد کے زمانے میں اتحاد کے لئے بنائی گئی تھیں) یہ سب کی سب سماج سیوا کا ہی ایک حصہ بن گئیں اور اس میدان میں زکوٰۃ خیرات، دان پونیہ، دھرم شالے اور اسکاؤٹنگ، اندھوں اور اپاہجوں کی مدد کرنے کے کام۔ غرض سماج سے بے زار ہونے والے افراد اور جماعت کی افسردگی اور محتاجی کو دور کرکے انھیں دوبارہ سماجی زندگی کی جدوجہد میں سرگرم کرنے والے سبھی کام اس کے احاطے میں آتے گئے۔ دھیرے دھیرے یہ بھی دریافت ہوگیا کہ سماج سیوا بجائے خود ایک مستقل فن ہے، جس پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ بعد میں ان کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ پھر ان لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جو اس فن میں باقاعدہ ٹریننگ پا چکے تھے۔

"جہالت کو ہندوستان سے مٹا دو" یہ نعرہ ایک گانے کی شکل میں کئی بار سن چکا تھا۔ اور ان مہموں میں شریک ہو چکا تھا جو سال میں ایک دن اسکولوں میں ان پڑھ لوگوں کو دستخط کرنا سکھانے کے لئے چلائی جاتی تھیں۔ اُس دن صبح پربھات پھیریاں نکلتیں، جلوس نکالے جاتے اور اس میں بیشتر لڑکے یہی "جہالت کو ہندوستان سے مٹادو" والا گانا گاتے چلتے۔ پوسٹر اور اسکول کے جھنڈے بھی ساتھ ہوتے۔ دن بھر یہ شغل رہتا۔ شام کو شہر کے سب سے بڑے میدان میں جلسہ ہوتا جس میں شہر کے تمام اسکولوں کے بچے جمع ہوتے۔ وہاں جہالت کی برائی اور پڑھنے لکھنے کے فوائد پر مختلف پروگرام ہوتے، گانے سنائے جاتے، نقلیں اور ڈرامے ہوتے اور پھر بعد میں تقریریں ہوتیں۔ لڑکوں کو بتایا جاتا کہ اس ملک سے جہالت کو مٹانے کی ذمہ داری ان کے اوپر بھی ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس کے لوگوں کو دستخط کرنا سکھائیں۔ معلوم نہیں دوسرے لڑکوں پر اس کا کیا اثر ہوتا تھا، مگر سچی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی کو دستخط کرنا نہیں سکھایا۔ ہاں یہ ضرور دیکھا کہ اس جھٹکے میں دو چار محلوں میں رات کے وقت کہیں گیس اور بجلی کی روشنی دکھائی دینے لگتی، کچھ سیانے آدمی جن میں بیشتر ان پڑھ نوجوان ہوتے بغل میں کتابیں

محکمہ تعلیم کو ہی سوشل ایجوکیشن کی منصوبہ بندی کرنی چاہیئے

مرکزی مشاورتی بورڈ کی تجویز

وزارت تعلیم کے سوشل ایجوکیشن کے مشاورتی بورڈ کا ایک جلسہ اسی فروری میں دہلی میں ہوا تھا۔ بورڈ نے سوشل ایجوکیشن کے کاموں کی تنظیم اور اس کے انتظامی ڈھچر کے مسائل پر غور کیا اور تجویز پیش کی کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کی منصوبہ بندی اور ان کے کاموں میں باہم تال میل پیدا کرنے کے کاموں کی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی محکمۂ تعلیمات کو لینی چاہیئے۔

مشاورتی بورڈ نے بالغوں کے مدرسے قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے اور ریاستی حکومتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کام کو جتنا جلد ممکن ہو کر ڈالیں۔ بورڈ نے جنتا کالجوں کے قیام اور شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی کوآرڈینیٹنگ کونسلوں کے قیام کی بھی تجویز کی کہ جہاں تک ممکن ہو یہ کام رضاکارانہ اداروں کے تعاون سے کیا جائے۔

مشاورتی بورڈ نے حکومت کے اس فیصلے کا بھی خیر مقدم کیا جو اس نے تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران ملک بھر میں لازمی ابتدائی تعلیم کا انتظام کر دینے کے سلسلے میں کیا ہے۔

مزدوروں کی تعلیم: ہند مزدور سبھا کا ردعمل

ہندوستان میں ٹریڈ یونینوں کی ایک قومی تنظیم ہند مزدور سبھا نے حکومت کے ذریعہ اپنائی جانے والی اس اسکیم پر سخت تنقیدی رویہ اختیار کیا ہے جس کے تحت حکومت نے ٹیچر ایڈمنسٹریشن انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور ٹیچر ایڈمنسٹریٹروں کی تقرری کا فیصلہ کیا ہے۔

ہند مزدور سبھا کی مجلس انتظامیہ نے اپنی ایک تجویز میں مزدوروں کی تعلیم پر فورڈ فاؤنڈیشن کی ایک ٹیم کی رپورٹ کی طرف بھی دھیان دلایا ہے جس میں کہ ٹیم نے مزدوروں کی تعلیم کے لئے ایک آزاد بورڈ کے تشکیل کی تجویز کی ہے۔ اس بورڈ میں اکثریت نمائندگی ٹریڈ یونینوں کی ہوگی، یہ بورڈ مزدوروں کی تعلیم کی منصوبہ بندی اور اس کے انتظام کا کام

جاہل نہ رہیں گے کبھی جاہل نہ رہیں گے

یہ نظم بالغوں کے مدرسہ میں پڑھائی شروع ہونے سے پہلے روزانہ جماعتی گیت کے طور پر گائی جا سکتی ہے۔ تعلیم کی طرف دلچسپی بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

جینا ہے جو دنیا میں تو عزت سے جییں گے   جاہل نہ رہیں گے کبھی جاہل نہ رہیں گے
سمجھیں گے ہر اک بات کو لکھیں گے پڑھیں گے   ہم لوگ ترقی کی بلندی پہ چڑھیں گے
ان ہاتھوں سے خود اپنی تقدیر گڑھیں گے   آندھی ہو کہ طوفان ہم آگے ہی بڑھیں گے
جینا ہے جو دنیا میں تو عزت سے جییں گے   جاہل نہ رہیں گے کبھی جاہل نہ رہیں گے

وہ دور ہمیں علم کی دیوی نے پکارا   چمکا وہ بلندی پہ اُمیدوں کا ستارا
ہر سانس نے چہرہ پہ نیا رنگ نکھارا   مضبوط ارادوں کا نیا جوش اُبھارا
جینا ہے جو دنیا میں تو عزت سے جییں گے   جاہل نہ رہیں گے کبھی جاہل نہ رہیں گے

اَن پڑھ کسی حالت میں بھی راحت نہیں پاتا   وہ چین سے دنیا میں کماتا ہے نہ کھاتا
اَن پڑھ کو ہر اک طرح زمانہ ہے ستاتا   پڑھنا نہیں آتا ہے تو جینا نہیں آتا
جینا ہے جو دُنیا میں تو عزت سے جییں گے   جاہل نہ رہیں گے کبھی جاہل نہ رہیں گے

وہ دن گئے جب ہم کو غریبی پہ تھا سنتوش   بھوکے ہوں کہ بیمار ہوں، ہم رہتے تھے خاموش
دنیا ہمیں ہنستی تھی مگر ہم کو نہ تھا ہوش   اب جاگے ہیں، اُٹھ بیٹھے ہیں، آیا ہے ہمیں جوش
جینا ہے جو دنیا میں تو عزت سے جییں گے   جاہل نہ رہیں گے کبھی جاہل نہ رہیں گے

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کے لئے ۲ ارب ۲۰ کروڑ روپے کا انتظام ہے اور اس ترمیم شدہ پروگرام کو بھی اسی رقم سے کام چلانا ہے۔ اس سے کچھ نہ کچھ کام ادھورا رہ جائے گا اور یہ سارا کام جو اپریل ۱۹۶۱ء تک پورا ہو جانا چاہیے تھا اب اکتوبر ۱۹۶۳ء تک پورا ہو سکے گا۔

نئی تجاویز بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی سفارشوں کے پیش نظر سامنے آئی ہیں۔ اس کمیٹی نے چھ چھ سال کے دو حصوں میں بانٹ کر ۱۵ لاکھ اور ۵ لاکھ روپے کے ساتھ ترقیاتی پروگراموں کو چلانے کی سفارش کی تھی اور اس پروگرام کو سارے ملک میں پھیلانے کی مدت ۱۹۶۱ء سے بڑھا کر ۱۹۶۴ء کر دینے کی سفارش کی تھی۔

اچھے گاؤں کو انعام

کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت نے کھیتی اور ڈیولپ منٹ کے دوسرے کاموں میں اوّل آنے والے گاؤں کو انعام دینے کی اسکیم شروع کی ہے۔

اس سے قبل وزارت نے گرام سیوک کو انعام دینے کا اعلان کیا تھا جس کے تحت سب سے اچھے گرام سیوک کو ایک موٹر سائیکل انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ موٹر سائیکل وزیر اعظم نے کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت کو تحفے میں دی تھی۔ یہ دوسرا انعام بھی اُسی منصوبے کا ایک حصّہ ہے۔

موٹر سائیکل انعام میں پانے والے گرام سیوک کے علاقے میں جو گاؤں سب سے اچھا سمجھا جائے گا، اُسے پانچ ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔ اسی طرح جن گرام سیوکوں کو ریاست اور ضلع کی طرف سے انعامات ملیں گے، ان کے علاقے کے سب سے اچھے گاؤں کو ایک ہزار اور ڈھائی سو روپے بالترتیب انعام دیئے جائیں گے۔

انعام کی رقم پنچائت یا گاؤں سبھا کے حوالے گاؤں کی پیداوار بڑھانے کے لئے کی جائے گی۔ یہ انعامات ۵۹-۱۹۵۸ء کے کاموں کی بنیاد پر دیئے جائیں گے۔

دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے آزمائشی منصوبے

کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے وزیر شری سریندر کمار دے نے ۲۶ فروری کو راجیہ سبھا میں بتایا کہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ بلاکوں میں ۲۶ منصوبے اس بات کا پتہ لگانے کے لئے شروع کئے گئے ہیں کہ گاؤں میں دیہی صنعتوں کی ترقی کا امکان کہاں تک ہے جس سے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کام مل سکے۔ دیہی صنعتیں

کرے گا۔ ہند مزدور سبھا نے اپنی تجویز میں یہ بھی کہا ہے کہ یہ رپورٹ انڈین لیبر کانفرنس کے پندرھویں جلسے میں منظور کر لی گئی تھی، مگر حکومت نے اب تک اس طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔

ہند مزدور سبھا نے اپنی یونینیوں سے حکومت کی اس اسکیم کے تحت قائم ہونے والے ٹیچرس ٹریننگ اینڈ منسٹریشن انسٹی ٹیوٹ میں اپنا کوئی نمائندہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا ایک نیا خاکہ

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام میں کچھ تبدیلیاں لائی گئی ہیں اور یہ ترمیم شدہ پروگرام اسی اپریل سے چالو کیا جائے گا۔

پروگرام میں ترمیم کے لئے تین خاص تجویزیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ضلع کے نیچے کی سطح پر سرکاری اداروں سے اختیارات لے کر عوامی اداروں کو سونپ دیئے جائیں۔ دوسرے نیشنل ایکس ٹینشن سروسز (N.E.S-Block) اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک (C.D Block) کے پروگراموں کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور تیسری یہ کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی یہ ترمیم شدہ شکل تیسرے پنج سالہ منصوبے تک چالو رکھی جائے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی مرکزی کمیٹی نے ان تجاویز کو موٹے طور پر مان لیا ہے۔ یہ میٹنگ وزیر اعظم کے زیر صدارت پچھلی جنوری میں ہوئی تھی۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت نے ریاستی حکومتوں کی رائے جاننے کے لئے یہ تجاویز ریاستی حکومتوں کے پاس بھیج دی ہیں۔

یہ بات محسوس کی جاتی رہی ہے کہ گاؤں میں جو ترقیاتی کام شروع کئے جائیں وہ بھرپور ہوں اور ایک لمبی مدت تک جاری رہیں۔ اس طرح جنتا کے رہن سہن کو اونچا اٹھانے کی مانگ پوری کی جا سکے گی اور ان کی زندگی کو خوشحال بنایا جا سکے گا۔ گاؤں کی اس طرح تیزی سے ترقی کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ ترقیاتی پروگراموں کو لاگو کرنے کے لئے اس کی مدت کو پانچ پانچ سال کے دو حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ آج کل یہ پروگرام تین حصوں میں بنٹ کر ہو رہا ہے۔

(۱) نیشنل ایکس ٹینشن سروسز بلاک کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک اور بھرپور ترقی کے بعد کا مرحلہ۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے کاموں کے لئے زاید روپوں کا انتظام ہو جانے پر نیشنل ایکس ٹینشن سروسز بلاک اپنے آپ کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک میں بدل جائیں گے۔ پروگرام کے پہلے حصے کے لئے بارہ لاکھ اور دوسرے پانچ سال کے لئے ۵ لاکھ روپے فراہم کئے گئے ہیں جبکہ موجودہ پروگرام کے تحت اس کے لئے ۵ لاکھ اور ۸ لاکھ روپے کا انتظام ہے۔

بیشتر گاؤں والے خود ہی چلاتے ہیں، جس سے ان کے نفع نقصان کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

آل انڈیا گرام پرچارک کیمپ

بھارت سیوک سماج کے اطلاعاتی شعبے نے دہلی کے قریب گرُدکل اندرپرستھ میں آل انڈیا گرام پرچارک کیمپ لگایا ہے۔ اس کیمپ میں سارے ملک سے آئے ہوئے ۱۵۰ نمایندے حصّہ لے رہے ہیں۔

کیمپ کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر خزانہ شری مرارجی ڈیسائی نے کیا۔ یہ کیمپ ایک مہینے تک رہے گا اور یہاں سے نکلنے کے بعد یہ گرام پرچارک گاؤوں میں پنج سالہ منصوبے کے پرچار کا کام کریں گے۔

کسانوں کا چوتھا نیشنل کنونشن

دہلی میں کسانوں کے چوتھے نیشنل کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے ۱۵ مارچ کو پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا کہ اس ملک میں چھوٹی چھوٹی کوآپریٹو سوسائیٹیاں زیادہ کام کی ہوسکتی ہیں کوآپریٹو سوسائیٹیاں ایک گاؤں یا دو گاؤوں سے زیادہ بڑے علاقے کے لئے نہیں ہونی چاہئیں۔ اپنی تقریر میں پنڈت نہرو نے کہا کہ ہر گاؤں میں ایک اسکول، ایک پنچایت اور ایک کوآپریٹو سوسائٹی ہونی چاہیے۔

حکومت ہند کے وزیر زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیش مکھ نے جو اس کسان فورم کے صدر ہیں اپنی تقریر میں اس طرح کے کنونشن کے بلانے کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔

آپ کے سوال (صفحہ ۲۴ سے آگے)

بالغوں کی تعلیم بھی اسی طرح کا نقد سودا ہے، جس طرح بچوں کی تعلیم، بلکہ اُسے اس سے بھی زیادہ نقد کہا جا سکتا ہے۔ بچوں کی تعلیم جہاں ہماری آیندہ کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، بالغوں کی تعلیم وہاں آئندہ کی ضرورتوں کو تو پورا ہی کرتی، آج کے تقاضوں کو بھی سنتی ہے اور آج کی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

تعلیم و ترقّی



The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

rinter and Publisher : BARKAT ALI Firaq : Printed at RamaKrishna Printing Press Delhi.

ادارہ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم وترقی (دہلی)

جلد (۹) اپریل ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر (۴)

بانی: شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ جامعہ نگر (نئی دہلی)

ٹیلی فون نمبر ۴۲۲۴۶۱

قیمت سالانہ: چار روپے

اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آجائے شام

کسی حکومت کی خوش قسمتی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اگر اُس نے انجان پن کی وجہ سے کسی غلط پالیسی پر عمل شروع کردیا ہے تو جس وقت اُسے اس غلطی کا احساس ہو جائے، وہ اس کا علی الاعلان اعتراف کرے اور اُس کے ازالے کی کوشش کرے۔ ہماری قومی حکومت خوشی کی بات ہے، اس معیار پر بہت حد تک پوری اُترتی ہے جس کا ایک ثبوت پنڈت نہرو کی وہ تقریر ہے جو موصوف نے انڈین کوآپریٹیو کانگریس کے تیسرے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ۱۲/اپریل کو وگیان بھون میں کی تھی۔

پنڈت جی نے صاف الفاظ میں کہا کہ "حکومت نے دیہی قرضوں کی تحقیقاتی کمیٹی (رورل کریڈٹ سروے کمیٹی) کی چند سفارشات کو تسلیم کرکے بڑی سخت غلطی کی ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے مگر اس کی ذمے داری میرے اوپر بھی اتنی ہی ہے جتنی دوسروں کے اوپر غلطی میری اپنی تھی۔ اس کمیٹی نے اپنے اس فیصلے کے ذریعے امداد باہمی کی تحریک کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ کمیٹی کا یہ رجحانِ خیال کہ چونکہ عوام میں کافی صلاحیت موجود نہیں ہے اور ان کے اوپر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انھیں سرکاری سرمائے اور سرکاری اہلکاروں کی مدد سے ہانکنا چاہیئے سراسر غلط ہے۔ ہمیں کوشش کرکے اس صورتِ حال سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے اور اپنے سامنے یہ مقصد رکھنا چاہیئے کہ امداد باہمی کی انجمنیں بغیر کسی سرکاری مداخلت کے آزادی کے ساتھ اپنی راہ چل سکیں۔"

جس رورل کریڈٹ سروے کمیٹی کا یہاں ذکر ہے، وہ ۱۹۵۱ء میں گورنر ریزرو بینک کے کہنے پر بنی تھی اور اس نے پورے ملک کا دورہ کرکے بڑی محنت سے اپنی رپورٹ مرتب کی تھی۔ اس کمیٹی کے ممبروں نے منجملہ اور سفارشات کے ایک سفارش یہ کی تھی ـــــ اور جسے اس کے نتائج و عواقب کی روشنی میں سب سے اہم کہا جا سکتا ہے ـــــ کہ امداد باہمی کی تحریک کی نئی تنظیم کی بنیاد (ان پہلوؤں میں جہاں اس سے حکومت کا تعلق ہو) سرکاری

ترتیب مضامین

دور پر جو ملک کی آزادی کے بعد شروع ہوا ہے۔ امداد باہمی کے باب میں دنیا کے تجربات بتاتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی یہ تحریک کامیاب ہوتی ہے وہاں اس کا بچپن اور شباب، دونوں سرکاری مداخلت یہاں تک کہ سرکاری پشت پناہی سے بھی پاک رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال اسکینڈی نیویا کے ملکوں خصوصاً ڈنمارک میں ملتی ہے، جہاں ایک دور ایسا بھی آیا ہے کہ حکومت نے اور اس کے اشارے پر سرمایہ داروں نے اس کے راستے میں روڑے اٹکائے ہیں مگر اس نے اپنی آزادی کو فروخت نہیں کیا بلکہ اس اختلاف و عداوت سے طاقت حاصل کی۔ ان تجربات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امداد باہمی کی تحریک کو آزادی اور عدم مداخلت کی آب و ہوا راس آتی ہے اور جب کبھی اس آب و ہوا میں خلل واقع ہوتا ہے، اس کی باڑھ رُک جاتی ہے۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ اب حکومت کو اس غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور اُمید بندھتی ہے کہ اس کے ازالے کی جلد از جلد کوشش کی جائے گی اور امداد باہمی کی ہندوستانی تحریک کو بھی وہی صحت بخش ماحول نصیب ہوگا جو اس کی نشو و نما کے لئے لازمی اور قدرتی ہے۔

حصے داری ہونا چاہئے۔"

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں امداد باہمی کی ہندوستانی تحریک کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ بات کہ امداد باہمی کی ناکامی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب اس کا سرکاری انتظام کے ماتحت چلایا جانا رہا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہندوستانی تحریک تعاون میں اُسے کوئی وزن حاصل ہے۔"

اگر سوئے ظن نہ سمجھا جائے تو ہم یہ بات بھروسے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی تحریک تعاون کی ناکامی کے باب میں یہ بات کہنے والے اور اس کی بنیاد پر حکومت کو یہ مشورہ دینے والے کہ اس تحریک میں سرکار کو ایک حصے دار کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے، صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے سوچنے کا طریقہ وہی پرانا گوراشاہی ہے اور جن کے دل و دماغ صحیح جمہوری روح سے قطعاً ناآشنا ہیں، اور جن کی ہٹ دھرمی نے پنڈت نہرو کو اظہارِ افسوس اور اعتراف گناہ کے لئے مجبور کیا۔

ذرا غور کیجئے، ایک دیہات میں ان پڑھ اور ناتجربہ کار دیہاتیوں کی کوآپریٹیو سوسائٹی بنتی ہے اور حکومت اپنے مقامی افسروں کے توسط سے اس کے اندر حصے دار کی حیثیت سے شریک ہوتی ہے۔ گاؤں والوں کی ذہنی کیفیت کا حال معلوم ہی ہے کہ وہ پڑھا لکھا تو درکنار، اپنے سے ذرا مختلف لباس پہننے والے کو بھی اپنا مائی باپ اور دھرما ادتار سمجھ لیتے ہیں، اور اپنے آپ کو کلیتہً اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر حکومت کی حصے داری کا مطلب لازمی طور پر یہ بھی ہے کہ وہ بہت بڑی رقم لگائے گی جو یقینی طور پر تمام حصے داروں کی جملہ رقم کا کئی گنا ہوگی، اور قطع نظر اس کے کہ مقامی حصے داروں کے حصے کی رقمیں دیر میں یا بہ اقساط وصول ہوں، حکومت اپنے حصے کی رقم کا بیشتر حصہ پیشگی دے دے گی۔ اس صورت میں کیا یہ کہنا غلطی ہوگی کہ سوسائٹی کا دستور، قواعد وضوابط اور کاروبار کا نہج سب کا سب وہی ہوگا جو سرکاری حصے کی نگرانی کرنے والے رکن منتظمہ کی خواہش ہوگی، کوآپریٹیو سوسائٹی بجائے عوامی ادارہ بننے کے کاروبار کا ایک سرکاری ادارہ بن جائے گی اور مقامی حصے دار "جی حضور" اور "جو حکم سرکار" کا نعرہ لگانے والے غلاموں کی جماعت میں منتقل ہو جائیں گے اس لئے کہ اس کاروبار میں نہ تجربہ اور تعلیم کی حیثیت سے ان کا کوئی وقار ہوگا نہ سرمایہ لگانے والے کی حیثیت سے کوئی مرتبہ و مقام۔

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں وہ برطانوی حکومت کے زیر سایہ چلتی تھی، وہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ جہاں انگریزوں نے ملک کو اور دنیا کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے دوسرے بہت سے دکھاوے رچا رکھے تھے، وہاں ایک شعبدہ امداد باہمی کی تحریک کا بھی تھا۔ مگر تعجب ہوتا ہے اس کی تاریخ کے اس

میں خود غرضی اور فرقہ پرستی منافرت اور آپس کی عداوت کے جو گناہ ہم نے کئے ان کی سزا ہماری پوری قوم کو ملی اور وہ خوفناک تباہیاں اور بربادیاں جو ہمارے ہاتھوں ہوئیں اُن سے ہمارے بہت سے تعلیمی اور سماجی ادارے بھی نہ بچے۔ جو ہمارے قومی اتحاد اور قومی تعلیم کی یادگار تھے۔ جامعہ کے چند شعبے بھی جو اہل شہر کی خدمت کے لئے قرول باغ میں قائم تھے وہ بھی تباہ و برباد ہو گئے۔

لیکن خدا کا شکر ہے جامعہ کی تربیت اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صحبت کا اثر ہے کہ اس تباہی اور بربادی سے کارکنان جامعہ کبھی نہ شکستہ دل ہوئے اور نہ مایوس۔ چنانچہ اس تباہی کے فوراً بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ شہر ہی میں از سر نو کام شروع کیا جائے مگر اس وقت حالات کچھ ناسازگار اور قابو سے باہر تھے۔ شروع میں ..... ہمارے سامنے تعلیمی کام کے لئے کوئی راہ نہ نکل سکی اور اگست سے لے کر وسط دسمبر تک کارکنان جامعہ کا پورا وقت ہمایوں کے مقبرے اور پرانے قلعے کے پناہ گزینوں کی خدمت اور امداد میں صرف ہوا۔

وسط دسمبر میں ہمیں یہ عمارت ملی جس میں اس وقت آپ تشریف فرما ہیں اور ہمارے چند ساتھیوں نے شمس الرحمٰن صاحب کی سرکردگی میں یہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈالی لیکن ایک اُجڑی ہوئی بستی میں اس شکستہ و ویران عمارت کو آباد کرنا جبکہ اس عمارت کے آس پاس کہیں بم کے دھماکے ہوتے تھے تو کہیں خنجر زنی کے حادثات ایک مشکل کام تھا۔ لیکن اس علاقے کے سرگرم کارکن مس وِتا مس جوشی اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے یہ مشکل آسان ہوئی اور پھر مسز شفیع قدوائی اور انٹرنیشنل اسٹوڈنٹس سروس کے نوجوان بھائیوں اور بہنوں کی مدد سے اس عمارت میں بہ یک وقت متعدد قسم کے تعلیمی اور سوشل سروس کے کام شروع کئے گئے لیکن آب و ہوا ابھی تک مسموم تھی اس لئے کوئی مستقل کام شروع کرنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ گاندھی جی کی شہادت کا حادثہ ہوا۔ ....

اس حادثہ کے بعد اس مرکز میں مستقل تعلیمی کام شروع کئے گئے۔ ایک ابتدائی مدرسہ قائم ہو گیا نوجوانوں کا کلب اور سرپرستوں کی انجمن قائم ہو گئی۔

باڑہ ہندو راؤ کے مرکز کے قیام کے بعد ایک مرکز پل بنگش پر قائم ہوا۔ ایک قصاب پورہ میں۔ ایک احاطہ کالے صاحب میں اور ایک بھوجلہ پہاڑی پر۔ اس طرح جامعہ کے پانچ مرکز شہر کے مختلف حصوں میں قائم ہو گئے ہیں۔ ان مرکزوں کے پیش نظر اس وقت یہ چار کام ہیں۔

۱۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام بالخصوص ان کے غیر نصابی تعلیم کا۔ اسکول کے چند گھنٹوں کی تعلیم کے بعد بچوں کا زیادہ وقت بستی کے گلی کوچوں میں گذرتا ہے اور جو سبق وہ مدرسہ میں سیکھتے ہیں وہ بسا اوقات بستی اور گھر کے

ادارۂ تعلیم و ترقی کا نیا دور
اور
تعلیمِ بالغان کے چند بنیادی اصول

ذیل میں ہم شفیق صاحب کی دو تحریریں نقل کر رہے ہیں، ان میں سے ایک ان کی وہ تقریر ہے جو مرحوم نے ادارے میں آصف علی صاحب مرحوم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب آصف علی صاحب امریکہ میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے اپنا کام پورا کر کے واپس تشریف لائے تھے اور شہر دہلی میں ادارۂ تعلیم و ترقی اپنی شکستہ عمارت کی تعمیرِ نو میں مصروف تھا۔ اس تحریر سے اندازہ ہوگا کہ ملک کی تقسیم کے بعد کی طوفان خیز فضا میں ادارے نے کیا خدمات انجام دیں اور اپنے کام کی نئی تنظیم کس طرح کی۔

دوسری تحریر تعلیمِ بالغان سے متعلق مرحوم کے چند خیالات ہیں۔ یہی وہ خیالات و نظریات تھے جن کے اوپر ادارۂ تعلیم و ترقی کی نئی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

ایڈیٹر

۱- استقبالیہ تقریر

محترم صدر،

میں اپنی طرف سے اور اپنے سب ساتھیوں کی طرف سے آپ کی بخیریت وطن واپسی اور آپ کی اُن خدمات پر جو آزاد ہندوستان کے پہلے سفیر کی حیثیت سے آپ نے امریکہ میں انجام دیں، آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

آپ کی غیر موجودگی کے زمانے میں آپ کی دہلی پر جو مصیبتیں اور آفتیں آئیں اُن سے آپ ناواقف نہیں ہیں، اس لئے اس موقعے پر میں اُن اندوہناک حادثات اور واقعات کی یاد تازہ کرنا نہیں چاہتا۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی کے زمانے

سے اچھے اور زیادہ سے زیادہ لٹریچر کی اشاعت کا انتظام کارکنانِ تعلیم بالغان کا ضروری اور اہم کام ہے۔

۳۔ لیکن خود سیکھنے اور پڑھنے کے لئے بھی کچھ استعداد اور قابلیت اور کم از کم خواندگی کی قابلیت کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کسی اُستاد کے سامنے حاضری دینے سے کلیتہً مفر نہیں البتہ بالغوں کے خاص حالات کا لحاظ رکھ کر درس کے حلقے کی حاضری کی مدت کم سے کم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور بالغوں کی تعلیم کے لئے بہت چھوٹے چھوٹے نصاب مقرر کرنا چاہئے۔

۴۔ اس میں شک نہیں کہ علوم و فنون کے تمام خزانے کتابوں کے ذریعہ ہی محفوظ رکھے گئے ہیں اس لئے بالغوں کی تعلیم میں بھی کتابوں کی اہمیت ظاہر ہے۔ لیکن زبانی تعلیم، مشاہدے کے ذریعہ تعلیم اور دوسرے طریقوں سے تعلیم کی جو سہولتیں سائنس کی ترقی کی وجہ سے ہمیں اس وقت حاصل ہیں اُن سے استفادہ نہ کرنا اور اُن سے تعلیمی فوائد حاصل نہ کرنا بڑی کوتاہی ہے۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں ۹۰ فیصدی آبادی ناخواندہ ہے، ہماری یہ ناخواندہ آبادی اگر پڑھنا لکھنا سیکھے بغیر علم و فن کے سبق سیکھ سکتے ہیں اور تہذیب و تمدن کی ترقیوں سے واقف ہو سکتے ہیں تو انہیں اس سے محروم نہ کرنا چاہئے۔

۵۔ لیکن تعلیم کتابی ہو یا زبانی ریڈیو کے ذریعہ ہو یا سینما کے ذریعہ۔ یہ سب طریقے اس وقت مقبول اور کامیاب ہوں گے۔ جب طلباء کی دلچسپی اور ان کی ضرورتوں کو معلوم کر کے تعلیم کو اس کے ساتھ مربوط کیا جائے بالغوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز ان کی مذہبی، معاشی، سیاسی اور سماجی زندگی میں تلاش کرنا چاہئے اور اس سے پورا پورا تعلیمی فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

۶۔ بالغوں کی تعلیم و تفریح کے اوقات چونکہ ایک ہی ہوتے ہیں اس لئے اُن کی تعلیم کا مقابلہ اور تصادم ہمیشہ اُن کے آرام اور تفریح سے رہتا ہے اس لئے بالغوں کی تعلیم کے پروگرام میں ان کی تفریح اور دلبستگی کا بھی انتظام کرنا چاہئے۔

ماحول میں یا د نہیں رکھ سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ فارغ اوقات میں ان کو مشغول رکھنے کے دلچسپ طریقے اختیار کئے جائیں۔ اگر ہمارے اور بستی کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ بستی کے سب بچوں کے لئے اچھے مدرسے بنائیں اور اگر میونسپل کمیٹی بھی اُن کی نصابی تعلیم کا بندوبست نہیں کرتی تو کم از کم اُن کی غیر نصابی تعلیم کا بندوبست خود بستی کے لوگوں کو کرنا چاہیے۔..............

۲۔ مرکز کا دوسرا کام یہ ہے کہ ان بچوں کے ذریعہ اُن کے سرپرستوں کی انجمنیں بنائی جائیں۔ نوجوانوں کے کلب قائم کئے جائیں اور بالغوں کی تعلیم اور تفریح کا انتظام خود بالغوں کی مدد سے کیا جائے۔ ان کے لئے کتابوں، اخبارات اور رسائل کا انتظام کیا جائے۔ درسی حلقے اور تعلیمی جلسے منعقد کئے جائیں اور تفریح کا انتظام کیا جائے۔........

۳۔ تیسرا کام سوشل سروس ہے اور

۴۔ چوتھا کام اتحاد و ترقی کا ہے

موجودہ حالات میں آخری دونوں کاموں کی بنیاد پر ہم تعلیم و ترقی کی عمارت بنانا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ شہر دہلی کے ہر علاقے میں تعلیمی مرکز قائم ہوں اور ان مرکزوں کے ذریعہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کے اس خلا کو پُر کیا جائے جس کی وجہ سے اس وقت ہماری بہت سی تعلیمی کوششیں خواہ نجی ہوں یا سرکاری بالکل رائیگاں جاتی ہیں۔

ہم نے اپنا تعلیمی کام بڑی بے سروسامانی اور پریشانی کی حالت میں شروع کیا ہے لیکن اعتماد کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اب ہمارے سامنے کام کا میدان نکلا ہے اور وہ ساری رکاوٹیں جو ہماری راہ میں قدم قدم پر حائل تھیں وہ یا تو اب ختم ہو گئی ہیں یا ختم ہو جائیں گی۔

۲ تعلیمِ بالغان کے اصول

۱۔ بالغوں کی زندگی میں حصولِ تعلیم ایک ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا اصلی کام روزی کمانا ہے اس لئے ضمنی کام کی پابندیوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

۲۔ بالغوں کی تعلیم میں اسی لئے خود پڑھنے اور خود سیکھنے کے اصول کو زیادہ سے زیادہ برتنے کی ضرورت ہے اور بالغوں کی تعلیم کے لئے کتب خانوں اور ریڈنگ روم کی تنظیم اور بالغوں کے مناسب حال اچھے

مختلف کاموں پر لگے ہوئے لوگوں کو یونیورسٹی کی تعلیم دینے کے لئے سنہ ۱۹۴۹ء میں اس طرح کے پہلے کورس شروع کئے گئے۔

ایک سال کے ان کورسوں میں نوجوان کسانوں اور مزدوروں کو تجربہ کار اساتذہ اور ماہرین کی زیر نگرانی خاص طرح کے ہوسٹلوں میں رہنا ہوتا ہے جہاں رہ کر وہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کی تیاری کرتے ہیں یہاں انھیں صرف ان مضامین کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی جس میں آگے چل کر وہ اعلیٰ تعلیم پانے کا ارادہ رکھتے ہوں بلکہ انھیں سبھی مضامین کی عام تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ان کورسوں سے اب تک پانچ سال کے اندر کوئی ۶ ہزار طالب علم فارغ ہو چکے ہیں۔ ان طالب علموں میں سے بیشتر نے یہاں سے نکلنے کے بعد یونیورسٹیوں کے ٹیکنیکل اداروں میں یا خود یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا ہے، کچھ نے فائن آرٹ یا ایسی ہی کوئی دوسری کلاس میں داخلہ لیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ ان کورسوں میں شریک ہونے والے طلباء کو خاص طرح کے وظیفے ملتے ہیں اور ان کے کنبے والوں کو خاص طرح کے الاؤنس دیئے جاتے ہیں۔ ان کورسوں سے فارغ ہونے کے بعد یہ تعلیم یافتہ کارکن اپنے اپنے کاموں پر واپس چلے جاتے ہیں، جہاں انھیں ان کی حسب حیثیت کام دیا جاتا ہے۔

ثانوی تعلیم

کام پر لگے ہوئے لوگوں کے لئے ثانوی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ ان کورسوں میں وہی تعلیم دی جاتی ہے جو سابقہ گرامر اسکولوں اور آج کے گیارہ سالہ سیکنڈری اسکولوں میں دی جاتی ہے اور ان کے نصاب میں بھی گیارہ سالہ سیکنڈری اسکولوں کے آخری تین سال کی پڑھائی شامل ہوتی ہے ان سے فارغ ہونے پر یہ طالب علم یونیورسٹیوں یا اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

شام کی کلاسوں میں لیکچر اور پڑھائی پر ہفتے میں چودہ گھنٹے دیئے جاتے ہیں جو عموماً سہ پہر یا شام کی تین نشستوں میں پورے ہو جاتے ہیں متعلقہ مضامین پر صلاح و مشورے کے لئے ہفتے میں دو چار گھنٹے الگ سے ہوتے ہیں

ایکسٹرنل کورس

دیہی علاقوں کے بالغ طالب علموں کے لئے ایکسٹرنل کورس چلائے جاتے ہیں۔ اس میں طالب علم ہفتہ میں ایک

تعارف

زیکوسلاویکیا میں بالغوں کی تعلیم کے پروگرام

زیکوسلاویکیا کے نظام تعلیم میں کام پر لگے ہوئے لوگوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنے پر اب خاص توجہ دی جانے لگی ہے۔ یہ انتظام اس ڈھنگ پر کیا جاتا ہے کہ پڑھائی سے ان کے کاموں میں کسی قسم کا ہرج نہ واقع ہو۔ ان پروگراموں کے چلانے میں متعلقہ سرکاری ادارے اور عوام دونوں نے کافی گرمجوشی دکھائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے ان تعلیمی پروگراموں میں بالغ طالب علموں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوا ہے اور اس کے تحت چلنے والے تینوں طرح کے کورسوں سے ——— عام تعلیمی کورس، پیشہ ورانہ تربیت کے کورس اور یونیورسٹی کی کلاسوں ——— محنت کش عوام نے کافی فائدہ اُٹھایا ہے۔ شام کی کلاسوں میں بھی نئے نئے مضامین کا برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس طرح ۹ مئی ۱۹۴۸ء سے نافذ ہونے والے دستور کے مطابق ہر شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا جو حق ملا ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے کے مواقع قریب قریب اب ہر شہری کو مل چکے ہیں۔

جنگ کے بعد

جنگ کے بعد کے پہلے سال میں جو بالغ طالب علم ان کورسوں میں شامل ہوئے ان میں بیشتر ایسے تھے جو مالی مشکلات کے پیش نظر اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے یا وہ تھے جنھیں دوران جنگ میں یونیورسٹیوں کے بند ہو جانے سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دینی پڑی تھی۔ مگر اتنے ہی سے بہت دنوں کام نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ بڑی بڑی صنعتوں کے قیام اور تیزی سے بڑھتی ہوئی اقتصادی ترقی نے مختلف فنون کے ماہرین کی ضرورت کو اور بھی بڑھا دیا۔ اس نے بھی لوگوں میں اپنی علمی اور فنی صلاحیتوں کو بڑھانے کا شوق پیدا کیا ہے۔ عوامی جمہوریہ کے نئے سماجی اور اقتصادی نظام سے محنت کش عوام کو اپنی روزی روٹی اور بال بچوں کی پرورش اور ان کی ضرورتوں کی طرف سے کچھ اطمینان نصیب ہوا ہے۔ اس سے بھی اُنھیں اپنی قوتوں کو اپنی کارکردگی اور علمی صلاحیتوں پر صرف کرنے اور اس دنیا کو ذرا اطمینان اور وسیع نظروں سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

میں کھول دیا گیا ہے۔ البتہ تین سالہ کورس ابھی انجینیرنگ اور برقیات کے اسکولوں کیمیکل انڈسٹریز تعمیرات اور معدنیات اور اکاؤنٹنگ کے اسکولوں ہی میں خاص طور پر چلائے جاتے ہیں۔ انجینیرنگ اور دوسری شاخوں میں ایکسٹرنل کورس چلائے جاتے ہیں۔ ۱۵ طالب علموں کے ہوجانے پر اس طرح کی ایک کلاس کھول دی جاتی ہے۔

وہ لوگ جو گیارہ سالہ سیکنڈری اسکولوں کی تعلیم پا چکے ہوتے ہیں اور اپنے پیشوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے مختلف ٹریننگ اسکول قائم کئے جاتے ہیں جہاں وہ دو سال تک شام کی کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان اسکولوں کا مقصد لوگوں کو ان کے پیشے کی اعلیٰ تربیت دینا ہوتا ہے۔ عام تعلیم میں یہاں مادری زبان اور ادب کے مطالعے پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

اساتذہ کے کاموں میں مدد دینے کے لئے ریگ میں میتھڈلاجیکل سینٹر قائم ہے۔ یہ سینٹر مختلف امدادی سامانوں اور نصابوں کی تیاری کا کام کرتا ہے۔

یونیورسٹیوں میں

پیداوار کے کاموں میں تعلیم یافتہ اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کی بڑھتی ہوئی مانگ نے یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم بالغان کے پروگراموں کو رائج کرنے کی ضرورت کو بڑھا دیا ہے۔ یہ کورس طبیات اور صنعتی حرفوں کے علاوہ تعلیم کے ہر میدان میں جاری کر دیئے گئے ہیں۔ ان سب میں ایکسٹرنل کورس سب سے زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ ٹیکنیکل اداروں اور کالجوں میں سب سے زیادہ داخلے ہوتے ہیں، جہاں طالب علم انجینیرنگ، برقیات اور تعمیرات وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جنگلاتی اور زراعتی اسکولوں، معدنیات اور ریلوے انجینیرنگ کے اسکولوں میں بھی اب اس طرح کے ایکسٹرنل کورس جاری کئے گئے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں یہ کورس قانون، بین الاقوامی معاملات، فلسفہ، صحافت، لائبریری سائنس اور روسی زبان وادب کے مطالعے کے لئے تعلیم کے ہر مدارج پر چلائے گئے ہیں۔ جو لوگ اسکول یا کالجوں ہی میں ملازم ہوتے ہیں ان کے لئے شام کی کلاسوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ شام کی کلاسوں کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے، بالخصوص اس لئے کہ اس میں طالب علموں کو اساتذہ سے زیادہ قریب رہنے کا موقع ملتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم

یونیورسٹیوں میں ایسے لوگوں کے لئے ایکسٹرنل کورسوں کا انتظام کیا جاتا ہے جنھیں متعلقہ مضمون پر.

دن اساتذہ کے پاس جمع ہوتے ہیں اور سات گھنٹے اپنی اپنی تیاری سے متعلق صلاح ومشورہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم شہروں یا قصبوں میں اسی مقصد کے لئے قائم مرکزوں میں ملتے ہیں۔ طالب علموں کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں مزید مرکز قائم کئے جاتے ہیں۔ اس صلاح ومشورہ کا مقصد طالب علموں کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے تاکہ مختلف مضامین کی پڑھائی میں جو طریقے ان کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو سکتے ہیں وہ ان سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ ایکسٹرنل کورسوں کی مدت عموماً ایک سال ہوتی ہے جو طالب علموں کی استعداد کے مطابق کم وبیش بھی ہوسکتی ہے۔

ان کورسوں کے لئے نصاب کی تیاری سنٹرل میتھڈالاجیکل اینڈ کنسلٹیشن سینٹر کرتا ہے۔ یہ سینٹر اس کے علاوہ بالغوں کو پڑھانے والے اساتذہ کی رہنمائی کے لئے ضروری کتابوں اور دوسرے امدادی سامانوں کی تیاری کا کام بھی کرتا ہے سیکنڈری اسکولوں میں بھی ایکسٹرنل کورس چلائے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکے اسکول کے شروع سال میں آتے ہیں اور بعد میں اپنے طور پر گھروں پر پڑھائی جاری رکھتے ہیں سال میں دوبار انھیں امتحان دینے کے لئے اسکولوں میں آنا ہوتا ہے۔

ان کورسوں کے علاوہ ایسے لوگوں کے لئے ثانوی تعلیم کا ایک سالہ کورس بھی چلایا جاتا ہے جنھیں مطلوبہ مضامین کی پہلے سے تھوڑی بہت واقفیت ہوتی ہے۔

شام کی کلاسوں اور ایکسٹرنل کورسوں کا انتظام صرف اسکول ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے کچھ الگ سے ادارے بھی قائم ہیں جہاں بالغوں کو پڑھانے کے لئے پورے وقت کے اساتذہ اور پرنسپل وغیرہ مقرر ہوتے ہیں۔ مختلف کاموں پر لگے ہوئے لوگ یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے ان کورسوں میں داخلہ لیتے ہیں۔

پیشہ ورانہ تربیت

پیشہ ورانہ اسکولوں اور ٹریننگ کالجوں میں مزدور مختلف پیشوں کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ یہ ٹریننگ کورس بھی کم وبیش انھیں لائنوں پر ہوتے ہیں جن لائنوں پر عام تعلیم کے مندرجہ بالا کورس چلائے جاتے ہیں۔ ٹریننگ کالجوں کے ایکسٹرنل کورسوں میں . . . — زیادہ تر اسکول کے اساتذہ ہی شامل ہوتے ہیں اور اپنے فن میں مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

بالغ طالب علموں میں سے زیادہ تر شام کی ان کلاسوں میں داخلہ لیتے ہیں جنھیں مختلف پیشوں کی تعلیم دینے والے ادارے چلاتے ہیں۔ ان اداروں میں ایک تو دو سال کا کورس ہوتا ہے جس میں طالب علموں کو ان کے پسند کے کسی خاص کام کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ دوسرے تین سالہ کورس ہوتے ہیں جن میں دو سالہ کورس پورا کرلینے کے بعد طالب علموں کو یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے۔ دو سالہ کورس قریب قریب ہر برانچ

سہولتیں

اُن ملازمین اور مزدوروں کے لئے جو کسی بھی طرح کے مطالعے میں لگے ہوتے ہیں کام کے اوقات میں رعایت برتی جاتی ہے۔ گیارہ سالہ سیکنڈری اسکولوں اور پیشہ ورانہ تربیتی کورسوں میں شامل ہونے والے ملازمین کو مطالعے کے لئے ہفتے میں چار گھنٹے کی چھوٹ دی جاتی ہے۔ ایکسٹرنل کورسوں میں شامل ہونے والوں کو اس کے علاوہ امتحان سے پہلے ہونے والے سیمینار میں شریک ہونے کے لئے سال میں ایک ہفتے کی رخصت بلا تنخواہ لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ان سیمیناروں میں تجربہ کار اساتذہ کی رہنمائی میں انھیں مختلف مضامین کے مطالعے اور دوران سال میں کام کے بیچ اُٹھنے والے مسائل اور اس طرح کی بہت سی دوسری باتوں پر غور کرنے اور سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے امتحانات کی تیاری کے لئے انھیں پندرہ دن پہلے بلاتنخواہ رخصت مل جاتی ہے۔ اس بیچ انھیں مل مالکوں اور کارخانہ داروں کی طرف سے کچھ خاص طرح کے الاؤنس دیئے جاتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ اپنی صلاحیت کو بڑھانے میں صرف مزدوروں کا اپنا ہی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے اس ساری بستی اور خاص طور سے اس صنعتی ادارے کو بھی فائدہ پہونچتا ہے جہاں وہ کام کرتے ہوتے ہیں۔ لہٰذا متعلقہ سرکاری محکموں، صنعتی اداروں اور ٹریڈ یونینوں کا فرض ہے کہ وہ مزدوروں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کریں۔ ان کو چاہئے کہ وہ کام کرنے والوں کو شفٹ میں تقسیم کردیں جس سے انھیں مطالعے کے لئے باقاعدہ وقت ملتا رہے۔ مزدوروں کے اسکولوں میں خاص خاص موضوع پر تقریریں کرائیں اور مزدوروں کے کتب خانوں میں ہر طرح کی ضروری کتابیں فراہم کریں۔

ایڈلٹ ایجوکیشن پروگرام کے کسی کورس میں داخلہ لینے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ طالب علم کے پاس پہلے سے ابتدائی تعلیم کی سند موجود ہو۔ گیارہ سالہ سیکنڈری اسکول یا پیشہ ورانہ تربیتی کورسوں میں حصہ لینے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ طالب علموں کو متعلقہ مضامین کی پہلے سے واقفیت ہو۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ثانوی کی سند پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ایڈلٹ ایجوکیشن کے پروگراموں میں لوگوں کی دلچسپیاں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ صرف ۱۹۷۶ء میں کوئی ۵۲ ہزار طلبا ان پروگراموں کے تحت تعلیم پا رہے تھے۔ کچھ تھوڑی سی خامیوں کے باوجود ان تعلیمی پروگراموں کا معیار خاصا اچھا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جو سب سے بڑی مشکل ہر طرح کی پڑھائی میں سامنے

گہری معلومات ہوتی ہے، جس سے کہ وہ اسکولوں میں باقاعدہ نہ پڑھنے اور اساتذہ سے دور رہنے کی حالت میں بھی متعلقہ مضامین پر آسانی سے کام کر سکیں۔ ٹیکنیکل اداروں اور کالجوں میں خاص طرح کے ایکسٹرنل کورس شروع کئے گئے ہیں جہاں سے طالب علم کسی خاص لائن میں یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کورس نئی نئی کھوج میں لگے ہوئے لوگوں اور ان دوسرے ملازمین کے لئے بہت کام کے ہیں جو اپنی اُپج سے کام کے اندر سدھار لانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ انھیں الگ الگ اساتذہ کی رہنمائی میں مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اخیر میں انھیں امتحان دینے ہوتے ہیں جس میں پاس ہونے پر انھیں انجینئرنگ کی کسی خاص لائن میں سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اسکول اور کالجوں میں ایسے بھی کورس چلائے جاتے ہیں جہاں طالب علموں کو پوری طرح یونیورسٹی کی تعلیم تو نہیں دی جاتی البتہ انھیں وہاں اپنی استعداد بڑھانے کا موقع ضرور ملتا ہے

یونیورسٹیوں میں چلائے جانے والے ایکسٹرنل کورسوں کی مدت عام طور پر پورے وقت کی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں سے ایک سال زائد رکھی جاتی ہے۔ ان کا نصاب وغیرہ بھی قریب قریب وہی ہوتا ہے جو پورے وقت کے طالب علموں کے لئے ہوتا ہے۔ امتحان کے لئے بھی یکساں شرائط ہیں

کچھ یونیورسٹی اور کالجوں میں ان ایکسٹرنل کورسوں کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے الگ سے شعبے قائم کئے گئے ہیں جو ضلعے یا قصبے کے مشاورتی سینٹروں اور دوسرے اداروں کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتے ہیں، پڑھانے والے بیشتر یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور لیکچرار ہوتے ہیں۔

تھوڑی مدتوں کے کورس

ایڈلٹ ایجوکیشن کے مندرجہ بالا پروگراموں کے علاوہ جو مختلف اسکولوں، پیشہ ورانہ تربیت گاہوں اور یونیورسٹیوں میں چلتے ہیں، بالغوں کی تعلیم کے تھوڑی مدتوں کے کورس بھی چلائے جاتے ہیں۔ ان کورسوں میں مختلف کاموں کے انجینیروں اور مستریوں کو ان کے کاموں کے بارے میں نئی نئی دریافت اور نئے نئے طریقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ کچھ کورسوں میں خاص مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم کوری کتابی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ اس میں انھیں ان کے فن اور پیشے سے متعلق عملی واقفیت بھی فراہم کی جاتی ہے۔ چھوٹی مدت کے ان کورسوں میں شریک ہونے کے لئے اُنھیں کاموں سے چھٹی مل جاتی ہے۔ یہ کورس زیادہ تر اسی مقصد کے لئے قائم کچھ خاص طرح کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں جہاں طالب علموں کو کورس کے دوران چوبیس گھنٹے رہنا ہوتا ہے۔

بال برادری علی گڈھ

انسان میں بعض خوبیاں، ہوسکتا ہے، وہبی ہوتی ہوں اور مشق و اکتساب سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ ہوتا ہو، مثلاً ایک وصف شاعری ہے، جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں، مگر زندگی میں اپنے مقام کو پہچاننا اور اس سے زیادہ اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے بے جھجک جدوجہد کرنا یقیناً وہبی چیز نہیں ہے۔ یہ خوبی تربیت اور محض تربیت کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سماج میں جس شخص کا جو مقام ہے، وہ اُسے ملنا چاہئے اور اگر نہیں ملتا تو سمجھنا چاہئے کہ اس سماج کی تنظیم میں کچھ کھوٹ ہے۔ اگر یہ خیال بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ ذمے داری بہرحال فرد کے اوپر عاید ہوتی ہے کہ وہ سماج کو ثابت کرکے دکھلائے کہ وہ فلاں مقام و مرتبے کا مستحق ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں وہ لوگ جنھوں نے اب سے تیس چالیس سال پہلے اپنی تعلیم شروع کی، ان میں ایسے لوگوں کی غالباً اکثریت ہے جو اپنے مقام و مرتبے کو ثابت کرکے دکھانے کی خوبی سے محروم ہیں اور آزادی ملنے کے بعد کے ترقی پذیر سماج میں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے ہیں حالانکہ ان کے اندر جوہر قابل کی کمی نہیں ہوگی۔

ان لوگوں کی یہ کیفیت کیوں ہے؛ ہم نے پہلے کہا ہے کہ اپنے مقام کو پہچاننا اور اسے حاصل کرنے کے لئے بے جھجک جدوجہد کرنا وہبی چیز نہیں ہے، یہ خوبی تربیت اور محض تربیت کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ یہی بچپن کے زمانے کی وہ تربیت ہے جو اب سے تیس چالیس سال پہلے اپنی تعلیم شروع کرنے والے بدنصیبوں کو حاصل نہیں ہوئی۔ تعلیم اُس زمانے میں بعض کتابوں کے رٹنے اور غلامانہ اطاعت و فرماں برداری کا نام تھا۔ طالب علم کو اظہارِ نفس کا نہ موقع تھا اور نہ غالباً اجازت۔ اچھے طالب علم کا معیار یہ ہوتا تھا کہ کون کم سے کم شور مچاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اطاعت شعار ہے، یہاں تک کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" ایک قدر بن گئی تھی۔

اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں آج کے وہ بچے جنھیں دورانِ تعلیم میں سوچنے سمجھنے، اپنی بات بے کم و کاست کہنے، کھیلنے کودنے اور شور مچانے یہاں تک کہ اپنے اُستاد کو اس کی غلط بات پر ادب و احترام کے ساتھ ٹوکنے

رہی ہے وہ ہے تعلیم کے تقریری یا دوسرے طریقوں کو تجربے کی روشنی میں جانچنا اور ان میں ضروری ترمیم کرتے رہنا اور کوئی بھی شخص اس بات کا اندازہ بڑی آسانی سے کر سکتا ہے کہ وزارت تعلیم و تہذیب اس وقت کتنی توجہ اور محنت سے اس بات کا حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"The article has been supplied by the education Clearing house. Unesco, as a part of its programme in the exchange of technical information education"



آتا ہے بلکہ انھیں رائج اور نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ "بال برادری" علی گڈھ کی تنظیم اور اس کے کام کا پورا ڈھیر بھی اصول پر مرتب ہوا ہے اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قیصر صاحب نے نئے ماحول سے مطابقت کرنے کے نام سے پنے ادارے کا صرف نام بدلنے پر اکتفا کی ہے چنانچہ علی گڈھ کی "بال برادری" جامعہ ملیہ کی "بچوں کی برادری" کا دوسرا نام ہے۔

ذیل میں ہم ایک نقشہ دے رہے ہیں جس سے بال برادری کی تنظیم کا پورا خاکہ ذہن میں آجائے گا۔

بال برادری

ڈاکٹر ستیش چندر پراکٹر، سرپرست

ڈائرکٹر: حسین احمد قیصر

سنٹرل کمیٹی

(کلبوں کے نمائندوں کی جماعت)

ہر کلب سے دو نمائندے آتے ہیں

سنٹرل کمیٹی کے کام

۱۔ بچوں کی مشترک سرگرمیوں کی تنظیم		۲۔ بچوں کے کلبوں کی رہنمائی اور امداد

۳۔ سنٹرل کمیٹی کا کام چلانے اور کلبوں کی امداد کے لئے سرمایہ فراہم کرنا		۴۔ بچوں کا (مطبوعہ) اخبار شائع کرنا

بچوں کے مختلف خود مختار کلب

(ان کلبوں کی تعداد اب پندرہ بیس کے لگ بھگ ہے)

بچوں کے کلبوں کے کام اور طریقۂ تنظیم

۱۔ ہر کلب کی ایک ورکنگ کمیٹی ہوتی ہے جسے بچے خود منتخب کرتے ہیں۔

۲۔ یونیورسٹی کا ایک طالب علم کلب کا نگراں ہوتا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے دوسرے طلبا، اور بستی کے دوسرے ہمدرد نگراں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

۳۔ کلب کی سرگرمیاں

۱۔ لائبریری اور ریڈنگ روم ۲۔ بچوں کا بینک ۳۔ بچوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیواری اخبار۔

۴۔ مختلف مقاصد کے لئے جلسے ۵۔ ورزشی اور میدانی کھیل ۶۔ فلم شو اور پکنک وغیرہ

کی نہ صرف آزادی ہوتی ہے بلکہ ان باتوں کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے یہی نہیں بلکہ انھیں مدرسے چہار دیواری کے اندر قید کردینے کے بجائے مدرسے سے باہر پوری آزادی کے ساتھ اپنی دنیا کی تنظیم آپ کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور مدرسے اور گھر دونوں اس کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مدرسے سے باہر کی تربیت کا تصور جسے تعلیمی اصطلاح میں بچوں کی غیر نصابی تربیت کی تنظیم کہا جاتا ہے، ماننے کو ممکن ہے، بہت پہلے ہندوستان میں مان لیا گیا ہو، اور کہیں کہیں اس پر عمل بھی ہوتا ہو، مگر منظم اور مرتب شکل میں اس کے اوپر تجربہ غالباً جامعہ ملیہ کے ادارۂ تعلیم وترقی کے ماتحت "بچوں کی برادری" کی شکل میں شروع ہوا تھا اور چند ہی دنوں کی کوشش سے دلی کے عوام وخواص حتیٰ کہ حکومت کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا، چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ بچوں کی فلاح وبہبود سے متعلق سرکاری طور پر جو تنظیمیں اور تحریکیں اب چلائی جارہی ہیں، ان کی بسم اللہ جامعہ ملیہ میں ہوئی تو ہمارا یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا۔
یہ کام اب اتنا پھیل گیا ہے کہ تقریباً ہر شہر میں اور گاؤں میں بھی جہاں سوشل ایجوکیشن یا ڈیولپمنٹ کا کوئی محکمہ کام کررہا ہے۔ چھ سات سے لے کر تیرہ چودہ سال کے بچوں کی غیر نصابی سرگرمیاں منظم کرنے والی ایک جماعت قائم ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قدم

گذشتہ تقریباً ایک سال سے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے بھی اس طرف توجہ کی ہے، مگر اس ادارے کے سامنے "ایک پنتھ دو کاج" کا اصول ہے۔ اس کے سامنے بنیادی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے ایسے موقعے فراہم کئے جائیں کہ وہ اپنے فاضل اوقات کو صحت مند اور تعمیری کاموں میں صرف کرسکیں۔ اس منصوبے کی بسم اللہ اس نے جامعہ ملیہ کی "بچوں کی برادری" کے نمونے پر شہر علی گڈھ کے لئے ایک "بال برادری" قائم کرکے کی ہے اور حوصلہ یہ ہے کہ آگے چل کر سوشل ایجوکیشن کے کمیونٹی سنٹر اور گاؤں میں ڈیولپمنٹ کا کام کرنے کے لئے ڈیولپمنٹ بلاک قائم کئے جائیں تاکہ یونیورسٹی کے زیادہ سے زیادہ طلباء کے لئے کام فراہم ہوسکے۔
خوشی کی بات ہے کہ یونیورسٹی نے اپنے منصوبے کو چلانے کے لئے جامعہ ملیہ کے ایک پرانے اور تجربہ کار کارکن سید حسین احمد قیصر کی خدمات عارضیتاً حاصل کی ہیں۔ اس موقعے پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ جامعہ ملیہ میں جب ۱۹۴۷ء میں "بچوں کی برادری" کی باضابطہ تنظیم شروع کی گئی تھی تو اس کو چلانے کے لئے قیصر صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا تھا جو ادارۂ تعلیم وترقی کے ماتحت ۱۹۴۷ء سے پہلے سے یہ کام ابتدائی تحریک کے طور پر کرتے آئے تھے اور بہت حد تک کامیاب ہوئے تھے۔

بال برادری کی تنظیم

انسان جب ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتا ہے تو وہ اپنے شعائر وروایات کو بھی اپنے ساتھ نہ صرف لے

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے علاقوں میں حفظانِ صحت کا پروگرام

سماج کی خوشحالی اور ترقی میں صحت مند زندگی کو ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ ۲ راکتوبر ۱۹۵۲ء کو مہاتما گاندھی کی یوم پیدائش کے موقع پر ملک میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا کام شروع ہوا تو اس میں زراعت، افزائش فسل، آبپاشی، تعلیم، آمد و رفت کے ذرائع، گھریلو صنعتوں، کوآپریٹو تحریک کی ترقی کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کا پروگرام بھی شامل کرلیا گیا۔

ڈیولپمنٹ پروگراموں کی ابتداء اور توسیع

شروع شروع میں ملک کے مختلف حصوں کے ۵۵ علاقوں میں کمیونٹی پراجیکٹ کا کام شروع کیا گیا۔ ایک پراجیکٹ میں ۳۰۰ گاؤں پر پھیلا ہوا کوئی دو لاکھ کی آبادی کا علاقہ رکھا گیا۔ ہر علاقے کو سو سو گاؤں کے تین بلاکوں میں تقسیم کیا گیا جن کی آبادی لگ بھگ ۶۶ ہزار کے تھی۔

پہلے ہی سال میں عوام نے اس پروگرام میں خاصی دلچسپی دکھائی اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے مقصد سے نسبتاً کم خرچ اور کم عملے سے ایک نئی اسکیم کا جال نیشنل ایکس ٹنشن سروسز کے نام سے سارے ملک میں پھیلا دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک اور نیشنل ایکس ٹنشن بلاک کے پروگراموں میں فرق محض وسائل کا ہے۔ نیشنل ایکس ٹنشن سروسز کے علاقوں میں زراعتی پروگراموں کی ترقی پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور حفظانِ صحت اور دوسرے پروگراموں پر اتنا دھیان نہیں دیا جاسکتا ہے جبکہ کیمونٹی ڈیولپمنٹ کے علاقوں میں زراعت کے علاوہ اور دوسرے پروگراموں جیسے صحت، تعلیم، آمد و رفت کے ذرائع کی بھرپور ترقی پر بھی دھیان جاتا ہے۔

مارچ ۱۹۶۱ء کے آخر[1] تک ہندوستان کے سبھی گاؤں کو نیشنل ایکس ٹنشن سروسز کے علاقوں کے تحت لے لیا

---

[1] نئے ترمیم شدہ پروگراموں کے مطابق اب یہ پروگرام ۱۹۶۳ء تک پورا کیا جاسکے گا۔

اس بال برادری کو کام کرتے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں، مگر اس کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریت کے موقعے پر اس ادارے نے یونیورسٹی میں بچوں کا ایک میلا ترتیب دیا تھا جو علی گڈھ کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ چنانچہ اس کا شہر اور یونیورسٹی کے حلقوں میں بڑا چرچا ہوا۔ بچوں کے کلب جن کی تعداد ابتدا میں بہت کم تھی بہت تیزی سے منظم ہو رہے ہیں اور سنٹرل کمیٹی کے دفتر میں روزانہ نئے کلبوں کی درخواستیں الحاق کے لئے آتی رہتی ہیں۔ سنٹرل کمیٹی بچوں کے کلبوں کی خبریں شائع کرنے کے لئے ہاتھ سے لکھ کر ایک "بچوں کا اخبار" نکالا کرتی تھی، مگر ۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء سے اب یہ اخبار ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپ کر شائع ہونے لگا ہے اور اس کی مدت پندرہ روزہ ہے۔

اس اخبار کے سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ یونیورسٹی کو اس کے لئے الگ سے ایک عملہ مقرر کرنا چاہئے اور اسے ہفت روزہ کر دینا چاہئے۔ ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ سنٹرل کمیٹی کی توجہ پوری کی پوری اسی اخبار کے لئے وقف ہو کر رہ جائے گی اور وہ بچوں کے کلبوں کی رہنمائی کا کام حسب منشا نہ کر سکے گی۔

پچھلے دنوں علی گڈھ میں یو۔پی کے گورنر شری گری تشریف لے گئے تھے۔ اپنے دورے کے دوران موصوف نے بال برادری کے ایک کلب کو بھی دیکھا تھا اور معلوم ہوا ہے کہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

یونیورسٹی کا یہ قدم غرض بہت مبارک ہے اور امید ہوتی ہے کہ اس کے اہتمام میں یہ چھوٹی سی ابتدا بہت بڑی اور دوسری یونیورسٹیوں کے لئے قابل تقلید چیز بن جائے گی۔ انگلینڈ اور یورپ کی یونیورسٹیوں نے اپنے ایکسٹرا میورل ڈپارٹمنٹس کے ذریعے یونیورسٹی کی چہار دیواری سے باہر کی دنیا کی تعلیم کے لئے بڑے قابل قدر کام انجام دیتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ جو اپنی روایات و اقدار کے لحاظ سے آکسفورڈ اور کیمبرج کی شاگرد ہے، ان شہرہ آفاق یونیورسٹیوں کی اس باب میں بھی دل کھول کر تقلید کرے اور اپنے چراغ علم سے اپنی ہی دنیا کو نہیں بلکہ اپنے آس پاس کی دنیا کو بھی روشن کر دے۔

اخراجات

پہلے پنج سالہ منصوبے کے تحت کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے لئے بیس کروڑ اور دوسرے منصوبے کے تحت ۲۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ان ۲۰۰ کروڑ روپوں میں سے ۲۰ کروڑ روپیہ ڈیولپمنٹ کے علاقوں میں حفظانِ صحت کے پروگراموں پر خرچ کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ نیشنل ایکس ٹنشن سروسز کے ان علاقوں میں جو کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک میں بدل دیئے جائیں گے، اس طرح کے ابتدائی صحتی مراکز قائم کرنے کے لئے ریاستی حکومتوں نے ۲۳ کروڑ روپیہ خرچ کرنا منظور کیا ہے۔

ایکس ٹنشن کے کاموں پر جتنی رقم خرچ ہوتی ہے، بھرپور ترقی کے کاموں پر اس کا دوگنا صرفہ آتا ہے اور ہر کام پر آنے والے خرچ کا ۱۰ فیصدی حصہ حفظانِ صحت کے کاموں پر صرف کیا جاتا ہے۔

جائے گا اور ان میں سے ۴۰ فیصدی علاقوں کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کی شکل دے دی جائے گی۔

اس وقت ملک میں ۱۲۰۰ نیشنل ایکسٹنشن سروسز کے بلاک قائم ہیں جو لگ بھگ ۱۵ کروڑ کی آبادی کے ۲,۷۰,۷۵۵ گاؤں پر پھیلے ہوئے ہیں۔

ابتدائی صحتی مرکز

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام میں حفظان صحت کے کاموں کی بنیاد ابتدائی صحتی مرکز ہیں۔ یہ مرکز امراض کی روک تھام اور علاج دونوں ہی کام کرتے ہیں۔ دراصل گاؤں میں حفظانِ صحت کے جو بھی کام ہو رہے ہیں وہ یہی مرکز انجام دے رہے ہیں اور ہندوستان کے گاؤں میں لوگوں کی صحت مند زندگی کا انحصار بہت کچھ انھیں مرکزوں پر ہے

ہر مرکز میں ایک شفاخانہ ہوتا ہے، شفاخانے میں کم سے کم ایک وقت میں چھ مریضوں کے رکھنے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زچہ اور بچہ کے صحتی مرکز بھی قائم ہوئے ہیں۔ سینٹر میں معمولی چیر پھاڑ کا انتظام بھی ہوتا ہے اور ایک چھوٹی سی لیبارٹری بھی ہوتی ہے۔

ہر مرکز میں تین شاخیں ہوتی ہیں۔ ان شاخوں میں زچہ اور بچہ کی صحت کی دیکھ بھال کا کام ہوتا ہے۔ مرکز کے ملازموں کے لئے آمد و رفت کا بھی معقول انتظام کیا جاتا ہے

صحتی مرکز کا کام

صحتی مرکز کا خاص کام ہے (۱) ڈاکٹری امداد (۲) زچہ اور بچہ کی صحت کی دیکھ بھال جس میں دائیوں کی ٹریننگ بھی شامل ہے (۳) صفائی اور پانی کی فراہمی (۴) چھوت کی بیماریوں کی روک تھام (۵) پیدائش اور موت کے اعداد و شمار رکھنا (۶) حفظان صحت کی تعلیم (۷) مدرسوں اور اسکولوں میں حفظان صحت کے پروگرام چلانا اور (۸) فیملی پلاننگ۔

اس کے علاوہ مرکزی وزارت صحت نے بھی کل ہند پیمانے پر ملیریا، فیل پا، جذام، پوشیدہ امراض اور تپ دق وغیرہ کی روک تھام کے پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔ مرکزی وزارت صحت یہ کام کچھ مخصوص یونٹوں کے ذریعہ کر تا رہا ہے۔ اب یہ کام بھی انھیں صحتی مراکز کو سونپ دیئے جائیں گے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

فروری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں "کمیونٹی ڈیولپ منٹ میں سوشل ایجوکیشن کا مقام" کے عنوان سے شری اے۔آر۔ دلیش پانڈے کا ایک مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر ایک دوست نے اپنے خط میں کچھ شبہات کا اظہار کیا ہے۔ موصوف کا شبہ اپنی جگہ حق بجانب ہے اور ہو سکتا ہے دوسرے احباب کو بھی یہی شبہ گذرے، اس لئے ہم نامہ نگار کا خط اور اس کے بعد اپنی رائے شریک اشاعت کر رہے ہیں۔

ایڈیٹر

خط

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب
ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ
نئی دہلی

"مکرمی، تسلیم

آپ کے موقر رسالے کے فروری کے شمارے میں "کمیونٹی ڈیولپ منٹ میں سوشل ایجوکیشن کا مقام" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں (صفحہ ۱۳ پر) لکھا ہے :-

"مگر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر ابتداء میں اس قسم کے کسی ریاستی محکمے سے متعلق نہیں ہوتے تھے چنانچہ ان کی نگرانی یا رہنمائی کرنے والا کوئی نہ ضلعے میں ہوتا تھا اور نہ ریاست میں۔ اس کمی کو اب پورا کر دیا گیا ہے اور ضلع میں ڈسٹرکٹ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا عہدہ اور ریاست کے محکمۂ تعلیمات میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر کا عہدہ قائم کر دیا گیا ہے۔"

نظم

رات کا اسکول

ہم نے آنا طے کیا ہے رات کے اسکول میں
اک نیا جیون ملا ہے رات کے اسکول میں

رات کے اسکول میں سینچیں گے آشاؤں کا باغ
رات کے اسکول میں دھوئیں گے بدنامی کا داغ
ہم جلائیں گے یہاں اپنی ترقی کا چراغ
ہم یہاں روشن کریں گے اپنا دل، اپنا دماغ
علم کا دیپک جلا ہے رات کے اسکول میں
اک نیا جیون ملا ہے رات کے اسکول میں

پڑھنے لکھنے سے سنور جائے گی اپنی زندگی
پڑھ لیا تو بن گئی بگڑی ہوئی تقدیر بھی
پڑھ لیا تو ہو نہ پائے گی کہیں بے عزتی
دل میں ہوگی تازگی، چہرے پہ ہوگی روشنی
فائدہ ہی فائدہ ہے رات کے اسکول میں
اک نیا جیون ملا ہے رات کے اسکول میں

اس زمیں سے چاند تاروں کے سفر ہوتے رہے
بڑھنے والے بڑھ گئے قسمت کو ہم روتے رہے
کھو دیا بچپن، جوانی آج تک کھوتے رہے
ایک گہری نیند تھی سوتے رہے، سوتے رہے
جاگنے کا حوصلہ ہے رات کے اسکول میں
اک نیا جیون ملا ہے رات کے اسکول میں

آج ہندو دھرم ہم میں ہے، نہ اب اسلام ہے
ہر طرف دنیا میں پچھڑے پن کا اب الزام ہے
ہم جو اَن پڑھ ہیں تو یہ پیارا وطن بدنام ہے
اس وطن کو جگمگانا اب ہمارا کام ہے
دیش بھکتی کا مزا ہے رات کے اسکول میں
اک نیا جیون ملا ہے رات کے اسکول میں

امداد باہمی کی تحریک کو کیسے بڑھایا جائے

کولمبو پلان کے ماہر کی رپورٹ

سر میلکم ڈارلنگ نے، جو پرانی انڈین سول سروس کے رکن ہیں اور ہندوستان کے دیہی مسائل کا جنھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے، ہندوستان کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تنظیم پر اپنی رپورٹ حکومت ہند کے پلاننگ کمیشن کے سامنے پیش کر دی ہے اپنی رپورٹ میں سر میلکم نے یہ یقین دہرایا ہے کہ آج کی پیچیدہ دنیا میں کسانوں کی صحیح معنوں میں بہبودی کوآپریٹو تنظیم کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہر منزل پر اور ابتدائی مراحل پر تو خاص طور سے کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہئے جس سے اس تحریک کو کسی طرح کا صدمہ پہنچے۔ کوآپریٹو تحریک کی کامیابی سے کروڑوں انسانوں کا بھلا ہوگا اور اس کی ناکامی کروڑوں کو لے ڈوبے گی۔"

یہ رپورٹ، جو کولمبو پلان کی فنی امداد کے تحت پیش کی گئی ہے جنوری ۱۹۵۷ء سے اپریل ۱۹۵۷ء کے بیچ کی مدت میں ملک کی آٹھ ریاستوں میں امداد باہمی کے مختلف کاموں کے مطالعے کے بعد تیار کی گئی تھی۔

دو خاص سوال

سر میلکم نے ان دو باتوں پر خاص توجہ دی ہے (۱) کیا مختلف ریاستیں کوآپریٹو تنظیم کا اتنا کام کر سکتی ہیں جتنا دوسرے پلان کے تحت ان سے اُمید کی جاتی ہے؛ اور (۲) امداد باہمی کی تعلیم کا ملک میں معقول انتظام ہے یا نہیں۔ اگر یہ انتظام نہیں ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

سر میلکم کی رپورٹ چھ بابوں میں ہے جس میں کوآپریٹو تنظیم کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے اور جگہ جگہ ضروری سجھاؤ رکھے گئے ہیں۔ بچت اور ادھار دینے والی سوسائٹیوں کے کاموں پر بحث کرتے ہوئے سر میلکم نے کہا ہے کہ دوسرے منصوبے میں انھیں بہت تیزی سے بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو ٹھوس ترقی کے لئے مناسب نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ بات صرف مدھیہ پردیش کے لئے لکھی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنے موقر رسالے کے آئندہ شماروں میں مختلف ریاستوں کے بارے میں اس سلسلے میں معلومات شائع فرمائیں.....؟

آپ کا مخلص

بھیرودت جوشی، بارہ بنکی (یو۔پی)

جوشی صاحب کے دل میں یہ شبہہ بجا طور پر پیدا ہوا ہے اور اس کی بنیاد ہمارے خیال میں دو باتوں پر ہے۔ شری اے۔ آر۔ دنیش پانڈے کے مضمون میں دراصل ایک مختصر سا پیراگراف اور ہے جو اس پیراگراف کے بعد آتا ہے۔ اس کا مضمون یوں ہے:

"سوشل ایجوکیشن پر مرکزی سطح کے اوپر وزارت تعلیم کی ماتحتی میں اور ریاستی سطح پر محکمۂ تعلیمات کی ماتحتی میں کام ہو رہا ہے (یعنی ریاستوں میں جہاں جہاں سوشل ایجوکیشن کا کام محکمۂ تعلیمات کی ماتحتی میں ہوتا ہے وہاں اس کے لئے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر کا عہدہ قائم ہے) مگر دو ریاستیں ایسی ہیں جہاں سوشل ایجوکیشن کا کام سوشل ویلفیر ڈپارٹمنٹ (سماجی بہبود کے محکمے) کے ماتحت ہوتا ہے۔"

ہم نے مضمون کا ترجمہ کرتے وقت اس پیراگراف کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لئے کہ نفسِ مضمون سے اس کا براہ راست کوئی خاص تعلق نہیں تھا لیکن ہمیں احساس ہے کہ اگر مضمون میں یہ پیراگراف بھی شامل کر لیا گیا ہوتا تو جوشی صاحب کو شبہہ نہ ہوتا اس لئے کہ اس پیراگراف سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جہاں جہاں سوشل ایجوکیشن کا کام ریاستی محکمۂ تعلیمات کی ماتحتی میں ہوتا ہے، وہاں اس کے لئے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر برائے سوشل ایجوکیشن کا عہدہ قائم ہے اور اس تفصیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ صورتِ حال کہاں کہاں ہے۔

جوشی صاحب کا شبہہ یوں بھی حق بجانب ہے کہ جن دو ریاستوں میں سوشل ایجوکیشن کا کام سوشل ویلفیر ڈپارٹمنٹ کی ماتحتی میں ہوتا ہے، اُن میں ایک اُتر پردیش بھی ہے اور جوشی صاحب کا تعلق اتفاق سے اسی عجوبۂ روزگار ریاست سے ہے۔

رہا جوشی صاحب کا یہ خیال کہ "یہ بات مضمون نگار نے صرف مدھیہ پردیش کے لئے لکھی ہے" تو یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مدھیہ پردیش ہندوستان کی غالباً پہلی ریاست ہے جہاں سوشل ایجوکیشن کا کام سرکاری انتظام میں محکمے قائم کرکے اور افسران کا باضابطہ تقرر کرکے کیا گیا تھا اور دنیش پانڈے جی کا یہ خیال بہت بڑی حد تک صحیح ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے کام کی تنظیم کے بارے میں مدھیہ پردیش نے ملک کو راہ دکھائی ہے۔

——— ایڈیٹر

چاہئے اگر سوسائیٹیاں روپے کا لین دین کرتی ہوں تو انھیں کسی چیز کا بیوپار کرنے اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

چھوٹی سوسائٹیوں کو ملا کر ایک کرنے سے پہلے ان کے ممبروں کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے اور کسی بھی سوسائٹی میں سرکار کی طرف سے کوئی ایسا آدمی نہ رکھا جائے جو امداد باہمی کے کاموں میں دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

بڑی سوسائٹیوں کے بننے کے ساتھ چھوٹی سوسائٹیاں بنانے اور نئی سوسائٹیاں کھولنے کے ساتھ پرانی سوسائٹیوں کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانے کا انتظام کرنا چاہئے۔ جن سوسائٹیوں کے پاس باقاعدہ سکریٹری نہ ہوں ان کے کسی ممبر کو کوآپریٹو کی تعلیم دلانے کا انتظام کرنا چاہئے، جس کا سارا خرچ ریاستی حکومتوں کو برداشت کرنا چاہئے۔ اگر تربیت یافتہ لوگ نہ ملیں تو کسی علاقے کی کئی ایک سوسائٹیوں کو ملا کر ان کے لئے ایک تربیت یافتہ کارکن رکھا جائے۔

بچت پر زور

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بچت اور بکری پر جب تک زور نہ دیا جائے گا صرف ادھار دینے سے کام نہیں چل سکتا جن سوسائٹیوں کے نام کے ساتھ لفظ "ادھار" ہی لگا ہوا ہے اور بچت نہیں ان کے نام کے ساتھ "بچت" کو بھی جوڑ دینا چاہئے اس لئے کہ نام کا بھی کافی اثر ہوتا ہے۔

حکومت کا دخل

سر میلکم کا کہنا ہے کہ اوپر کی سوسائٹیوں میں حکومت کا دخل اتنا مضر نہیں جتنا نیچے کی سوسائٹیوں کے انتظام میں نیچے کی سوسائٹیوں کو اپنے کام میں زیادہ سے زیادہ آزاد رہنا چاہئے، یہی اس تحریک کی بنیاد ہے

سوسائٹیوں کے بورڈ میں سرکار کی طرف سے ایسے ہی لوگ نامزد ہونے چاہئیں جو امداد باہمی کے اصول اور طریق کار سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اس طرح کی نامزدگیاں سیاسی مفاد سے الگ رہکر ہونی چاہئیں۔

نئے ڈھنگ کی سوسائٹیاں

رپورٹ میں کچھ ایسی سوسائٹیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو لوگوں نے روپیہ پیسہ حاصل کرنے کے لالچ میں بنا رکھی ہیں۔ یہ سوسائٹیاں غیر ممبروں سے ہی زیادہ لین دین رکھتی ہیں۔ ایسی سوسائٹیوں کو قانون کے تحت رجسٹر نہ کرنا چاہئے

بمبئی، آندھرا، مدراس اور پنجاب میں جہاں یہ تنظیم کافی مضبوط ہے وہاں بھی بات دیکھنے میں آئی ہے۔ اس لئے اُن کی تجویز ہے کہ اس کام کو پھیلانے کی مدت پانچ سال سے بڑھا کر دس سال کر دی جائے۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ متواتر رقم میں حصہ داروں کا حصہ کم ہوتا جا رہا ہے اور ادھار کی وصولی بھی کم ہوتی جا رہی ہے اس سے بقایا کافی بڑھ گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گاؤں میں ادھار دینے کے بارے میں جو جانچ کی گئی تھی، اس کی رپورٹ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں سارے ملک کے حالات کو ایک جیسا سمجھ کر ہر بات پر غور کیا گیا ہے اور اسی رپورٹ کی بنیاد پر دوسرے پنج سالہ منصوبے کی ترتیب دی گئی ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ایک جیسے حالات نہیں ہیں ایک ہی ریاست کے دو الگ الگ حصوں میں بھی ایک جیسے حالات نہیں دکھائی دیتے ہیں اس لئے سارے ملک کے لئے کوئی ایک ہی انتظام بہتر نہیں ہو سکتا۔

احتیاط کی ضرورت

ان ریاستوں میں جہاں یہ تحریک کافی مضبوط نہیں ہے خاص احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ ریاستی حکومتیں اس وقت مقررہ نشانوں تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہیں، مگر انھیں اس سے زیادہ قرض کی وصولی پر توجہ دینی چاہئے اس بات کے لئے رپورٹ میں وزارت زراعت و غذا میں ایک افسر اعلیٰ کے تقرر کی سفارش کی گئی ہے، جو اس بات پر نظر رکھے کہ ریاستوں میں جلد سے جلد نشانوں کو حاصل کرنے میں کہیں تحریک کی استواری کو نظر انداز تو نہیں کیا جا رہا ہے۔

بچت اور ادھار سوسائٹیاں چھوٹی ہونی چاہئیں یا بڑی، اس سوال پر بھی سر سلیکم نے کافی غور کرنے کے بعد بتلایا ہے کہ اس سلسلے میں کسی بندھے ٹکے اصول کی پابندی نہیں کی جا سکتی، پھر بھی چھوٹی سوسائٹیوں کے مقابلے میں بڑی سوسائٹیاں اچھی رہتی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں تجربہ کر کے فیصلہ کرنا ہی زیادہ اچھا ہوگا۔ یہ تجربے تین طرح کے ہونے چاہئیں (۱) ایسی سوسائٹی بنانا جس میں سرکار ایک ممبر اور حصے دار کی حیثیت سے شریک ہو (۲) ایسی سوسائٹی بنانا جس میں سرکار کے حصے تو ہوں مگر وہ اس کی ممبر نہ ہو (۳) ایسی سوسائٹی بنانا جس میں سرکار نہ حصہ دار ہو اور نہ سوسائٹی کی ممبر۔ تینوں طرح کی سوسائٹیوں کو ضروری امداد ملنی چاہئے اور تین چار سال تک ان کو چلا کر دیکھنا چاہئے ہر سوسائٹی کے کام کا رقبہ گاؤں سے چاروں طرف جہاں اس کا صدر مقام ہو دو میل سے زیادہ نہ ہو۔ اسی طرح ہر سوسائٹی میں ۲۰۰ سے ۵۰۰ ممبر ہونے چاہئیں۔ ان کے حساب کتاب کی جانچ ساتھ کے ساتھ یا ہر تین مہینے کے بعد ضرور ہونی

اس طرح جو سوسائٹیاں نام کے لئے تو ملٹی پرپز (سب کاموں کے لئے) سوسائٹیاں ہیں مگر وہ کام محض ایک یا دو کرتی ہیں ایسی سوسائٹیوں کو یہ نام رکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔

جہاں کوآپریٹو تنظیم کے تحت بکری کا ٹھیک بندوبست ہے وہاں ان سوسائٹیوں سے صرف فریلائزر فروخت کرانے کا کام لینا چاہئے۔

کارکنوں کی تربیت

امداد باہمی کی تعلیم کی مرکزی کمیٹی نے تین چار سال میں کام سکھانے کا جو انتظام کیا ہے اُس کی تعریف کرتے ہوئے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ موجودہ انتظام کے تحت پوری طرح کام نہیں چلایا جا سکتا۔ رپورٹ میں ایسے لوگوں کو رجسٹرار مقرر کرنے پر سخت اعتراض کیا گیا ہے، جنہیں پہلے سے امداد باہمی کی تعلیم نہ ملی ہو۔ کارکنوں کا جلدی جلدی تبادلہ ہونے سے بھی کام میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ ہر رجسٹرار کو امداد باہمی کے کاموں میں کم سے کم ایک سال کی ٹریننگ ضرور دینی چاہئے۔ اسی طرح انسپکٹر وغیرہ کی تربیت کا بھی انتظام کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ ریاستی مرکزوں میں یہ تعلیم مادری زبانوں میں ہی دی جانی چاہئے۔ تعلیم میں ڈراموں اور دوسرے ذرائع کا بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

نیشنل ایکسٹنشن سروس کے افسروں اور ڈیولپمنٹ افسروں اور دوسرے کارکنوں کی ٹریننگ کے لئے بھی ایک میعاد مقرر کرنے کی رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے۔

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر تعلیم و ترقی جامعہ سے شائع کیا۔



ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جلد (۹) مئی ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر (۵)

بانی: شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ جامعہ نگر نئی دہلی

ٹیلی فون نمبر ۴۲۴۶۱

قیمت سالانہ: چار روپے

اصول اور طریقے

لیڈر تیار نہیں کئے جاتے: لیڈر پیدا ہوتے ہیں

(جنتا کالجوں کے سوچنے کی بات)

لیڈری کا مادہ بھی شاعری کی طرح وہبی اور خداداد ہوتا ہے۔ جس طرح ہر شخص شاعر نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ہر شخص لیڈر بھی نہیں ہوتا۔ شاعری اور لیڈری دونوں میں اکتساب کو بہت کم دخل ہوتا ہے، چنانچہ شاعری کی دنیا میں ایسی شخصیتوں کی مثالیں بہت ہیں جن کی تعلیم کا معیار کچھ بہت اُونچا نہیں تھا تاہم انھوں نے اپنے کلام سے دنیا کو چونکا چونکا دیا ہے۔ یہی کیفیت لیڈروں کی صف میں بھی نظر آتی ہے۔ اس واقعے کی روشنی میں "لیڈر تیار کرنے" کی بات ایسی ہی ہے جیسے "شاعر تیار کرنے" کی بات کہی جائے۔

لیڈر کا کام اپنے آس پاس کی زندگی کو اپنی شخصیت سے متاثر کرنا ہوتا ہے، اور چونکہ یہ وصف اُسے خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے، اس لئے وہ اُسے قدرتاً کام میں لاتا ہے خواہ اُسے اس بات کا شعور نہ ہو کہ وہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ لیڈر اپنی لیڈری کی استعداد کو کس سمت میں استعمال کرتا ہے۔ لیڈری ہو یا کوئی اور استعداد، اس کے استعمال کے لئے سمت کا تعین ماحول کا کام ہے۔ سمت کا تعین کسی کے کہنے یا سکھانے سے نہیں ہوتا بلکہ غیر ارادی طور پر ماحول کے اثر سے ہوتا ہے۔ ایک قدم اور آگے چلئے تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات خود ماحول کی تخلیق بھی لیڈر ہی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

لیڈر اور لیڈری کی مذکورہ بالا تعریف کے بارے میں یہ جواب دیا جا سکتا ہے اور عام طور پر دیا جاتا ہے ـــــ کہ جہاں لیڈر تیار کرنے کی بات کہی جاتی ہے وہاں لیڈر کا مفہوم دوسرا ہوتا ہے، جس سے مراد وہ تربیت یافتہ شخص ہے جو ایک مخصوص مہم میں لوگوں کو کام کے چند بندھے ٹکے اصول یا راستے دکھاتا ہے۔ اس مفہوم کے مطابق لیڈر اور مستری میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ لیڈر کا یہ دوسرا مفہوم تسلیم بھی کر لیا جائے تو دیکھنا یہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں، یہ حالت موجودہ کس طرح کے لیڈر کی ضرورت ہے۔

ترتیبِ مضامین

اصول اور طریقے

نظم

نمونے

سوشل ایجوکیشن کی تحریک

تنقید و تبصرہ

(مصور پرنٹنگ مطابع برقی پریس دہلی)

یا کم سے کم یہ کہئے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ صحیح نہیں تھا۔ جتنا کالجوں کے خیال کا سرچشمہ، سب لوگ جانتے ہیں، ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کا تجربہ تھا۔ اگر ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں اور خود ڈنمارک کی انیسویں صدی کے بیچ کے زمانے کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈنمارک کی انیسویں صدی کے بیچ کے زمانے کی تاریخ میں اور ہندستان کی بیسویں صدی کے بیچ کے زمانے کی تاریخ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ زندگی کی جو کیفیت اس زمانے میں ڈنمارک کی تھی، کم و بیش وہی کیفیت اس زمانے میں ہندوستان کی ہے۔ ڈنمارک کا مزاج بھی نمایاں طور پر دیہی تھا۔ اور اب بھی ہے ہندستان کا مزاج بھی نمایاں طور پر دیہی ہے۔ جس طرح ڈنمارک کے لوگ اس وقت زندگی کی قدر و قیمت سے ناآشنا اور مایوس سے تھے تقریباً اسی طرح آج ہندوستان کے عوام زندگی کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں۔ اور تقدیر کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی یکسانیت جو ڈنمارک اور ہندوستان کے حالات میں پائی جاتی ہے، وہ ہے سیاسی ڈھچر کی تبدیلی۔ انہیں مطلق العنان بادشاہی سے نجات ملی تھی اور نیا جمہوری دستور ملا تھا (سنہ ۱۸۴۹ء)، ہندوستان کو مطلق العنانہ سامراج سے نجات ملی ہے اور نیا جمہوری دستور بنا ہے (سنہ ۱۹۴۷ء)

یہ تھے وہ سیاسی اور سماجی حالات جب فوک ہائی اسکول ڈنمارک کے عوام کے لئے "تعلیم برائے زندگی" کا نعرہ لے کر اُٹھے تھے۔ اُن کے سامنے نہ عوامی لیڈر تیار کرنے کی بات تھی اور نہ اپنے طالب علموں کو کسی پیشے کی تعلیم دینے کی بات۔ ان کا پہلا نعرہ تھا "پہلے انھیں زندگی کی حرارت سے گرماؤ، پھر تعلیم دو"۔ یہ زندگی کی حرارت سے گرمانے" کی بات اپنے اندر بہت معنی رکھتی ہے، جسے سمجھنا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب تک زمین کو مختلف ذریعوں سے حرارت پہنچا کر قوتِ نمو سے بھرپور نہیں کرلیا جاتا، اس وقت تک اس کے اندر بیج نہیں ڈالے جاتے۔ اسی استعارے کی مدد سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ زمین کو تیار کرتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں سے فلاں فلاں ٹکڑے لے لئے جائیں، باقی کو الگ کردیا جائے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں نے سوائے عمر کی قید کے داخلے کے لئے اور کوئی پابندی نہیں لگائی تھی بلکہ تعداد کی ایک خاص حد کے اندر اندر آنے والوں کے لئے صلائے عام تھی۔ یہ بات اس لئے تھی کہ انھیں اپنی آغوش میں آنے والوں کو "زندگی کی حرارت سے گرمانا تھا" انھیں "لیڈر نہیں بنانا تھا"

مگر لیڈر پھر بھی نکلے

ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں اور ان کے اثرات اور نتائج پر نظر رکھنے والے بجا طور پر کہہ سکتے

ہمارے خیال میں یہ دوسرے مفہوم کا لیڈر جو تربیت دے کر تیار کیا جاتا ہے اور تیار کیا جا سکتا ہے، ایسے مقام پر کام دے سکتا ہے جہاں لوگ بیدار ہوتے ہیں اور زندگی کی نئی نئی قدریں قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، ضرورت صرف ایسے جانکار لوگوں کی ہوتی ہے جو ان کے سامنے اس نئی طرز زندگی کی تفصیلات اور گُروں کا مظاہرہ کر دیا کریں

اس کے مقابلے میں ہمارا ملک ہندوستان ہے جہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو زندگی کی واقعیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اسے خواب سمجھتے ہیں جو عموماً ڈراونا اور بھیانک ہے اور اس سے جس قدر جلد نجات ملے اتنا ہی اچھا۔ ظاہر ہے اس صورت میں زندگی کی نئی قدروں اور نئے رنگِ روپ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اُسے قبول کرنے کی بات تو دور کی ہے، جب صورتِ حال یہ ہو تو زندگی کے بارے میں لوگوں کے طرزِ فکر کو بدلنا اور پھر اسے جمہوری طرز زندگی کے سانچے میں ڈھالنا مستری نما لیڈر کے بس کی بات نہیں ہوسکتی۔

اوپر کی باتوں کا جائزہ لینے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اچھا اگر لیڈر کی تعریف اس کے معروف معنوں میں مان لی جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان کو ایسے ہی پیدائشی لیڈروں کی ضرورت ہے تو آیا ایسے لیڈر موجود بھی ہیں اور اگر نہیں ہیں تو پھر کیا کیا جائے؟"

پیدائشی استعداد اور اہلیت رکھنے والے ہر ملک یہاں تک کہ ہر قریئے اور بستی میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ پیدائشی لیڈر کسی مقام یا کسی زمانے میں موجود ہی نہیں ہوتے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ زمانے اور حالات کے اثر سے یہ جوہر قابل چھپے ہوئے ہوں یا ایسا بھیس اختیار کر لیا ہو جس کی وجہ سے انھیں لیڈر کہنے میں تکلف ہوتا ہے۔ ناسازگار حالات میں ایسے لیڈروں کی مثال کوڑا کرکٹ اور مٹی کے ڈھیر میں دبے ہوئے ہیروں کی سی ہوتی ہے جو اُسی وقت اپنی روشنی سے اپنے آس پاس کو روشن کر سکتے ہیں جب ان کے اوپر سے کوڑا کرکٹ اور مٹی کا ڈھیر دور کر دیا جائے۔

جنتا کالجوں کے سوچنے کی بات

ہمارے جنتا کالجوں کے سامنے ابتدا ہی سے قریب قریب ہر جگہ بنیادی مقصد لیڈروں کی ٹریننگ رہا ہے لیکن غالباً کسی جگہ ان کالجوں سے تربیت پا کر نکلے ہوئے یہ نام نہاد لیڈر اپنا منصب پورا نہیں کر سکے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا، اس سوال کا جواب دینا بڑی لمبی بحث کا محتاج ہے جس میں ہم یہاں پڑنا نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات ہمارے نزدیک طے ہے کہ جس چیز کو جنتا کالجوں نے اپنے لئے بنیادی مقصد قرار دیا وہی دراصل صحیح نہیں تھا

ا تحریک ریاستوں کے محکمۂ تعلیم کے ماتحت چلنا شروع ہوئی۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ جس علاقے میں یہ کام ہو رہا ہے، وہاں اُسی علاقے کا کوئی ایسا شخص ہونا چاہئے جو سوشل ایجوکیشن کے سرکاری کارکن کے لئے دستِ راست ثابت ہو۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ خیال صحیح تھا یا نہیں، بلکہ اس بات سے ہے کہ آیا جنتا کالجوں کے اس مقصد میں بھی امیابی ہوئی یا نہیں۔ اعداد و شمار گواہ ہیں کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ ہوا دراصل یہ ہے کہ یہ نام نہاد لیڈر تا کالجوں سے نکلنے کے بعد بیشتر شہروں کی طرف بھاگے ہیں یا محکمۂ تعلیمات کے سوشل ایجوکیشن میں نوکری گئے ہیں۔

ہی مان لیجئے کہ لیڈر تیار کرنا ہی مقصد ہے

ایک ذرا سا امکان اس بات کا بھی ہے کہ کوڑا کرکٹ اور مٹی کا ڈھیر دور کئے بغیر ہیروں کی تلاش میں ایک آدھ اصلی ہیرے ہاتھ آجائیں یا یہ مان لیجئے کہ ہیرے اصلی ہی کیوں نہ ہوں انہیں صیقل کرنے اور ان کی چمک کو دوبالا کرنے کے لئے ان کو ادینے کی ضرورت بہرحال باقی رہتی ہے۔ اس سے اور آگے بڑھ کر ایک جدید تصور تسلیم کر لیجئے کہ اصلی ہیرے تو تعداد میں اتنے یں ہوتے جتنے کی ہمیں ضرورت ہے اس لئے کیوں نہ مصنوعی ہیرے بنائے جائیں۔

ان نظریوں کو تسلیم کر کے موجودہ جنتا کالجوں کا جائزہ لیجئے تو ان کی جو حیثیت اور مرتبہ ہونا چاہیے اس سے وہ بہت دہ کم تر ثابت ہوں گے۔ اس مقام پر پھر ہمیں اپنے جنتا کالجوں کا جائزہ لیتے وقت ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کی ں اپنے سامنے رکھنی پڑتی ہے۔ ان فوک ہائی اسکولوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈنمارک میں فوک ہائی کولوں کی تحریک کی ابتدا، یونیورسٹی کے پروفیسروں اور دوسرے بلند مقام اشخاص کے ہاتھوں ہوئی اور اب بھی بیشتر فوک ہائی اسکولوں کے پرنسپل ر اُستاد بھی) شخصی اور علمی دونوں حیثیتوں سے بہت اونچے مرتبے پر پہنچے ہوئے لوگ ہیں۔ سیدھی بات ہے کہ لیڈر آخر ایسے ہی لوگ تو تیار کر سکتے ہیں جن میں خود لیڈری کی شان ہو، جن کی سیرت و شخصیت ین کے کلام و پیام میں اتنا اثر ہو کہ ان کے شاگرد (جو آگے چل کر لیڈر بننے والے ہیں) مریدوں کے سے جوش وش اور عقیدت کے زیر اثر ان کی خاک پا کو بوسہ دینا اپنے لئے فخر کی بات سمجھیں! یہ جوہر تو عام اُستادوں کے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی اہمیت ان لوگوں کے لئے کتنی ہوگی جن کو عوام ——— اور وہ بھی خوابیدہ فسردہ عوام ——— کے لئے لیڈر تیار کرنے کا منصب سونپا گیا ہو۔

ہمارے جنتا کالجوں کی ناکامی کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ان کی رہنمائی کا کام بیشتر ایسے لوگوں کے ہاتھوں

ہیں کہ ان اسکولوں سے "لیڈر تو نکلے" اور لیڈر بھی ایسے جنھوں نے اپنی اپنی بستیوں کے لئے اپنے طور پر، اپنی محنت اور لگن سے فوک ہائی اسکول بنائے اور انھیں ایک عرصے ہی تک سہی کامیابی سے چلایا۔

اس موقعے پر ہم لیڈر کے بارے میں وہی بات دہرائیں گے جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں آچکا ہے، یعنی "ناساز گار حالات میں لیڈر کی مثال کوڑا کرکٹ اور مٹی کے ڈھیر میں دبے ہوئے ہیرے کی سی ہوتی ہے جو اپنی روشنی سے اسی وقت اپنے آس پاس کو روشن کر سکتا ہے جب اس کے اوپر سے کوڑا کرکٹ اور مٹی کا ڈھیر ہٹا دیا جائے" ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں نے اپنے ان "ہیروں" کو ان کی روشنی محسوس کرنے سے پہلے ہی نہیں بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے "زندگی کی حرارت سے گرمانے" کے عمل کے ذریعے پہلے مردہ دلی، افسردگی، اور مایوسی کے کوڑا کرکٹ اور ملبے کو دور کیا، اور جب یہ کوڑا کرکٹ اور ملبہ دور ہو گیا تو "ہیرے" بغیر کسی کوشش کے خود چمکنے اور اپنے آس پاس کے ماحول کو چمکانے لگے۔

ہماری سب سے بڑی بھول

مجھے جن ایک آدھ جنتا کالجوں کے کام کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، اُس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے اپنے جنتا کالجوں کے کام کا نقشہ تیار کرنے میں جو سب سے بڑی بھول ہوئی ہے وہ یہ ہوئی ہے کہ ان کے قیام کا پہلا اور بنیادی مقصد، لیڈروں کی ٹریننگ قرار پایا۔ ہم نے انھیں نوجوانوں کے لئے "زندگی کی تعلیم" کا مرکز نہیں بنایا بلکہ "لیڈروں" کے لئے پیشے اور لیڈری کی ٹریننگ کا سنٹر بنا دیا۔ پھر اس کی تعلیم کو وہ جیسی بھی تھی، تعداد کی ایک خاص حد میں رہتے ہوئے سب کے لئے عام نہیں کیا گیا بلکہ امیدواروں کی چھنٹائی کر کے کچھ خاص لوگوں کو پسند کیا گیا، جسے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جہالت، مایوسی اور افسردگی کے ملبے کو دور کرنے کی کوشش کے بجائے کچھ چمکتی ہوئی چیزوں کو چن لیا گیا، یہ نہیں دیکھا گیا کہ ہر چمکنے والی چیز "ہیرا" نہیں ہوتی۔

یہ بھول، سمجھ میں نہیں آتا کیوں ہوئی؟ ڈنمارک کے فوک ہائی اسکول، جن سے جنتا کالجوں کا خیال لیا گیا ہے، ان کے یہاں صاف نظر آتا ہے کہ لیڈر تیار کرنے کی بات نہ ابتدا میں تھی اور نہ اس وقت ہے کہ یہ خیال ہو کہ "ہمیں فوک ہائی اسکولوں کے ابتدائی نمونے کو نہیں بلکہ ان کے تازہ ترین نمونے کو ... اپنے سامنے رکھنا چاہیئے"

جنتا کالجوں کے ذریعے مقامی لیڈر تیار کرنے کا خیال غالباً اس طرح آیا کہ جس وقت سوشل ایجوکیشن

ہندوستان میں دیہی یونیورسٹی کے مسائل

مسئلہ

آزادی ملنے کے بعد سے یونیورسٹی کی تعلیم کا مطالبہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس مطالبے کے نتیجے کے طور پر تعلیمی حلقوں میں اس بات پر کافی غور و خوض ہو رہا ہے کہ نئی یونیورسٹیاں کس نمونے کی ہونی چاہئیں۔ نئی یونیورسٹیوں کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی جارہی ہے کہ موجودہ یونیورسٹیوں میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کا اثر سماج کے صرف ایک چھوٹے سے طبقے تک محدود رہتا ہے، جو ملک کے شہری علاقوں میں بستا ہے۔ شہروں میں ملک کی آبادی کا دس سے پندرہ فیصدی حصہ رہتا ہے جس کے مقابلے میں دیہی علاقوں کی آبادی کا اوسط ۸۵ سے ۹۰ فیصدی یونیورسٹیوں کی تعلیم کے اثر سے دیہی علاقوں کی محرومی کا حال یہ ہے کہ اگرچہ یونیورسٹیوں کے ماتحت کام کرنے والے کالجوں نے بعض مضامین کی تعلیم میں خاصی اصلاح کرلی ہے، تاہم وہ دیہات کی زندگی پر اثر ڈالنے سے قاصر رہے ہیں اور اب تک قاصر ہیں۔

یہ شکایت ملک کے گوشے گوشے میں عام ہے کہ گاؤں میں ابتدائی اور کہیں کہیں ثانوی تعلیم کے رواج سے نوجوان بہت بڑی تعداد میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گاؤں سے شہروں کو ہجرت کر جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کوئی ہرج نہیں کہ نوجوان اپنے احاطہ ذہنی میں وسعت پیدا کرنے کی غرض سے یونیورسٹیوں میں جائیں اور شہروں کی زندگی اختیار کریں، مگر مصیبت یہ ہے کہ جو نوجوان اس غرض سے شہروں میں جاتے ہیں، ان کا جی پھر شہروں سے اپنے گاؤں کو واپس آنے کو نہیں کرتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ وہیں شہروں ہی میں رہ کر سفید پوشی کی کوئی نوکری تلاش کر لیتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گاؤں اپنے جوہر قابل سے محروم ہو جاتے ہیں، دیہی معیشت اُبھر نہیں پاتی اور اچھے اچھے ذہین لوگ معمولی معمولی نوکریوں کے پیچھے شہروں میں مارے مارے

میں رہا ہے جو نوجوانوں کو تو کیا' چھوٹے بچوں کو بھی اپنی سیرت اور شخصیت کے جادو سے متاثر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، دراں حالیکہ ہندوستان کے عوام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہندوستانی جنتا کالجوں کے پرنسپل کو اگر ونوبا بھاوے نہیں تو کم سے کم دھیریندر مزومدار' ڈاکٹر ذاکر حسین یا کارو ے کی سی سیرت و شخصیت کا حامل ہونا چاہیئے۔

حکومت کے اثر سے آزادی

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جنتا کالجوں کے بارے میں چاہے ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کی حرف بہ حرف تقلید کیجئے' یا نہ کیجیے' یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ ان فوک ہائی اسکولوں کی کامیابی کا راز ان کی آزادی میں پوشیدہ ہے اور ہندوستانی جنتا کالج بھی اُس وقت تک کامیابی کی راہ پر نہیں پڑ سکتے۔ جب تک وہ براہ راست حکومتوں کے زیر اہتمام چلتے رہیں گے، خواہ ان کا مقصد لیڈر تیار کرنا ہی کیوں نہ ہو' جو تیار نہیں کئے جاتے' پیدا ہوتے ہیں۔

دیہی معیشت صرف زراعت کا نام نہیں ہے۔ گاؤں کو اگر اس قابل بننا ہے کہ اس میں کوئی زندگی گزارنے کے لئے آمادہ ہو، تو اُسے اپنے یہاں زندگی کی آسائشیں بہم پہنچانی ہوں گی۔ ایک دیہی علاقے میں کھیتی باڑی کے جدید طریقوں کا چلن ہونا تو ہے ہی ضروری، اس کے علاوہ اچھی نسل کے مویشیوں کی پیداوار اور افزائشِ نسل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں لوگوں کو مویشیوں کے علم سے پوری پوری واقفیت ہو۔ دوسری اسی قدر اہم چیز صحت وصفائی اور بحالیِ صحت کا ماحول پیدا کرنا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ گاوؤں میں رُسل و رسائل کے اچھے سے اچھے وسائل مہیا ہوں، اچھے اور صحت بخش مکانات کی سہولت ہو۔ صاف اور نتھرے پانی کی سپلائی کا انتظام ہو، برساتی اور گندے پانی کے نکاس کے لئے اچھی اور پکی موریاں ہوں۔ غلاظت کو ٹھکانے لگانے کا معقول بندوبست ہو، وباؤں اور مہاماری سے بچنے کی تدابیر کی گئی ہوں اور اسی طرح کی دوسری باتوں کی تنظیم ہو۔ ان چیزوں کا تقاضا یہ ہے طبّی علوم اور صحت عامّہ سے متعلق گاوؤں کے حسبِ حال انجینیری کی تعلیم کا انتظام ہو۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ اچھی زراعت اور ڈیری فارموں اور ان کے ساتھ صحت وصفائی کے عمدہ انتظام سے نمونے کے گاؤں کا نقشہ مکمّل ہو جاتا ہے۔ اس نقشے کو مکمّل کرنے کے لئے پورے علاقے میں گھریلو صنعتوں کے مرکزوں کا ایک جال بچھا ہونا چاہئے جو اچھی قسم کی آسائشی مصنوعات مہیّا کریں۔ اس ضرورت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے لئے فنِ زراعت کے ساتھ ساتھ اُونچی سطح پر پیشوں کی تعلیم کا بھی بندوبست ہو۔

ہمارے دیہی علاقوں کی بہت سے مقامات پر خصوصًا اُتر پردیش کے مشرقی حصّے اور بہار میں عجیب وغریب خصوصیت ہے۔ ان علاقوں میں بڑے بڑے شہر تو نہیں ہیں مگر چھوٹے چھوٹے قصبے اور گاؤں بہت زیادہ ہیں۔ آبادی گنجان ہے اور زمین کے اوپر آبادی کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ قدرت اس علاقے کے لئے بہت فیاض واقع ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ اسے اس کے ظلم وستم کا بھی اکثر شکار ہونا پڑتا ہے، اور لوگوں کو جان ومال دونوں کی بھینٹ چڑھانی پڑتی ہے۔ اس علاقے میں ندی نالے کثرت سے ہیں اور ان کی بدولت پانی افراط سے ملتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ سیلاب کے دنوں میں یہی ندی نالے علاقے کا علاقہ تباہ کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی دوبھر ہو جاتی ہے اور لوگوں کے اوپر چاروں طرف سے مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پھر دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ ان علاقوں میں اگرچہ گاوؤں کا ماحول غیر صحت بخش ہوتا ہے اور وباؤں اور بیماریوں کا دور دورہ رہتا ہے، تاہم بچے بہت پیدا ہوتے ہیں اور اسی نسبت سے مرتے بھی بہت ہیں۔ زمین کے اوپر چونکہ بوجھ بہت زیادہ ہے اور آبادی گنجان ہے اس لئے یہاں بڑے پیمانے پر اور مشینی زراعت

پھرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ یونیورسٹیوں میں کچھ ایسا کیا جائے کہ یہ کیفیت ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

دو حل

اس مسئلے کے عام طور پر دو حل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ (۱) موجودہ یونیورسٹیوں کے طریقۂ کار میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ وہ نئے جمہوری ڈھچر سے ہم آہنگ ہو جائیں اور دوسری یہ کہ (۲) نئی یونیورسٹیاں جو بنیں، وہ "دیہی یونیورسٹیاں" ہوں۔ مگر یہ بات کہ دیہی یونیورسٹیوں کا رنگ روپ دراصل کیا ہونا چاہئے، ابھی تک آئینے کی طرح واضح نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کی جن خیالات پر بنیاد ہے وہ دھندلے ہیں، اور جو ادارے اپنے آپ کو دیہی یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں، انھیں ابھی تجربات کی منزل سے گذرنا ہوگا اور ان تجربات کی ر میں اپنے کام کے طریقے اور رنگ روپ کو ڈھالنا ہوگا، تب کہیں جاکر کوئی بات نکلے گی جسے صحیح معنی میں دیہی یونیورسٹی کا نمونہ کہا جا سکے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی چیرمینی میں ۱۹۴۹ء میں جو یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن بنا تھا، اس نے یہ خیال دیا تھا اور اسی نے ایک خاص حد تک دیہی یونیورسٹی کا خاکہ بھی مرتب کر دیا تھا مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی تک دیہی یونیورسٹی کے نمونے پر ہر حیثیت سے مکمل کوئی ادارہ قائم ہوا ہے یا اس نے وہ سب کچھ کر دکھایا ہے جس کی کمیشن کی سفارش کے مطابق اس سے امید کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے زرعی ادارے جہاں کھیتی باڑی کے فن کی تعلیم دی جاتی ہے، کھلے ہیں۔ اور ولبھ بھائی ودیا پیٹھ (آنند) نے اس باب میں شاندا تجربے کئے ہیں جنھیں اس سفر میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر پھر بھی یہ بات آسانی سے نہیں کہی جا سکتی کہ ولبھ بھائی ودیا پیٹھ نے بھی سماج کے اوپر کوئی اثر چھوڑا ہے۔

زراعت میں اعلیٰ تعلیم جو یونیورسٹی کی سطح پر دی جاتی ہے، اس کا رواج کئی سال پہلے ہو چکا ہے، اور ا زمانے میں جو بہت سے زراعتی کالج قائم ہوئے ہیں، ان میں زراعت کے مضمون میں بی۔ ایس سی اور ایم۔ ایس تک کی تعلیم ہوتی ہے، نگران کالجوں میں جو کچھ کام ہوا ہے، اس سے وہ نتائج نمودار نہیں ہوئے جن کی امید ان سے کھیتی کے طریقوں میں اصلاح ہوگی، اور اشیاءِ غذا اچھی قسم کی اور زیادہ مقدار میں پیدا ہوں گی، ع دیہی معیشت میں اصلاح و ترقی کی بات تو خیر بہت دور کی ہے۔

دیہی یونیورسٹی کی طرح کے ادارے کے لئے کم سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے بہ نسبت عام موجودہ یونیورسٹی کے جو صرف معاشرتی علوم، سماجی علوم اور کسی حد تک طبعی علوم کی تعلیم دیتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر دیہی یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں سوچنے کا یہی طریقہ رہا تو ایسی حالت میں جبکہ اُسے معاشرتی اور سماجی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زراعت اور دوسرے صنعتی علوم کی اونچی تعلیم کے لئے ادارے قائم کرنے ہوں گے، دیہی یونیورسٹی کا حشر یہ ہوگا کہ وہ ایک بے جان اور بے عمل سا ادارہ بن کر رہ جائے گا۔

دوسرا مسئلہ دیہی یونیورسٹی میں کام کرنے کے لئے مناسب حال اساتذہ اور کارکنوں کا ملنا ہے۔ دیہی یونیورسٹی میں کام کرنے کے لئے صنعتی علوم میں اونچی اونچی ڈگریاں رکھنے والے کارکنوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ایسے کارکنوں کی جن میں کام کا بھرپور جوش ہو، جنھیں اس اسکیم کی فائدہ مندی اور اہمیت کا احساس اور یقین ہو، جو مستقبل پر نظر رکھتے ہوں اور جو اس نامعلوم دنیا میں مبلغانہ جوش و خروش اور فاتحوں کی سی جرأت اور بے خوفی کے ساتھ قدم رکھنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دیہی یونیورسٹی کے حق میں جہاں اُسے قائم کیا جانا ہو، رائے عامہ پیدا کی جائے۔ یہ ضرورت اس لئے ہے کہ چاہے دیہی یونیورسٹی کی تائید میں پلیٹ فارموں پر کتنی ہی دریا دلانہ اور مخلصانہ تقریریں کیوں نہ ہوتی ہوں، پڑھے لکھے لوگوں کے طبقے میں ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے ـــــ جس کا بہرحال اظہار نہیں کیا جاتا ـــــ کہ "دیہی یونیورسٹی ایک کم حیثیت ادارہ ہے جو پسماندہ طبقے کے لوگوں کی تعلیم کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ موجودہ علمی یونیورسٹیوں کی حیثیت اس سے بہت اونچی ہے جہاں اونچے طبقے کے طلباء آتے ہیں، یہ ایک غلط تصور ہے اس لئے کہ یہی دراصل وہ ادارہ ہے جو ایک جمہوری ملک کے تقاضوں اور مطالبات سے نسبتاً زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ اس جمہوری ملک یعنی ہندوستان کا مزاج نمایاں طور پر دیہاتی ہے۔

دیہی یونیورسٹی کتنی بڑی ہو؟

اس سوال پر کہ دیہی یونیورسٹی کا سائز کیا ہونا چاہئے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ رادھا کرشنن رپورٹ (یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ) میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا ذکر کر دوں۔ رپورٹ میں تجویز کیا گیا ہے کہ "دیہی یونیورسٹی میں بی۔ اے۔ کی ڈگری سے نیچے کی تعلیم دینے والے چھوٹے چھوٹے اقامتی کالج شامل ہونے چاہئیں جو ایک خاص دائرے میں واقع ہوں۔ ان میں ماہرانہ اور یونیورسٹی کے درجے کی تعلیم دینے کی

کا ماحول نہیں ہے۔ اس لئے اس علاقے کے بعض خطوں میں زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں (مثلاً کم زمین سے زیادہ سے زیادہ فصل پیدا کرنے کے طریقے) پرتی زمین کو زیر کاشت لانے، منظم طریقے پر گھریلو صنعتوں کے فروغ اور محدود ولادت (فیملی پلاننگ) کے رواج کی بڑی شدید ضرورت ہے۔

دیہی یونیورسٹیوں کا منصب

دیہی یونیورسٹیوں کو اپنا حق پورا پورا ادا کرنا ہے اور ایسے لوگ تیار کرنا ہیں جو مذکورہ بالا خدمت کو انجام دینے کے لئے اچھی طرح تیار ہوں اور مختلف سمتوں میں کام کر سکیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سماجی اور طبعی علوم کی طرح کے معاشرتی علوم (Humanities) کی تعلیم دیہی یونیورسٹیوں کے نصاب سے سرے سے خارج کر دی جائے بہت سے نوجوان طالب علم ایسے بھی ہوں گے جو خالص علمی مضامین اونچی تعلیم حاصل کرنے کے ذہنی طور پر اہل ہوں گے اُن کو ان مضامین میں مہارت حاصل کرنے کے موقع سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ایسے طالب علم تعداد میں بہت کم ہوں گے اس لئے ان خالصۃً علمی مضامین کی تعلیم محدود پیمانے پر ہونی چاہئے۔ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم جو موجودہ حالات میں خالصۃً علمی مضامین کی تعلیم کے لئے مارا مارا پھرتا ہے اس کے ذہن کو اُن مضامین کی طرف پھیرنا چاہئے جن کی گھریلو صنعتوں کے لکاس میں ضرورت ہے مثلاً زراعت، مویشیوں کا علم، صحت و صفائی، دیہی معاشیات، سیلاب کی روک تھام کا فن، اور پیشوں اور صنعتوں کی تعلیم وغیرہ۔ ایسی کوئی دیہی یونیورسٹی جسے مذکورہ بالا فنون میں تعلیم کی آسانیاں میسر آسکتی ہوں، عام یونیورسٹیوں کی بہ نسبت —— جہاں خالصۃً علمی مضامین کی تعلیم ہوتی ہے —— زیادہ مہنگی اور صرفہ طلب ہوں گی لیکن یہ سودا اگرچہ مہنگا معلوم ہوتا ہے مگر ہے بہت نفعے کا۔ رہا وسائل کا معاملہ تو اس طرح کی کسی نئی یونیورسٹی کو کسی ایک واحد ذریعہ آمدنی کا محتاج بنانا بھول ہوگی۔ اس کو سہارا دینے کے لئے سرمایہ متعدد راستوں اور ذریعوں سے حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ریاستی حکومتیں بھی روپیہ دیں، مرکزی حکومت بھی، اور ہو سکے تو لوگ بھی اوقاف اور عطیات کی شکل میں مدد کریں۔ وسائل کے باب میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ آگے چل کر جب تعلیم کی تمام اسکیموں پر پورا پورا عمل ہونے لگے گا، اس وقت زراعت اور صنعتی علوم کی تعلیم کے نتیجے میں جو پیداواریں ہوں اُن سے آمدنی ہونے لگے، لیکن اسکیم کی ابتداء میں یہ سمجھ لینا کہ دیہی یونیورسٹیاں اپنا خرچ آپ اُٹھانے والے ادارے ہوں گے، نا سمجھی ہوگی۔

دیہی یونیورسٹی کے وسائل

دیہی یونیورسٹی کے ارتقا میں جو مسئلے حائل ہیں وہ معمولی اور سیدھے سادے نہیں ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ

فلپائن میں نوجوانوں کی بہبود

غیر نصابی تعلیم کے ذریعہ

پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں اور اب وہاں کے نوجوانوں اور ان کے مسائل پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تبدیلیاں بعض معاملات میں اتنی تیزی سے رونما ہوئی ہیں کہ بیشتر نوجوان ان سے فائدہ اٹھانا تو دور رہا، ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھ بھی نہیں پاتے ہیں۔

سیاسی آزادی نے ان نوجوانوں کے لئے جہاں حقوق کے نئے نئے دروازے کھولے ہیں وہاں ان کے اوپر نئی نئی ذمہ داریاں بھی عاید کردی ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ اور مسلسل خانہ جنگی نے ان کی زندگی کو ہر میدان میں خواہ وہ زراعت کا میدان ہو یا صنعت کا یا گھر بار کا۔ اطمینان اور آرام کی زندگی کی تلاش میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے نظر آتے ہیں۔ نوجوانوں کی بے چینی اور پریشاں حالی۔ سیاسی پارٹیوں کا عروج وزوال اور اقتدار کے لئے ان کی باہمی جدوجہد اور اسی طرح کے دوسرے مسائل نے حکومت کی پالیسی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ حکومتیں اپنی پالیسی کی تشکیل کرتے وقت عوامی بہبود کو پالسی کی بنیاد کی حیثیت دینے لگی ہیں۔ بڑی بڑی صنعتوں، ملوں اور فیکٹریوں کے قیام سے شہروں کی آبادی گنجان ہوگئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شہروں میں گھٹن کا عنصر بڑھ گیا ہے اور صحت وصفائی کے نئے نئے مسائل سامنے آگئے ہیں۔

دوران جنگ میں فلپائن ہی کیا تمام غلام ملکوں میں دشمنوں اور ان کے حلیفوں کی طرف سے نفرت کی جو ایک عام ذہنیت پیدا ہوگئی تھی جنگ کے خاتمے کے ساتھ ختم نہیں ہوئی بلکہ بہت دنوں تک جوں کی توں باقی رہی اور ان کی زندگی کی قدروں اور سوچنے کے طریقوں کو بھی متاثر کرتی رہی۔ ان ملکوں کی قدیم تہذیب اور رسم ورواج پر مغربی تہذیب اور جدید مغربی رجحانات کے اثر نے بھی نوجوانوں کے ذہن میں ایک الجھن پیدا کردی ہے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی روایاتی زندگی اور پرانی قدروں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے ان سب چیزوں کی جو مغربی معلوم

سہولتیں، تو وہ مرکز میں فراہم کی جانی چاہئیں۔ ان ملحقہ اقامتی کالجوں میں طلبار کی تعداد کالج پیچھے تین سو تک اور ان کی اور یونیورسٹی کے طلبار کی کل تعداد زیادہ سے زیادہ ڈھائی ہزار تک ہونی چاہیے۔" ان دیہی یونیورسٹیوں کے طلبار کی مجموعی تعداد آج کل کی بعض یونیورسٹیوں کی تعداد کی طرح بہت زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے اسباب کھلے ہوئے اور نہایت بدیہی ہیں۔ دیہی یونیورسٹی میں طالب علموں کی تعداد محدود ہو، اس کی منصوبہ بندی خوب سوچ سمجھ کر کی گئی ہو، ہر قسم کے سازوسامان سے آراستہ ہو اور اس کا قیام یقینی اور مستحکم ہو، تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس یونیورسٹی سے نکلنے والے طلباء کے ذہن و دماغ ایک ایسے سانچے میں ڈھل جائیں گے جو ملک کی ترقی اور بکاس کی تحریک میں جم کر اور دل لگاکر کام کرنے کے اہل ہوں گے۔

(ایجوکیشن کوارٹرلی کے شکریئے کے ساتھ)

اُس نے ساری دنیا کے بنی نوع انسان کے لئے کیا ہے ایک ایک فرد کے لئے کم سے کم ایک ایسی زندگی گذارنے کے حق کی ضمانت کی گئی ہے جس سے کہ وہ اپنے کنبے والوں کے ساتھ خوش حال اور صحت مند زندگی گذار سکیں۔

اپنے اس حق کو پانے کے لئے ان پس ماندہ علاقوں کے نوجوانوں کو ابھی کافی جدو جہد کرنی ہے۔ فلپائن جیسے گھنے ملک میں جہاں انسانوں کا بوجھ زمین پر بہت زیادہ ہے زندگی نسبتاً دشوار ہوتی ہے۔ پھر زراعت کے پرانے اور دقیانوسی طریقے، سیلاب اور طوفان کے مسلسل حملوں نے زندگی کو اور دوبھر بنا دیا ہے۔

معیارِ زندگی کو اونچا اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ سماج کی ضرورتوں اور افراد کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر پیشہ ورانہ تربیت کو تعلیم کا ایک لازمی جز قرار دے دیا جائے۔ بدقسمتی سے آج بھی ان ملکوں میں سفید پوشی کے کام عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور لوگ ان ہی کاموں کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج اونچے عہدوں کی تلاش و جستجو میں بیکار آدمیوں کی ایک فوج سی اکٹھا ہو گئی ہے جو سماج کے لئے بالکل ناکارہ ہیں۔ کالجوں میں دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم اس کے باوجود کہ یہاں زراعت ہی عام پیشہ ہے بیشتر قانون اور دوسرے علمی مضامین یقیناً پسند کرتے ہیں اور بہت کم زراعت کو ایک مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ یہ ایک مشکل اور دشوار مسئلہ ہے۔ خاص طور سے یہ دیکھتے ہوئے کہ معیار زندگی کو اونچا اٹھانے کے لئے ملک میں دستیاب قدرتی ذرائع کی زیادہ سے زیادہ ترقی اور استعمال ضروری ہے۔

سماجی ذمہ داری کی تعلیم

سماجی گروہ کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی جو ذمہ داریاں ہیں اس کے لئے نوجوانوں کو پوری طرح تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ان کی تعلیم میں سماجی تعلقات کی معلومات بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ یہ تعلقات آئندہ چل کر اور بھی پیچیدہ ہوتے جائیں گے۔ یہ تعلیم دراصل گھر کے اندر ہی شروع ہونی چاہئے۔

فلپائن ایک زراعتی ملک ہے اور زراعتی ملکوں میں آج بھی خاندانی بندھن بہت مضبوط ہیں۔ یہاں کا نوجوان طبقہ ان بندھنوں کی قدر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کالج کے لڑکوں میں یہ بات بہت عام ہے کہ وہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر کسی کام پر لگ جاتے ہیں جس سے کہ وہ اپنے خاندان والوں کو کچھ سہارا دے سکیں۔

نوجوانوں کو جماعتی زندگی میں ایک خاص جگہ حاصل ہونی چاہئے۔ دیکھا گیا ہے کہ گھر کے معاملوں میں جب انھیں پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ والدین اس سے بہت ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور ہر بات میں اس

ہوتی ہوں اندھی تقلید شروع کر دی ہے۔ ایسے نوجوان اور بزرگ تعداد میں بہت زیادہ ہیں جو ابھی تک تذبذب اور پس وپیش میں پڑے ہوئے ہیں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے ہیں کہ انھیں کن باتوں کو اختیار کرنا چاہئے اور کن کن چیزوں کو ترک کر دینا چاہئے۔ کچھ لوگ جو زندگی کی مادّی قدروں پر یقین رکھتے ہیں وہ زندگی کے اونچے مقاصد سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ مثال کے لئے شہروں کی زندگی میں روپے پیسے اور اس سے حاصل ہونے والی چیزوں کی بھوک دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ سنیما اور پرچار کے دوسرے ذرائع ان اخراجات کے لئے انھیں آمادہ کرتے ہیں ایک کالج کے لڑکے سے دریافت کرنے پر کہ وہ آج کے نوجوانوں کی سب سے بڑی ضرورت کیا سمجھتا ہے فوراً جواب ملا "پیسہ" اتنا ہی نہیں گاؤں میں بھی جہاں زندگی میں اتنی الجھنیں اور پیچیدگیاں نہیں ہیں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں محض سن کر ان بہت سی چیزوں کی خواہش کرنے لگے ہیں جن چیزوں کو انھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اچھی زندگی کے لئے تعلیم

زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے سب سے اچھا زمانہ شباب کا زمانہ ہوتا ہے اس زمانے میں انسان اگر چاہے تو وہ اپنی زندگی کو ذرا احتیاط برت کر بہت خوشگوار بنا سکتا ہے۔ اور جو لوگ عوام کی بھلائی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ہر نوجوان میں وہ جوش اور اُمنگ پیدا کریں اور انھیں جسمانی ذہنی اور روحانی صحت روزگار دھندوں اور فرصت کے اوقات کو ٹھیک ڈھنگ سے استعمال کرنے کی تعلیم دیں

لوگوں کو صحت مند زندگی کی تعلیم دینے کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ صحت و صفائی سے متعلق اچھی اچھی اور باتصویر کتابیں اور چارٹ بنا کر لوگوں میں تقسیم کئے جائیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ اس طرح کی غذا استعمال کرنے اور اس طرح کی عادت پر عمل کرنے سے وہ صحت مند اور توانا رہ سکتے ہیں۔ یہ احساس پیدا ہو جانے پر ہی وہ ان ضروری باتوں کی احتیاط برتیں گے جو ایک صحت مند زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہیں۔ ایک آدمی کی صحت اور جسمانی گٹھن کا تعلق اُس ساری بستی اور جماعت کی زندگی کے ساتھ بھی ہوتا ہے جس جماعت میں وہ اُٹھتا بیٹھتا اور رہتا سہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی بہبود کے مسائل دُنیا کے ان حصّوں میں جو پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں بہت شدید صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ان علاقوں میں جہاں آج بھی ہزاروں اور لاکھوں انسان روکھی سوکھی پر گذارہ کر رہے ہیں، افلاس اور قحط، بیماری اور گندگی جہاں زندگی کا جزبن گئی ہیں بیماری کی روک تھام کے کام ان علاقوں میں اب ہونا شروع ہوئے ہیں۔ بین الاقوامی انجمن کے اُس اعلان میں جو

نوجوانوں کے بیچ ایک ایسی لیڈر شپ کی ضرورت ہے جوان کی سوجھ بوجھ اور صلاحیتوں پر پوری طرح بھروسہ رکھتی ہو۔ پرانی اور دقیانوسی قسم کی لیڈرشپ ان کے لئے مہلک ہوگی۔

اس طرح کی رہنمائی کے لئے بلاشبہ گھر ہی سب سے اچھی جگہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے آج بھی فلپائن کے بیشتر گھروں میں وہی پرانا ڈھنگ برتا جارہا ہے جس میں بس گھر کے بڑے بوڑھوں کی ہی چلتی ہے۔ والدین ایسے وقت میں ان سے بہت ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان میں کوئی خاص دلچسپی ہی لیتے ہیں جبکہ نوجوان اپنے اندر طرح طرح کی تبدیلیاں محسوس کرتے ہیں اور قدم قدم پر انھیں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں نوجوانوں اور بزرگوں میں ایک کشیدگی بڑھنے کا امکان ہوتا ہے اور کبھی ان کے بہت خطرناک نتائج بھی سامنے آئے ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے نوجوانوں کی انجمنیں بہت تیزی سے بننا شروع ہوئی ہیں اور ان کی سرگرمیاں اب کافی پھیل چکی ہیں۔ اس سے نوجوانوں کے لئے غیر رسمی تعلیم کے مواقع جو اب تک گھر ہی میں حاصل تھے، اور ملے ہیں۔ یہ انجمنیں زیادہ تر رضاکارانہ انجمنیں ہیں جن کا سماج کے اوپر خاصہ اثر ہے۔ اسکاؤٹ لڑکوں اور اسکاؤٹ لڑکیوں کی جماعتوں، نوجوان عیسائیوں کی انجمن (Y.M.C.A) اور عیسائی عورتوں کی انجمن (Y.W.C.A)، جونیر ریڈ کراس، کیتھولک نوجوانوں کی انجمنوں اور فلپائن کے گرجا گھروں کی انجمنوں کے نوجوانوں کے سیکشن؛ یہ ساری کی ساری جماعتیں نوجوانوں کی ضرورتوں اور ان کی دلچسپیوں کا سامان اپنے اپنے مقصد کے مطابق اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر فراہم کرتی ہیں

پیشوں کے انتخاب میں نوجوانوں کی مدد کرنے کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نوجوانوں کی رہنمائی کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ لوگوں کی اقتصادی حالت، ان کی ذاتی صلاحیت بستی اور جماعت کی ضرورت اور وہاں ملنے والی سہولتوں اور موقعوں کو دھیان میں رکھ کر ہی لوگوں کو مشورہ دیں۔ بدقسمتی سے یہاں نوجوانوں کے سامنے سب سے مشکل اور دشوار مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے برسوں کی تیاری کے باوجود اُس ڈھنگ کا کام ملنا یقینی نہیں ہوتا جس ڈھنگ کا کام وہ کرنا چاہتے ہیں۔ فلپائن کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے ہر سال ہزارہا طالب علم مختلف فنون کی تربیت پاکر نکلتے ہیں۔ مگر ان سب کے لئے اُس مقدار میں کام کا بندوبست نہیں ہوسکا ہے۔

بہت سی انجمنیں اور دوسرے سماجی ادارے اسکول سے فارغ ہونے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے

کامشورہ بھی شامل کرتے ہیں تو اس کی شخصیت اُبھرتی ہے اس میں خود اپنے اوپر بھروسہ پیدا ہوتا ہے۔ گھر کے باہر جب بستی میں اُسے یہی حیثیت حاصل ہوتی ہے تو اس سے اس کے اندر ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ایک نوجوان کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی جماعت والے ہر معاملہ میں اس کی رائے پوچھتے ہیں، اس کی باتوں کا احترام کرتے ہیں اور اس کی عدم موجودگی انھیں بُری طرح کھلتی ہے۔

مگر اتنا ہی کہ سماج اُنھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے کافی نہیں ہے۔ نوجوانوں میں اپنے فرض کو سمجھنے اور انھیں نبھانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہئے۔ نوجوانوں کے لئے یوں تو بہت کچھ کیا جاتا ہے مگر اس میں اُن کی اپنی مرضی اور مصلحت کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب یہ بات محسوس کی جانے لگی ہے۔ فلپائن میں مثال کے طور پر حق رائے دہندگی کے لئے کم سے کم عمر ۲۱ سال رکھی گئی ہے۔ اب اُسے کم کرکے ۱۸ سال کر دینے کی تجویز زیر غور ہے۔ پچھلے عام انتخابات میں یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ نوجوان کس طرح قومی معاملات میں کھل کر حصہ لے سکتے ہیں۔ ۲۱ سال سے اوپر والوں نے تو ووٹ دیئے ہی جو اس سے کم عمر والے تھے انھوں نے بھی انتخاب میں کافی دلچسپی اور گرمجوشی کا ثبوت دیا۔ وہ گھر گھر جاکر لوگوں کو ووٹ کی اہمیت بتاتے اور ووٹ دینے کے لئے انھیں پولنگ اسٹیشنوں پر لاتے۔

روزانہ اخبار دیکھنے کا شوق فلپائن کے نوجوانوں میں ابھی بہت کم ہے اور خبروں پر غیر جانبدارانہ اور تنقیدی بحث کرنا تو اور بھی کم۔ بہت سے طلباء تو بس شاذ و نادر ہی اخبار پڑھتے ہیں جبکہ ان کے اساتذہ کوئی خاص خبر یا کوئی خاص مضمون پڑھنے کی اُنھیں صلاح دیتے ہیں۔ اسکولوں سے نکلنے کے بعد یہ موقع اور بھی کم ملتا ہے۔ گاؤں کے نوجوانوں کے لئے تو اخبار کا پالینا ہی قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ موٹی موٹی سرخیوں والی سنسنی خیز خبریں ہی لوگوں کو زیادہ متوجہ کرتی ہیں اور لوگ انھیں ہی زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور ملک اور زمانے کی خبروں سے بیشتر نوجوان بے خبر ہوتے ہیں۔ جوان عورت و مرد میں سماجی ذمہ داری کا احساس ...... پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں اخبار و رسائل میں شائع ہونے والے اچھے اچھے مضامین اور خبروں پر تبصرے وغیرہ پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ نوجوانوں کی ایسی بھرپور رہنمائی کی ضرورت ہے جس سے کہ وہ آج کے پیچیدہ مسائل اور اس کی ضرورتوں کے مطابق اپنے سامنے کچھ مقصد قائم کر سکیں پھر وہ مقصد ایسے ہوں جو ان کی روایاتی زندگی سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہوں۔ انھیں اپنے متعلق فیصلہ کرنے کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے، بزرگوں کا کام محض دور سے ان کی مدد کرنا ہے۔

زندگی اور اس کے مسائل کو حقیقی پس منظر میں دیکھ سکیں۔ نوجوانوں اور خاص طور پر ان نوجوانوں کو جو اپنی تعلیم ختم کر چکے ہوتے ہیں، ایک خاص طرح کی ٹریننگ دی جاتی ہے جس سے کہ وہ گاؤوں میں لوٹنے کے بعد گاؤں سدھار اور اسی طرح کے دوسرے تفریحی، تہذیبی کلب قائم کرکے گاؤں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گاؤں کی زندگی سے متعلق لوگوں کو عملی جانکاری اور عملی تربیت دینے کا ایک دوسرا ذریعہ ورک کیمپ ہیں۔ گذشتہ کئی سال سے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے، اسکاوٹ لڑکوں کی انجمن اور فلپائن کے گرجاگھروں کی نوجوانوں کی انجمن نے ۳۰ سے ۴۵ طالب علموں کے لئے زراعت، نرسنگ، فن خانہ داری، مچھلی پالنا، دستکاریاں اور سماجی علوم کے مختلف کیمپ لگائے ہیں۔ ان کیمپوں میں جو طالب علم حصہ لیتے ہیں وہ گاؤں والوں کے بیچ رہ کر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سدھار کا کام کرتے ہیں۔

نوجوانوں کے لیڈروں کی تربیت میں دوسری اور چیزوں کے علاوہ اجتماعی مباحثے، جماعتی گانوں میں اگوائی۔ جماعتوں کی تنظیم اور ان کے کام سے متعلق اصولی اور عملی واقفیت۔ ممبروں کا تقرر اور پروگراموں کی تیاری وغیرہ شامل ہونی چاہئے۔

نوجوانوں کو پیشہ ورانہ کارکنوں کے ساتھ کانفرنس وغیرہ کی تیاری میں بھی حصہ لینا چاہئے، جس سے کہ پروگراموں کی تیاری میں اس کی جمہوری شکل قائم رہے۔ ان کانفرنسوں کا مقصد اگر نوجوانوں کو تبادلۂ خیالات کا موقع دینا ہے تو ان کانفرنسوں کے بعد نتیجوں کی روشنی میں کام کو جاری رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے ایک آدمی میں اس وقت جب وہ کسی کانفرنس یا کورس میں شرکت کر رہا ہو، اس کام کیلئے لگن اور جوش ہو مگر یہ جوش بعد میں ٹھنڈا پڑ سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بعد میں نوجوانوں کے لیڈر اس سلسلے میں برابر ان کی رہنمائی کرتے رہیں۔

نوجوانوں کی تعلیم کے لئے حکومت کی ذمہ داری

حکومت کے ان محکموں کے علاوہ جو براہ راست نوجوانوں کی تعلیم کا اہتمام کرتے ہیں (جیسے محکمہ تعلیمات) ...... کچھ دوسرے محکمے بھی نوجوانوں کی فلاح و بہبود کا کام کرتے ہیں اور اس تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں انھیں اپنی جگہ بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ویلفیر ڈپارٹمنٹ اپاہجوں، محتاجوں، جرائم پیشہ بچوں، جسمانی اور ذہنی اعتبار سے کمزور اور معذور انسانوں کی نگہداشت کا کام کرتے ہیں۔ محکمۂ زراعت کے توسیعی پروگراموں کے تحت

لئے مخصوص تقریروں کا انتظام کرتے ہیں۔ ان تقریروں میں ان کی اس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں تعلیم ختم کرنے کے بعد کیا کرنا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف پیشوں سے متعلق جو کتابچے روٹری کلب کی طرف سے تقسیم کئے جاتے ہیں بہت مفید رہے ہیں۔

نوجوان لیڈروں کی تربیت

لوگ ایک ایسے سماج میں جو دن بدن پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے سکھ اور چین سے زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو انھیں ان بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہوگا جو ایک خوشگوار سماجی زندگی کے لئے ضروری ہیں معلموں اور سماجی کام کرنے والوں کو ان سب طریقوں سے وقفیت ہونی چاہیئے جو طریقے کہ افراد کے لئے اجتماعی زندگی کے تجربوں کی بنیاد پر آگے بڑھنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

وائی۔ ایم سی۔ اے اور وائی۔ ڈبلیو سی۔ اے۔ کی مشترکہ کوششوں سے ہر سال طالب علموں کی ایک نیشنل کانفرنس منعقد ہوتی ہے، جس میں فلپائنس کے مختلف علاقوں سے طالب علموں کے رہنما اور نمائندے شرکت کرتے ہیں۔ نوجوانوں کی بہبود پر پہلی کانفرنس سنہ ۱۹۵۱ء میں حکومت کے ویلفیر ڈپارٹمنٹ کے اہتمام میں منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں اسکولوں اور نوجوانوں کی مختلف انجمنوں کے کوئی ۰۰ ۔ نمایندے شریک ہوئے تھے جنھوں نے نوجوانوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کے بارے میں بات چیت کی۔

صیح قسم کی رہنمائی سے اتنا ہی نہیں کہ لوگوں کو اپنی ضروریات کا احساس ہو جاتا ہے بلکہ انھیں حاصل کرنے میں ان کی جو صلاحیتیں اور ان کی جو کمزوریاں ہیں وہ بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اس سے وہ اپنی زندگی میں ایک مقصد قائم کر لیتے ہیں اور اس مقصد کو پانے کے لئے اپنی جدوجہد کے راستے بھی متعین کر لیتے ہیں۔ نوجوانوں کے رہنماؤں کو اپنے کام سے اتنی دلچسپی ہونی چاہئے کہ اس سے مشورہ لینے والے جب ان کے پاس آئیں تو وہ خود بھی ان کی مشکلات کو سمجھیں اور انھیں دور کرنے میں ان کو مدد دیں۔

دیہی علاقے کی سب سے بڑی ضرورت اس وقت گاؤں میں مقامی رہنماؤں کو تیار کرنے کی ہے۔ جو زندگی کے مختلف شعبوں میں گاؤوں کی رہنمائی کر سکیں۔ اس سلسلے میں وائی۔ ایم سی۔ اے۔ گاؤوں کے لیڈروں کے لئے جو تربیتی پروگرام چلاتا ہے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد گاؤں کے نوجوانوں کے سامنے فلپائن کی دیہی زندگی کے سماجیاتی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی پس منظر پیش کر دینا ہوتا ہے جس سے کہ وہ گاؤوں کی

نظم

اُٹھے ہم وطن سے جہالت مٹانے

دلوں میں اُمنگیں، لبوں پر ترانے
اُٹھے ہم وطن سے جہالت مٹانے

چلے ہم کنول زندگی کے کھلانے
سیہ رات کے دل میں دیپک جلانے

چلو ساتھیو اپنی قسمت جگانے
بڑھو، علم کے لُٹ رہے ہیں خزانے

کبھی اب نہ آئیں گے ہم کو ستانے
یہ غم زندگی کے نئے یا پُرانے

یہ بیماری، یہ گندگی، یہ غریبی
اُٹھے آج ہم ان سے دامن چھڑانے

غریبی کے کارن یہ اُجرا سا جیون
ملیں اور اُس پر جہالت کے طعنے

پڑھیں گے، لکھیں گے، ہم انساں بنیں گے
بڑھیں گے زمانے سے آنکھیں ملانے

ہم آرام تج دیں گے، دُکھ جھیل لیں گے
مگر وقت پڑھنے کا دیں گے نہ جانے

یہ دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے
ہم اب تک نہ سمجھے ترقّی کے معنے

ہمیں کیا خبر کون تھے میرؔ و غالبؔ
اک اَن پڑھ کہاں سورؔ و تلسیؔ کو جانے

وطن میں ابھی ستّر ہیں اسّی ہیں جاہل
کہاں جائیں ہم شرم سے منہ چھُپانے

اگر دیش رکھنا ہے آزاد تم کو
تو اُٹھو رفیقؔ ان پڑھوں کو پڑھانے

گاؤں میں فور ایچ کلب قائم کئے جاتے ہیں جس سے کہ ان علاقوں کے ہر نوجوان کو اپنی بستی کی زندگی میں سدھار لانے کا کچھ نہ کچھ موقع مل سکے گاؤں کے نوجوانوں کے بیچ صحت و غذا کا پروگرام محکمۂ صحت چلاتا ہے۔ نوجوانوں کی بہبود کے مختلف کاموں میں تال میل پیدا کرنے کی غرض سے فلپائینس کے صدر نے اپنے محکمے کے زیر نگرانی طلبا کی ایک مشاورتی کمیٹی قائم کی ہے۔

کوئی بھی ملک نوجوانوں کی طرف سے غفلت برت کر پھل پھول نہیں سکتا ہے۔ آج نوجوانوں کی ضرورتوں کی طرف مقامی، ملکی اور بین الملکی سطح پر جو توجہ دی جانے لگی ہے، امید کی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ سرگرمیاں اور بھی پھولے پھلیں گی اور دنیا ان کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گی جو ان کا جائز حق ہے۔ نوجوانوں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور انھیں زندگی کے ان سبھی ساز و سامان سے آراستہ کئے بغیر جو ایک اچھی زندگی اور ایک اچھے سماج کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں ہم وہ راحت اور اطمینان کی زندگی نہیں گزار سکتے جسے ہم نے اپنی آئندہ زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔

جو کہانی میں سنانے والا ہوں اس کا غالباً سب سے زیادہ دلچسپ پہلو وہ متعدد اور متضاد انسانی عناصر ہیں جو اس مہم میں شریک تھے۔

میں ابھی حال میں وہاں گیا تھا اور اس ڈرامے کے قریب قریب سب ایکٹروں سے ملاقات کی تھی۔ قریب قریب سب نے اپنے اپنے انداز میں اس جہاد کی کہانی سنائی۔

گاؤں میں ایک سن رسیدہ ہیڈ ماسٹر صاحب رہتے ہیں، نہایت مخلص اور سادہ رو گوالیار کو جانے والی سڑک کو بڑی بڑی چٹانوں اور جنگلات نے گھیر رکھا تھا۔ ان چٹانوں کو ہٹانے اور درختوں کو کاٹ گرانے کا منصوبہ ——— جو بظاہر ایک ناممکن سی بات تھی ——— انھی کا سجھایا ہوا تھا۔ گیجورا میں ایک پولیس چوکی قائم تھی۔ اس چوکی کے پولیس افسر جو یہاں مع بال بچوں کے آن رہے تھے، پولیس افسر کم اور سماج سیوک زیادہ تھے، اور لوگوں کو مشکل میں دیکھ اس کی مدد کے لئے پہنچنا ان کا طبعی رجحان تھا۔ تیسرے گاؤں کے موروثی مکھیا (پٹیل) صاحب تھے۔ انھوں نے بھی اس اسکیم کو سہارا دیا جو بظاہر محض ایک خیالی سی بات تھی۔ چوتھا عنصر گرام سیوک کی شخصیت کا تھا جو ۱۲ گاؤں کے حلقے کا انچارج تھا گیجورا بھی اسی حلقے میں پڑتا تھا۔ اس نے خود گیجورا والوں اور دوسرے گاؤں کے لوگوں کو بھی اس مہم میں مدد دینے کے لئے آمادہ کیا، اور اسی کے ساتھ دوسری طرف، اس سلسلے میں بلاک ڈیولپمنٹ افسر کو بھی جو ڈابرا میں رہتے تھے، اس اسکیم سے دلچسپی دلائی۔

اگست ۱۹۵۷ء کی ایک صبح کو ایک سو والنٹیروں نے پہاڑی کے دامن پر ہلّہ بول دیا مگر چٹانیں پھر چٹانیں تھیں، ایک سو مردوں کے بھی قابو میں نہ آئیں۔ تھوڑی دیر تک کام کرنے کے بعد والنٹیر محسوس کرنے لگے کہ انھوں نے ایک ایسا کام ہاتھ میں لے لیا جو ان کے بس کا نہیں ہے۔ ٹھیک اُسی وقت بلاک ڈیولپمنٹ افسر حسبِ معمول آ پہنچے۔ وہ لوگوں کے جوش وخروش اور آمادگی سے متاثر تو بہت ہوئے مگر دل میں سوچا کہ یہ چٹانیں انسانوں کے قابو میں آنے والی نہیں ہیں چنانچہ انھوں نے بارود سے اڑا دینے والے آلات و اوزار کا انتظام کیا۔ اس انتظام سے کامیابی بہرحال یقینی ہو گئی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کئی ہفتے تک ان والنٹیروں کو محنت کرنے کی ضرورت تھی، اور کام ابھی تک ہو رہا ہے۔

اس مہم میں مختلف موقعوں پر ۳ ہزار تین سو بالغوں اور ۵۰۰ اسکولی لڑکوں نے کام کیا۔ اس سلسلے میں گاؤں کے آس پاس مختلف جگہوں پر کئی کیمپ ہوئے۔ ان کیمپوں میں گاؤں کے لوگوں، اُستادوں اور طالب علموں نے تو خیر شرکت کی ہی، جو بات خاص طور پر دلچسپ اور خلافِ معمول واقع ہوئی وہ یہ کہ ان کیمپوں میں پولیس کانسٹبلوں اور

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے۔ پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

گیجورا ڈابرا ڈیولپمنٹ بلاک کے ۱۶۷ گاؤوں میں سے صرف ایک گاؤں ہے۔ ڈابرا ڈیولپمنٹ بلاک جیسے اس وقت ملک میں دو ہزار سے کچھ اوپر اور بلاک ہیں جن میں اضافے کا سلسلہ جاری ہے یہاں تک کہ بہت جلد ہندوستان کے تمام گاؤں اسی طرح کے کسی نہ کسی ڈیولپمنٹ بلاک میں آجائیں گے۔ ڈابرا بلاک کا نصف علاقہ ہرسی ڈیم کے ذریعہ سیراب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ڈیم کی بدولت علاقے میں خوش حالی کی لہر دوڑ گئی ہے اور بہت سے گاؤوں میں بڑے پیمانے پر گنے کی کاشت ہونے لگی ہے۔ ڈابرا میں جو ابھی کچھ ہی دن ہوئے "ایک معمولی سا گاؤں تھا" اور اب قصبے کی صورت اختیار کر رہا ہے، ایک چینی مِل قائم ہوگئی ہے جس میں ایک ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔

گیجورا ڈابرا بلاک کے خشک حصے کے دوسرے سرے پر واقع ہے اور یہی وجہ ہے کہ ذرائع آب پاشی کے فیوض سے جن سے بلاک کا دوسرا حصہ فائدہ اُٹھاتا ہے، قطعاً محروم ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقے میں آباد ہے جو اکثر و بیشتر چوروں اور ڈاکوؤں کے حملوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ اس کے آس پاس .... کے گاؤوں کو بارہا لوٹا جا چکا ہے یہاں تک کہ لوٹ مار سے تنگ آکر ان گاؤوں کی آبادی اِدھر سے اُدھر ماری ماری پھرتی رہی ہے اور علاقہ بہت بڑی حد تک سنسان ہوگیا ہے۔ گیجورا کے پچھواڑے سے گوالیار کو جانے والی جو سڑک گذرتی ہے، وہ ابھی کچھ دن پہلے تک پہاڑی چٹانوں، جنگلوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی، گوالیار کے بعد گیجورا سے قریب ترین قصبہ ڈابرا کا ہے، مگر ڈابرا کو جو بٹیا جاتی ہے، اُسے برسات کے زمانے میں کئی مہینے تک دو چھوٹی چھوٹی ندیاں بند کئے رہتی ہیں اس لئے کہ ان کے اوپر کوئی پُل نہیں ہے۔

مگر ترقی و اصلاح کی جو لہر تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے، گیجورا تک بھی پہنچی اور اُس نے جو کارنامے دکھائے ہیں، وہ ڈیولپمنٹ پروگرام کے ماتحت کام کرنے والے ہزاروں لاکھوں گاؤوں کے کارناموں سے کسی حیثیت سے کم تر نہیں ہیں۔ یہاں مسائل اور ان کے حل دونوں کی کیفیت کسی قدر خلافِ معمول تھی۔ ذیل میں

کمیونٹی ڈیولپ منٹ پر نیشنل کانفرنس

۲۰ مئی سے ماؤنٹ ابو پر کمیونٹی ڈیولیپ منٹ کی نیشنل کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ یہ کانفرنس کئی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کمیونٹی ڈیولیپ منٹ پروگرام کے لئے جو نئی تنظیم بلونت رائے مہتہ کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں تجویز کی گئی ہے، اس کے بعد یہ پہلی کانفرنس ہو گی جن میں ان سفارشات .... پر غور و خوض ہوگا۔ اس کانفرنس میں کمیونٹی ڈیولیپ منٹ کی وزارت اپنا وہ منصوبہ پیش کرے گی جو اُس نے وِکاس کے کاموں میں لوگوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنے کی غرض سے تیار کیا ہے۔ اس پروگرام کے مطابق پنچایتوں اور بلاک کی مشاورتی کمیٹی کو اب پہلے سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی دقت جس کا سامنا کمیونٹی ڈیولیپ منٹ کی وزارت کو کرنا پڑ رہا ہے وہ ہے ضلع اور اُس کے نیچے کی سطح پر کسی جمہوری یا روایاتی اداروں کی عدم موجودگی ہے۔ ضلع بورڈوں سے کچھ کام اب تک لیا جاتا رہا ہے مگر وہ اب مختلف ریاستوں میں دھیرے دھیرے ختم ہو رہے ہیں۔

گاؤں کی سطح پر جو قدیم ادارے پنچایت وغیرہ کی شکل میں چلے آ رہے ہیں، کارکنوں کی صحیح تربیت کا چونکہ کوئی ٹھیک انتظام ابتک نہیں ہے اور نہ ہی انھیں ذات پات کی تفریق سے الگ کیا جاسکا ہے اس لئے گاؤں پنچائت اور کوآپریٹو کمیٹیوں کی بھی ٹھیک سے ترقی نہیں ہو پا رہی ہے۔

ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے جو ہمارے سماج کا اب حصہ بن چکی ہیں، کچھ طریقے تجویز کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وِکاس کے کاموں کے لئے پنچایت کی کچھ ذیلی کمیٹیاں بنائی جائیں اور انھیں مختلف کاموں کی ذمہ داری سونپی جائے۔ پنچایت کے ممبران کمیٹیوں کے داعی ہوں۔

بلاک ایڈوائزری کمیٹی، جس کی حالت اب تک ایک صلاح کار کمیٹی کی تھی، اُسے ختم کر کے بلاک ڈیولپمنٹ کمیٹی بنانے کی تجویز کی گئی ہے جس کے کاموں میں اب صرف مشورہ دینا ہی شامل نہیں ہوگا بلکہ مختلف کمیٹیوں کے ذریعہ

دوسرے سرکاری کارکنوں جیسے پٹواریوں اور پنچایتوں کے سکریٹریوں اور محاسبوں تک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سڑک پر جو کام ہو رہا تھا، وہ کیمپ میں شریک ہونے والوں کے لئے بہت سبق آموز ثابت ہوا، اور ان لوگوں نے صرف کیمپ کی زندگی ہی نہیں گذاری بلکہ کام میں عملاً شریک بھی ہوتے رہے۔

لوگوں نے جو محنت کی، اُس کی قیمت مبلغ چھ ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ اس کے علاوہ گاؤں والوں نے ڈیڑھ ہزار روپے نقد چندہ بھی دیا۔ چھ ہزار روپے بلاک کے فنڈ سے دیئے گئے۔

اگست ۵۷ء میں سڑک کو صاف کرنے کا کام شروع ہوا تھا۔ اُسی سال کرسمس کے دن یعنی چار مہینے کے بعد سڑک اس قابل ہوگئی کہ اس پر بہلیاں اور بیل گاڑیاں چلنے لگیں۔ سیدھے سادے دیہاتی اسی کو انجینیری کا معجزہ سمجھنے لگے۔ کچھ عرصہ ہوا ریاستی حکومت کے ایک وزیر صاحب اس موقعے کو ملاحظہ فرما گئے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ پی۔ ڈبلو۔ ڈی والے بھی اس کام میں دلچسپی لیں گے اور برسات شروع ہونے سے پہلے پہلے سڑک کو کوٹ پیٹ کر ہموار کر دیا جائے گا۔ گوالیار کو جانے والی سڑک غرض اب کھل گئی ہے اور ڈاکو حضرات کو بھی اس کی موجودگی میں اپنے جوہر دکھانے میں پس وپیش ہوگا۔ مگر آمد و رفت کے اس قسم کے ذرائع سے امن و امان کا ماحول تو پیدا ہوگا ہی، ان کی بدولت لوگوں کی خوش حالی میں بھی اضافہ ہوگا۔ گاؤں کے لوگ اس سڑک کے ذریعے ایندھن، چارہ گھاس، دودھ، گھی، پنیر، غلّہ اور تیل شہروں کو بھیج سکیں گے اور وہاں سے دوائیں، کپڑا، چینی اور ضرورت کی دوسری چیزیں اپنے یہاں لاسکیں گے۔

آگے چل کر اس کامیاب کوشش کا تعلیمی اثر بھی مترتب ہوگا، جو اتنا ہی کارگر ہمہ گیر اور سبق آموز ہوگا اور اس کی ابتداء ہو بھی گئی ہے۔ گاؤں کے لوگ ایک کوآپریٹیو سوسائٹی بنانے اور اس کے ماتحت گوالیار تک اپنی ایک بس سروس کھولنے کی بات سوچ رہے ہیں۔ سرکاری افسران بھی چھوٹے اور بڑے سب تجربے کی بنیاد پر سمجھ گئے ہیں کہ گاؤں کے لوگ اتنا ہی نہیں کہ سرکاری مہموں میں شریک ہو کر ان کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں، بلکہ ان کے اندر یہ صلاحیت بھی ہے ... مسائل کو اپنے آپ حل کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔

شفیق صاحب کی یادگار

عمارت کی تعمیر کا کام شروع

شفیق صاحب کی یوم وفات (۲ اپریل) سے شفیق میموریل بلڈنگ کا کام شروع ہوگیا ہے
اسی عمارت میں امرناتھ جھا کی یادگار میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جائے گا جس کے لئے مدھیہ پردیش حکومت نے سات ہزار روپے اور بہار اور راجستھان کی حکومتوں نے پانچ پانچ ہزار روپوں کے عطیے دیئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ کچھ دوسری ریاستی حکومتوں سے بھی عطیات موصول ہو سکیں گے۔

یہ یادگار جس پر تقریباً ۶ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی ایک سال کے اندر بن کر تیار ہو جائے گی۔ اس عمارت کا سنگِ بنیاد ایک سال پہلے ۲ اپریل ۱۹۵۷ء کو وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے رکھا تھا۔

گرام دان کے علاقوں کے کارکنوں کا کیمپ

گرام دان کے علاقوں کے ترقیاتی کارکنوں کا ایک کیمپ مارچ کے مہینے میں لمپ گدا (اڑیسہ) میں لگایا گیا تھا۔
اس کیمپ میں کوراپٹ (اڑیسہ) سے ۱۵ کارکنوں اور دوسری ریاستوں کے ۶ کارکنوں نے حصہ لیا۔ اس کیمپ میں دیہی انجینیری اور دوسری تعمیر و ترقی کے پروگراموں پر غور کیا گیا۔

کیمپ میں دوسرے جو لوگ آئے ان میں اڑیسہ کے سابق وزیر خاص شری نو کرشن چودھری، شری انہ صاحب سسٹر وید اور شریمتی ملاٹھی چودھری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دہلی میں خواندگی کی مہم

دہلی میونسپل کمیٹی ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں خواندگی کی مہم شروع کرتی ہے۔ جس میں اسکول کے لڑکے لڑکیاں بستیوں میں جاکر لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ اس سال دہلی کارپوریشن نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔
مہم کا افتتاح ۲۳ اپریل کی شام کو شریمتی سچیتا کرپلانی نے کیا۔ اس مہم میں ۹۰۰ طالب علم حصہ لے رہے ہیں۔ ڈیڑھ مہینے کی اس مہم میں جانے سے پہلے طالب علموں کو ابتدائی ٹریننگ دینے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

وکاس کے مختلف کاموں کی ذمہ داری بھی انھیں دی جائے گی اور روپیوں کی منظوری دینا جو اب تک افسروں کی ذمہ داری تھی وہ بھی انھیں سونپ دینے کی سفارش اس منصوبے میں کی گئی ہے۔

اس کمیٹی کے چیرمین کے بارے میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت کا خیال تھا کہ اس کے لئے علیحدہ سے کوئی مستقل عہدہ قائم نہ کیا جائے بلکہ ہر میٹنگ میں کوئی غیر سرکاری ممبر جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دے مگر یہ خیال ریاستی حکومتوں نے دو باتوں کے پیش نظر تسلیم نہیں کیا، ایک تو یہ کہ ضلع کلکٹر جو اس وقت جلسوں کی صدارت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ شاید اس سے اپنے اوپر وہ ذمہ داری نہ سمجھے جتنی کہ اس وقت وہ سمجھتا اور دوسرے یہ بھی ڈر ہے کہ شاید اس سے سرکاری افسران اپنے آپ کو بہت سی ذمہ داریوں سے بری سمجھنے لگیں۔

بلاک کمیٹی کے اوپر ضلع پلاننگ کمیٹی ہوگی جس میں اُس حلقے کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبر اور پنچایتوں کے کچھ نمایندے شامل ہوں گے اور کوشش کی جائے گی کہ اس سے بلاک کی سطح پر کمیٹی کی تشکیل میں جو جمہوری سلسلہ ذرا ٹوٹ سا جاتا ہے وہ پھر استوار ہو جائے۔

ایشیا میں ایڈلٹ ایجوکیشن کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس

یونیسکو کی ایڈلٹ ایجوکیشن کی ایڈوائزری کمیٹی نے یونیسکو کے سامنے ایک تجویز رکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایڈلٹ ایجوکیشن کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس ۱۹۶۰ء میں ایشیا کے کسی ملک میں منعقد کی جائے۔

یونیسکو نے تعلیم بالغان کے میدان میں جو کام اب تک کئے ہیں ان کاموں کی جانچ کرنے اور اُس کے نتائج کی روشنی میں کچھ ایسے طریق کار دریافت کرنے کی تجویز بھی رکھی گئی ہے جس سے کہ یہ کام موجودہ ذرائع کو لے کر زیادہ مؤثر اور مفید ڈھنگ پر کیا جا سکے۔

کمیٹی نے ایڈلٹ ایجوکیشن کی ایک بین الاقوامی انجمن کے امکانات سے متعلق اس کانفرنس میں غور کرنے کی سفارش کی ہے۔ ایک دوسری تجویز کے ذریعہ مغرب اور مشرق کے ملکوں کے تعلیم بالغان کے ماہرین کی ایک میٹنگ بلانے کی سفارش کی گئی ہے اور کمیٹی نے یقین ظاہر کیا ہے کہ اس طرح کی میٹنگ سے اُن مشترک تہذیبی قدروں کو سمجھنے کا موقع ملے گا جن کی تبلیغ و توسیع کے کام کو ایڈلٹ ایجوکیشن کے پروگراموں کا جز بنایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس میٹنگ میں مغربی اور مشرقی ملکوں کے تعلیم بالغان کے پروگراموں کا مطالعہ کر کے ان ملکوں کے غیر سرکاری اداروں اور یونیسکو کے تعاون سے ایک لمبی مدت کا پروگرام بنانے پر بھی غور کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔

تنقید و تبصرہ

بنیادی شِکشا سندرشکا (ہندی)

صفحات ۳۶۹۔ قیمت دو روپے ۸۷ نئے پیسے۔ ناشر وزارت تعلیمات حکومتِ ہند۔ ۱۹۵۷ء

بنیادی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر ماہرینِ تعلیم کے مضامین اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں بنیادی تعلیم سے متعلق نظریاتی بحث کی گئی ہے اور خواجہ غلام السیدین اور آئی۔ جی پیرین جیسے ماہرینِ تعلیم کے مضامین کے علاوہ ڈاکٹر کے۔ ایل شریمالی کا مضمون "مشینی دور میں بنیادی تعلیم" کئی ایک اہم سوالوں کو چھوتا ہے۔ دوسرے حصے میں نصاب کے مختلف مضامین کے پڑھانے سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے بہت کام کی ہے

ر۔ م۔ بش

کیریئرز ان سائیکالوجی Careers in Psychology

مصنف شری دھرم ویر۔ صفحات ۱۳۲۔ ناشر مانسائن۔ حوض قاضی دہلی ۶۔ ۱۹۵۸ء

پیشہ ورانہ رہنمائی (vocational guidance) کا کام ہندوستان میں اب شروع ہو چکا ہے اور اس کام میں اسکولوں کے لئے مشیروں (vocational counsellor) کو ٹریننگ بھی دی جا رہی ہے مگر اس میدان میں مختلف پیشوں سے متعلق اطلاعات فراہم کرنے والی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ زیرِ نظر کتاب ہندوستان میں پیشہ ورانہ اطلاعات فراہم کرنے والی اپنے ڈھنگ کی پہلی کتاب ہے، جس میں سائیکالوجی کو ایک فن کی حیثیت سے سیکھنے کے لئے آج ہندوستان میں کیا مواقع ہیں، کس کس طرح کے کورس کہاں کہاں چل رہے ہیں، نفسیات کی تعلیم کن یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں دی جاتی ہے، وغیرہ اطلاعات ایک جگہ فراہم کر دی گئی ہیں۔

دھرم ویر صاحب نے اس کتاب کو مرتب کر کے سائیکالوجی سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں اور بالخصوص اسکولوں میں طالب علموں کو مشورہ دینے والے اساتذہ اور نفسیات کا مطالعہ کرنے اور اُسے ایک فن کی حیثیت سے اختیار کرنے والے طالب علموں کی بڑی خدمت کی ہے۔ اگر کتاب میں چند مشہور ماہرینِ نفسیات اُن کا خاص شعبہ اور مقام بھی درج

۱۳ مئی کی شام کے اس افتتاحی جلسے میں سُچیتا کرپلانی کی افتتاحی تقریر کے علاوہ ایک بہت دلچسپ پروگرام وہ تھا جب ۱۵ سال کے ایک رکشا ڈرائیور نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایک کتاب پڑھ کر سنانا شروع کر دیا جو وہ لائبریری سے پڑھنے کے لئے لایا تھا۔

دہلی کے اُستادوں کا مبارک فیصلہ

دہلی میونسپل کمیٹی کے ڈھائی ہزار اساتذہ نے ایک اعلان کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ گرمی کی تعطیلات میں پانچ ہزار ان پڑھوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے اور اس سلسلے میں جو بھی خرچ آئے گا وہ اُسے خود برداشت کریں گے یہ فیصلہ خواندگی کی مہم کے افتتاحی جلسے میں سُنایا گیا۔

کر دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ اب بھی یہ کتاب اپنا مقصد بہت اچھی طرح پورا کرے گی۔

ڈاکٹر مدن لال شرما

رسید کتب و رسائل

۱۔ Educational and vocational guidance in Multipurpose schools
مصنفہ کے۔ جی۔ راما راؤ۔ صفحات ۶۶۔ قیمت ۷۵ نئے پیسے

۲۔ بنیادی شکشا سندرشکا۔ صفحات ۳۶۹۔ قیمت ۲ روپے ۷۵ نئے پیسے

۳۔ Propagation and development of Hindi a Review صفحات ۶۴ قیمت نہیں دی ہے۔

۴۔ The field of education صفحات ۷۲۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

۵۔ A Provisional list of technical terms in Hindi (Education)
صفحات ۶۴۔ ناشر وزارت تعلیمات حکومت ہند

۶۔ Know your country مصنفہ صادق علی، صفحات ۳۶ قیمت ۳۰ نئے پیسے۔ ناشر آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ ۷۔ جنتر منتر روڈ نئی دہلی

۷۔ بیس دن میں ہندی۔ مصنفہ ایف۔ ایچ۔ لوقان صفحات ۳۲۔ قیمت ۵ آنے۔ ناشر لوک شکشا پرکاش کلاں محل، دہلی

۸۔ اردو ٹیچر (ہندی کے ذریعہ اردو) مصنفہ فیاض حسین جامعی۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ۸ آنے۔ ناشر: قومی کتب خانہ اردو بازار۔ دہلی۔

۹۔ ماہنامہ جن شکشن۔ مجلس ادارت ڈاکٹر کالو لال شریمالی، شری کیسری لال، شری کیدار ناتھ شری واستو وغیرہ سالانہ ۵ روپے۔ ناشر ودیا بھون سوسائٹی اودے پور۔

۱۰۔ ماہنامہ سماج شکشن۔ مجلس ادارت دیوی لال گوڑ، بھوانی شنکر گرگ کلیان جیسانی۔ سالانہ ۴ روپے۔ ناشر راجستھان وشو ودیا پیٹھ۔ اودے پور۔

(مسلسل)



تعلیم و ترقی

The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI Registered No. D. 454,

...er and Publisher : BARKAT ALI Firaq Printed at [illegible] Printing Press Delhi.

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جلد (۹) جون ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر ۶

بانی: شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب، ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ، جامعہ نگر (نئی دہلی)

ٹیلی فون نمبر ۴۲۲۶۱

قیمت سالانہ: چار روپے

دیہاتی اسکولوں کے اُستاد اور سوشل ایجوکیشن

اس سال جون کے مہینے میں جن شکشا سنتھا گونڈہ اور انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن دہلی کے مشترک اہتمام میں سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا رحبنل سیمینار رشی کیش میں منعقد ہوا تھا۔ سیمینار کا موضوعِ بحث "سوشل ایجوکیشن میں دیہاتی اسکولوں کے اُستادوں کا منصب" قرار پایا تھا۔ دیہاتی اسکولوں کے اُستاد اور سوشل ایجوکیشن، یہ مضمون نیا نہیں ہے بلکہ بہت پُرانا ہے اور اُسی نسبت سے بہت زیادہ بحث طلب ہے۔ خیال تھا کہ سیمینار میں زیادہ تر دیہاتی اسکولوں کے اُستاد آئیں گے اور اُن کی موجودگی میں جو بحث ہوگی اور جو فیصلے کئے جائیں گے، اُن میں اصلیت کا پہلو زیادہ ہوگا۔ مگر ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہوئی۔ سیمینار میں حصہ لینے والوں میں شاید ہی کوئی ہوگا جو صحیح معنی میں کسی دیہاتی (پرائمری یا مڈل) اسکول کا اُستاد ہو۔ ایسی صورت میں سفارشات میں ظاہر ہے، عملی رنگ نہیں ہو سکتا۔

سیمینار کا ورکنگ پے پر وہیں سیمینار میں تیار کیا گیا تھا۔ ورکنگ پے پر کے سیمینار ہی میں ترتیب دیئے جانے کی بات بحث کا ایک الگ موضوع ہے کہ آیا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں، ہمیں اس وقت جو بات کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ جس ورکنگ پے پر کی بنیاد پر سیمینار میں گفتگو ہوئی، اس میں سے اگر وہ حصہ نکال لیا جائے جو اُستاد کے اپنے منصب یعنی بہ حیثیت اُستاد کے اس کے منصب سے متعلق تھا تو سوشل ایجوکیشن میں اس کے منصب سے متعلق حصہ بہت کم رہ جاتا ہے، اور جو کچھ رہ جاتا ہے، اس سے بھی ہمارا خیال ہے کوئی اُستاد متفق نہیں ہوگا اور نہ اس کے اوپر خوشی سے عمل کرے گا۔

سوشل ایجوکیشن میں اُستاد کا صحیح منصب

ہمارا خیال ہے کہ سوشل ایجوکیشن میں اُستاد کا جو صحیح منصب ہے ___ اُستاد چاہے دیہاتی ہو یا شہری ___ اس کی طرف ابھی غالباً توجہ ہی نہیں کی گئی ہے اور کم سے کم اس سیمینار میں تو اس کا بس ذکر ہی ایک آدھ جگہ آیا ہے۔

ترتیبِ مضامین

اشارات

اصول اور طریقے

تعارف

ضمیمہ بہ یادگار محترمہ صدیقہ قدوائی مرحومہ

تاثرات از

کوہ اللہ بار برقی پریس رسلی

یہ مسئلہ آیا تو ایک نمایندے نے جو کبھی کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے کہا "صاحب یہ تجربہ ہم کر چکے ہیں۔ والدین کو کسی جلسے میں بلائیے تو وہ آتے ہی نہیں"۔ تو صرف بلانے سے تو کسی بھی پروگرام میں کوئی نہیں آتا۔ سوال یہ ہے کہ بلانے والے صاحب چاہے وہ ہیڈ ماسٹر ہوں یا معمولی اُستاد، کسی بچے کے گھر بھی تشریف لے جاتے ہیں؟ گزارش یہ ہے کہ پہلے انجمن تو بنائیے اور اس کا اعتماد حاصل کیجئے، پھر بلائیے اور وہ نہ آئیں تو شکایت کیجئے۔

انجمن والدین کی تنظیم کی اسکول اور بستی کی ترقی کے باب میں اہمیت کے پیش نظر ایک ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ اسکولوں کے لئے یہ ضابطہ بنا دیا جائے کہ ہر اسکول میں والدین کی ایک انجمن بھی ہو اور اس کی رکنیت اور اُس کے جلسوں میں شرکت ہر بچے کے سرپرست کے لئے لازمی ہو۔ یہ قانونی ترکیب ہے جس میں جبر کا پہلو ہے۔ اگرچہ ہم تعلیم کے معاملے میں جبر کے حامی نہیں ہیں، تاہم اگر کام شروع کرنے کے لئے اس سے کام چل سکے تو اس میں کچھ بہت زیادہ مضائقہ نہیں لیکن صرف جبر ہی کے بھروسے پر کام کرنا مفید نہیں ہوگا، جبر کو صرف سہارے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، اور پھر اپنی سیرت شخصیت اور انسان دوستی کا جذبہ ہے جو کام دے گا اور جس کا اُستاد کی شخصیت زندہ مجسمہ ہوتی ہے۔

اور وہ ہے بچّوں کے والدین کی باقاعدہ تنظیم۔

اسکول کے اہتمام میں بچوں کے والدین کی تنظیم اور ان کی پرورش و پرداخت کے فن میں ان کی تربیت کا انتظام پبلک اسکولوں[1] میں ہو تو ہو، مگر اور کہیں نہیں ہے، حالانکہ تعلیم کے پنڈت بچّوں کی اور ان کے والدین کی انجمنوں اور اُن کے ذریعے اُن کی تربیت کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں ناخواندگی اور عام جہالت کا دور دورہ ہے، اسکولوں کے بچّوں کے والدین کی تنظیم اور اس تنظیم کے ذریعے ان کی تعلیم و تربیت ہمارے خیال میں اُن ملکوں سے زیادہ ضروری ہے جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے اور جہاں ناخواندگی اور جہالت کی جڑیں کھود کر پھینک دی گئی ہیں۔ سوشل ایجوکیشن کے نقطۂ نظر سے تو یہ اور بھی ضروری پروگرام ہے اس لئے کہ ملک کی بالغ آبادی، جسے ہم سوشل ایجوکیشن کا موضوع سمجھتے ہیں، اس کا آدھے سے زیادہ حصہ انھی بال بچے دار بالغوں پر مشتمل ہے اور وہی آج سماج کا اثر انداز عنصر ہیں۔

اگر اسکول کا اُستاد اپنی بستی کے بال بچّے دار لوگوں کا دوست اور معتمد علیہ بن جاتا ہے تو وہ اگر براہِ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر بستی کی اصلاح و ترقی کا اتنا کام کرے گا کہ سوشل ایجوکیشن کا براہِ راست کام کرنے والے بھی مشکل سے کر سکیں گے، شرط صرف اتنی ہے کہ وہ بچّے کے ماں باپ کو یہ بات ذہن نشین کرا دے کہ اگر وہ اپنے بچّے کے معاملے میں دلچسپی نہ لیں گے تو اس کے بگڑ جانے کا اندیشہ رہے گا، اور یہ بات وہی شخص ذہن نشین کرا سکتا ہے جو بچّے اور بالغ کی نفسی کیفیت سے واقف ہو۔

ہم ادارہ تعلیم و ترقی کے بالک ماتا سنٹر کے تجربے کی بنیاد پر بھروسے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر والدین کی انجمن منظم ہو جائے اور لوگوں کو منظم کرنے والے کے خلوص اور ہمدردی کا یقین ہو جائے تو انجمن والدین کی سرگرمیاں اسکول میں پڑھنے والے بچّوں ہی کی دیکھ بھال اور پرورش و پرداخت کے صرف اصول سیکھنے تک محدود نہ رہیں گی بلکہ ان کی انجام دہی کا ذمہ خود انجمن کے ممبران اپنی اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق اُٹھالیں گے۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ انجمن والدین منظم کس طرح کی جائے؟ سیمینار کی ایک بے ضابطہ صحبت میں جب

---

[1] لفظ پبلک اسکول یہاں تعلیمات کی ایک مخصوص اصطلاح کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ پبلک اسکول سے مراد ایسے اسکولوں سے ہے جہاں تعلیم کے جدید ترین اور اچھے سے اچھے ساز و سامان اور نہایت قابل اُستادوں کا انتظام ہوتا ہے۔ طالب علم صبح سے شام تک اسکول میں رہتا ہے اور یہ پورے دس بارہ گھنٹے تعلیمی ماحول میں گزرتے ہیں۔ ایسے اسکولوں میں عموماً رئیسوں اور بڑے لوگوں کے بچّے تعلیم پاتے ہیں اس لئے کہ یہاں تعلیم کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

تعلیمی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کرنا ہے تو ان ننھے ننھے بچوں کی طرف توجہ کرنا چاہئے جو ابھی اسکول نہیں جاتے اور ماں کی گود کے مکتب میں پلتے ہیں۔

بالک ماتا سنٹر کے تجربے کی تحریک تو اسی خیال سے ہوئی لیکن تجربے کے شروع ہونے میں شاید بہت دیر لگتی اگر اس کی پشت پر ایک اور خیال نہ ہوتا۔ شفیق صاحب کا بالغوں کی تعلیم کا تصور بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ وہ تعلیم کے مواقع سے محروم ہر طبقے کی تعلیم کو ——— خواہ وہ بالغ ہو، یا نو عمر لڑکا یا لڑکی، یا نرسری جانے کی عمر کا ننھا سا بچہ — اپنے "تعلیم و ترقی" کے تصور کے مطابق اس کے پروگرام کا جزو تسلیم کرتے تھے۔ وہ جس محلّے میں رہتے تھے، بیشتر غریب مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ آتے جاتے ان کی نظر دو دو تین تین سال کے ننھے ننھے بچوں پر پڑتی تھی جو ننگ دھڑنگ، یا سردی کا زمانہ ہوا تو چیتھڑے لپیٹے ہوئے، میلے کچیلے بے یار و مددگار گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ دراصل یہی منظر تھا جس نے شفیق صاحب کے دل میں اس تجربے کو شروع کرنے کے خیال کو پختہ ارادے کی شکل میں تبدیل کیا۔

جس وقت یہ تجربہ شروع کیا گیا اس وقت سنٹر کے سامنے کام کا نقشہ حسب ذیل تھا۔

۱۔ بستی میں تین سے پانچ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے کم خرچ پر نرسری کلاس چلانا تاکہ معمولی اور اوسط گھرانوں کے بچے اس تربیت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۲۔ بالک ماتا سنٹر کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کی تربیت میں ماؤں کی مدد کی جائے۔ سنٹر میں بچے کو جو ماحول اور تربیت ملے وہ اُسے گھر میں بھی میسّر ہو تاکہ تعلیم کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ بالک ماتا سنٹر میں مائیں بھی آئیں اور استانیوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ایک دوسرے کی مشکلوں کو سمجھیں اور بچوں کے عام مسائل کو مل جل کر حل کریں۔

۳۔ بالک ماتا سنٹر کا یہ بھی کام ہوگا کہ وہ گھروں کا ماحول بدلنے، ماؤں اور ہونے والی ماؤں کو گھر گرہستی کے مفید طریقے سیکھنے اور ان کی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں ان کی مدد کرے۔ چھوٹی عمر کے بچوں کی تربیت سے ماؤں کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے بالک ماتا سنٹر کو اپنے پروگرام میں ماؤں کی ٹریننگ کو بھی شامل کرنا ہوگا۔

۴۔ سنٹر کی یہ کوشش ہوگی کہ بالک ماتا سنٹر قائم کرنے اور انھیں چلانے کی ذمہ داری میں بستی کے لوگ پوری طرح شریک رہیں تاکہ آہستہ آہستہ وہ اپنے سنٹر خود چلانے لگیں۔

۵۔ بالک ماتا سنٹر کے ساتھ ایک ماتا سبھا ہوگی۔ ہر ماں کے لئے جس کا بچہ سنٹر میں داخل ہوگا، ماتا سبھا کی رکنیت لازمی ہوگی۔

بالک ماتا سنٹر سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں

اس کی اہمیت

سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں بالک ماتا سنٹر کی اہمیت کے باب میں کچھ کہنے سے پہلے عنوان کا تقاضا ہے کہ بالک ماتا سنٹر کا مقصد اور خود سوشل ایجوکیشن کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔

بالک ماتا سنٹر شفیق صاحب مرحوم کا بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں آخری تجربہ تھا جو ابھی تجربے ہی کی منزل میں تھا کہ ان کی رہنمائی سے محروم ہوگیا۔ اُن کے انتقال کے کچھ عرصے کے بعد ان کی بیگم محترمہ صدیقہ قدوائی مرحومہ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے اس منزل میں چھوڑ کر مری ہیں کہ اسے سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں نمایاں جگہ مل سکتی ہے۔

بالک ماتا سنٹر کا خیال ادارہ کے کارکنوں کو اس وقت پیدا ہوا جب انھوں نے بڑے پس وپیش کے بعد مردوں کے علاوہ عورتوں میں بھی کام کرنے کی ابتدا کی (یاد رہے کہ ادارے نے ۱۹۵۱ء تک سوشل ایجوکیشن کا پروگرام صرف مردوں تک محدود رکھا تھا اور یہ غالباً اس سبب سے تھا کہ ان کا کام بیشتر مسلمان محلوں اور بستیوں میں ہوتا تھا جہاں عورتیں پردے میں رہتی ہیں اور غیر مرد تو کیا غیر عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہیں) جیسا کہ اس وقت تک دستور تھا (اور یہ دستور اب بھی بہت بڑی حد تک باقی ہے) سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں میں لوگوں کی شرکت ایک مسئلہ بنا رہتا تھا اور اُسے حل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔ یہی مسئلہ ان بہنوں کو بھی پیش آیا جو ادارے کے ماتحت عورتوں میں کام کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھیں ان کی رپورٹوں کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا تھا کہ ان کی سب سے بڑی مشکل اُن کے پروگراموں میں عورتوں کی عدم شرکت ہے جسے وہ حل نہیں کر پاتیں اور اس سے دل تنگ رہتی ہیں۔

مردوں کے معاملے میں بچوں کی برادری کے تجربے سے یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ اگر بڑوں کو اپنے پروگراموں کی طرف متوجہ کرنا ہے تو پہلے ان کے بچوں کی طرف توجہ کرنا چاہئے اسی اصول سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ماؤں کو ادارے کی

معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کسی ماں کے لال کو اپنے یہاں لائیں گے اور اُسے دو تین گھنٹے اپنے پاس رکھیں گے تو اُسے اگر تشویش نہیں تو اشتیاق تو یقیناً پیدا ہوگا کہ دیکھوں میرے بچے کا کیا حال ہے اور اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کو بچے کی ماں سے اپنے یہاں آنے کے لئے کہنے کی ضرورت نہیں، وہ خود کھنچی چلی آئے گی۔ اس موقعے پر آپ اُس سے جو کچھ بھی کہیں گے، وہ کم سے کم اُسے سنے گی اور غور سے سنے گی۔ اُسے ماننے اور اُس کے اوپر غور کرنے کی منزل چاہے بعد میں آئے۔

مگر ابھی ایک سوال کا جواب باقی رہا جاتا ہے۔ ہمارے اس بیان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہر ماں اپنے بچے کو ہمارے نرسری سنٹر میں بھیجے گی ہی۔ ہندوستانی مزاج کی ایک خصوصیت شک و شبہ اور کوئی نئی بات شروع کرنے میں تذبذب بھی تو ہے!

یہ سوال اپنی جگہ بالکل بجا ہے۔ یہ مسئلہ دو طرح حل کیا جا سکتا ہے ایک تو دہی دوائیں بیچنے کے لئے مجمع لگانے والوں کا طریقہ جو دو چار آدمیوں کو اپنے آس پاس غالباً کرایہ دے کر جمع کر لیتے ہیں اور انہی کے سامنے تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ دو چار آدمیوں کو ایک جگہ جمع دیکھ کر کم سے کم جھانکنے کے لئے ہی آ جاتے ہیں؛ بالکل یہی نفسیاتی ڈھنگ بالک ماتا سینٹر شروع کرتے وقت اختیار کیا جا سکتا ہے۔ بستی میں دو چار آدمی ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اسکیم کی افادیت کو دوسروں کی بہ نسبت جلد سمجھ جائیں گے۔ جب ان سمجھدار ماؤں کے بچے آنے لگیں گے تو پڑوسن کے دل میں بھی کھوج پیدا ہوگی اور وہ وقت نکال کر کم سے کم جھانکنے ہی کی غرض سے سنٹر میں آئیں گی۔ اس موقع پر اب یہ بات کارکن کی سوجھ بوجھ اور بات کرنے کے آرٹ پر منحصر ہے کہ وہ ان جھانکنے والیوں کو اپنا گرویدہ بنا لے۔

دوسرا طریقہ سوشل ایجوکیشن کی تحریک میں جانا پہچانا ہے یعنی یہ کہ کارکن اپنا کام اُسی وقت کر سکے گا جب وہ بستی والوں کا اعتماد حاصل کر چکا ہو۔ بستی والوں کا اعتماد حاصل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی ماں یا باپ اپنے بچے کو ایک اچھے ادارے میں نہ بھیجے۔

آپ کی نرسری شروع ہو گئی اور اس سے ماؤں کو دلچسپی بھی ہو گئی وہ آپ کے سنٹر میں بن بلائے آنے لگیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ بالک ماتا سینٹر کے کام کے نقشے کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے، نرسری کی اُستانی اپنے وقت کا ایک حصہ بچوں کے ساتھ نرسری میں صرف کرے گی اور ایک حصہ بچوں کے گھروں کا گشت کرنے میں۔ گویا ملاقات کا سلسلہ صرف سنٹر تک محدود نہیں رہا۔ گھروں تک پہنچا۔ کارکن اور بچے کی ماں اور اُس کے قریب رہنے والی دوسری عورتوں اور لڑکیوں کے درمیان قربت کا درجہ قریب سے قریب تر ہو گیا۔ ظاہر ہے جان پہچان اور قربت اس

یہ تو تھا مختصراً بالک ماتا سنٹر کا تعارف اور اُس کے مقصد کی تشریح۔ اب رہا سوشل ایجوکیشن کا مفہوم تو اتنی بات تو بہر حال طے ہے کہ اگر والدین کی تعلیم و تربیت کا معقول بندوبست ہو جائے تو سوشل ایجوکیشن کا کچھ نہیں تو آدھے سے زیادہ کام پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ سوشل ایجوکیشن کو اگر خالصتہً بالغ آبادی ہی کی تعلیم کا پروگرام کہا جائے تو ملک کی بالغ آبادی آدھی سے زیادہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو بال بچے والے ہیں، مگر بال بچوں کی پرورش و پرداخت کے اصول سے یکسر بے بہرہ ہیں لیکن اس کے باوجود جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے، سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں شاید سب کچھ ہوتا ہو، مگر نہیں ہوتا تو والدین کی تنظیم اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام۔ اس کے علاوہ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ جب تک ملک اس قابل نہیں ہو جاتا کہ اسکول اور نرسری کی عمر کے تمام بچوں کے لئے گاؤں گاؤں اور بستی بستی اسکول اور نرسری کھول سکے، اس وقت تک اسکول اور نرسری کی تعلیم سے محروم تمام بچوں کی کم سے کم غیر رسمی تعلیم کا بندوبست بھی سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کا ایک اہم جزو رہے گا۔

ایک پنتھ دو کاج

سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والے چاہے وہ محکمۂ تعلیمات کی طرف سے کام کرتے ہوں، چاہے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی طرف سے یا غیر سرکاری اداروں کے زیر اہتمام، اس بات کی شہادت دیں گے کہ ان کے پروگراموں میں مرد ہوں یا عورتیں، کوئی آسانی سے شرکت نہیں کرتا، اور خواندگی کے بارے میں تو یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ محض خواندگی کے لئے ناخواندہ بالغ نہ کبھی آئے ہیں اور نہ کبھی آئیں گے لیکن اگر اُن کو یہ بات ذہن نشین کرا دی جائے کہ ان کے بچے ..... اُن کے ناخواندہ ہونے کی وجہ سے بگڑ رہے ہیں تو بچہ اُن کے نزدیک اتنی بڑی دولت ہوتا ہے کہ اُسے لُٹنے سے بچانے کے لئے جو کچھ بھی اُن کے بس میں ہوگا، وہ کرنے کے لئے وہ تیار ہو جائیں گے۔

بچوں کی پرورش و پرداخت کے سلسلے میں یہ بات اور اسی طرح کی دوسری باتیں ذہن نشین کرانے کے لئے طرح طرح کے طریقے ایجاد کئے گئے ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف بالک ماتا سنٹر کے طریقے کا مختصر سا ذکر کریں گے۔

بالک ماتا سنٹر میں ابتداءً بچوں کی نرسری قائم کر کے کی جاتی ہے۔ بالکل صاف سی بات ہے کہ بچے تو بچے ہیں، ہندوستانی ایک بکری کا بچہ بھی جو اس کے گھر میں پلا بڑھا ہوتا ہے کسی کے ہاتھ بیچتا ہے تو اگرچہ اُسے اس کے دام بھی مل چکے ہوتے ہیں، وہ خریدنے والے کے ساتھ بہت دور تک بکری کے بچے کو دیکھنے جاتا ہے اور حسرت سے دور تک جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو جاتا، اسے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کی روشنی میں غور کیجئے تو صاف

دارے کے پروگراموں میں شرکت کرنے کے لئے ایک بہانے کے طور پر قائم ہوا تھا، وہ نرسری کی تعلیم سے محروم بچوں کی بیت گاہ اور بچوں کی پرورش و پرداخت کے لئے ماؤں کی انجمن تو ہے ہی اور اس طرح پیرنٹ ایجوکیشن کا کام کر رہا ہے، اسی کے ساتھ وہ خواندگی کی کلاس، امتحانوں کے لئے لڑکیوں کو تیار کرنے کا ٹیوٹوریل سنٹر، دستکاری اور گھریلو حرفوں کا مرکز اور فنِ خانہ داری (ہوم سائنس) سکھانے کا ادارہ بھی ہے اور ایک ہی وقت میں سوشل ایجوکیشن کے کئی پروگرام کامیابی سے چلا رہا ہے۔

اور سو باتوں کی ایک بات تو بالک ماتا سنٹر کی ڈائرکٹر مرحومہ محترمہ صدیقہ قدوائی کی وہ بات ہے جو انھوں نے معاصر ٹائمز آف انڈیا کے نمایندے سے کہی تھی،

"ہمیں اگر جہالت اور غریبی کو دور کرنا ہے تو اس کی جڑ پر ضرب لگانی چاہیئے اور یہ جڑ در اصل گھروں کے اندر جمی ہوئی ہے۔"

درجے تک پہونچ جاتے تو کیا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے بچوں کو اس لئے لیا تھا کہ مائیں آپ کے قریب آئیں اور آپ ان کو کام کی باتیں سکھا سکیں مگر ایک ہی ہلّے میں دو کام ہو رہے ہیں۔ ماؤں اور ہونے والی ماؤں کا آپ کے کام میں تعاون تو حاصل ہی ہوگیا جو آپ کا اصل مقصد تھا اور ننھے ننھے بچوں کی صحت مند تربیت بھی ہو رہی ہے، جو لبھاؤ میں ہے۔

اعتماد اور یگانگت کا اثر

قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی شخص یا جماعت کو اپنا سمجھ لے تو پھر وہ بے تکلف اس کی ترقی، اس کی کمیوں اور کمزوریوں کو دور کرکے اس کی اصلاح و استحکام کے لئے نہ صرف سوچتا ہے بلکہ ان باتوں کے سلسلے میں منصوبے بنا کر ان کے اوپر عمل کرنے لگتا ہے۔ اس بیان پر بالک ماتا سنٹر کی ۵۶-۱۹۵۵ء کی رپورٹ کی روشنی میں غور کیجئے۔

"جب کسی چیز یا جگہ سے وابستگی بڑھ جاتی ہے تو انسان کے مطالبات بھی اسی نسبت سے بڑھ جاتے ہیں۔ ان عورتوں اور لڑکیوں نے آہستہ آہستہ لکھنے پڑھنے اور کچھ سیکھنے اور اپنی صلاحیت کو بڑھانے کی خواہش ظاہر کرنا شروع کی۔ ادارے نے دیکھا کہ کہاں ایک دن وہ تھا کہ تعلیمی پروگراموں میں شرکت کرنے کے لئے ان عورتوں اور لڑکیوں کی خوشامد کی جاتی تھی اور پھر بھی وہ نہیں آتی تھیں اور کہاں اب یہ وقت ہے کہ یہ اپنی صلاحیت کو بڑھانے اور سیکھنے سکھانے کے لئے جان کھائے لیتی ہیں۔ اس نے بالک ماتا سینٹر کی اسکیم پر نظر ثانی کی اور یہ طے کیا کہ بالک ماتا سینٹر کو ماؤں اور جوان لڑکیوں کی پوری تعلیم و تربیت کا مرکز بنا دینا چاہیے۔

اس فیصلہ کے مطابق ادارے کے بالک ماتا سینٹر سیکشن میں حسب ذیل سرگرمیوں کا اضافہ کردیا گیا۔

۱۔ گھریلو دستکاریوں کا سیکشن جس میں سلائی، کڑھائی، بُنائی، کھلونے بنانے اور کشیدہ کاری کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اس سیکشن میں ایک تربیت یافتہ (ٹرینڈ) استانی کام کرتی ہیں اور ان کے علاوہ بستی کی سگھڑ بہنیں بھی مختلف کام مفت سکھاتی ہیں۔

۲۔ ان پڑھ اور کم پڑھی عورتوں کے لئے خواندگی کا سیکشن۔

۳۔ ٹیوٹوریل ایجوکیشن سیکشن جہاں پانچویں چھٹی جماعت تک پڑھی ہوئی نوجوان لڑکیوں کو میٹرک کے امتحان کی تیاری کرائی جاتی ہے۔"

رپورٹ کے ان الفاظ سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بالک ماتا سینٹر جو ماؤں اور دوسری خواتین کو

ایسوسی ایشن یا انجمن بنائی ہے جسے وہ اپنے خرچ پر اپنے فائدے کے لئے خود ہی چلائیں گے۔ یہ ان کی اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ایک مہم ہے ان ضرورتوں کو جو سارے ممبروں کی عام ضرورتیں ہیں۔

یہ کوآپریٹو چاہے جس قسم کی بھی ہو کھیتی باڑی کی، تجارت یا کاروبار کی، اس کے انتظامی عملے پر بھاری اور مستقل ذمہ داری ہے۔ اس کا کام یہی نہیں کہ کوآپریٹو کو رواں دواں اور زندہ رکھے بلکہ اسے اپنے ممبروں کی دوسری معمولی یا دوسرے کاروبار کے مقابلے میں بہتر خدمت انجام دینی چاہئے۔ بہت سے اور ساتھ ہی ساتھ پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے کوآپریٹو سوسائٹی کے ممبروں کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کے مسائل کی تحقیق اور چھان بین کرتے رہیں اور چیزوں کے بارے میں جن کا تعلق نہ صرف معاشیات اور مالیات سے ہے بلکہ اخلاقیات اور انسانی نفسیات سے بھی ہے وقتاً فوقتاً جلسے کر کے باہم مشورہ کرتے رہیں۔ اس کے مقابلے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جو لوگ سوسائٹی میں ذمہ داری کے کام کرتے ہیں وہ پہلے ہی سے اونچے قسم کے لوگ ہیں اُن لوگوں میں سے چنے گئے ہیں جو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلے ہی سے ذمہ داری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ باتیں ان بڑی بڑی سوسائٹیوں کے حق میں صحیح ہیں جو اپنا ڈائرکٹر اور منتظم ایسے لوگوں کو چن سکتی ہیں جن کا کاروباری اور انتظامی تجربہ بہت اچھا ہو اور ایسی بڑی سوسائٹیاں اوسط درجے کی اور چھوٹی سوسائٹیوں میں بھی ڈائرکٹروں کے بورڈ کا اور سوسائٹی کی کونسل کا غیر معمولی طور پر اہم رول ہوتا ہے۔

تمام دنیا کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو نوبت لاکھوں تک پہونچے گی۔ یہ لاکھوں سوسائٹیاں سوسائٹیاں نہیں لاکھوں تجربہ گاہیں ہیں۔ ان میں انسان عملی طور پر سیکھتا ہے کہ مل جُل کر کام کرنے کا باہمی اتحادِ عمل کا کیا مطلب ہے، کیا معنی ہیں۔ اور اگر تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عمل کا یا کچھ کرنے کا موقع دیا جائے یعنی تجربے کرنے کا غلطیاں کرنے کا اور آخر میں کامیاب ہونے کا تو سوسائٹی ایک اہم اُستاد ہے۔ اور اگر اپنی تعلیم یا خود تعلیمی سے آپ کی مراد آپ اپنی تخلیق خود تخلیقی یا اپنے کو بنانا ہے تو سوسائٹی کا ممبر ایک ایسا انسان ہونا چاہیئے جو اپنی ترقی و اصلاح کے لئے متواتر اور مسلسل جد و جہد کرتا ہے۔

بس یہی وہ پوائنٹ وہ نقطہ ہے جہاں عام لوگ۔ کوآپریٹو کا کام کرنے والے اور معلم، غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو نئی تعلیم اور عملی اسکول کے حامی اور وکیل ہیں اس حقیقت تک نہیں پہونچ پاتے کہ جمہوریت میں سوسائٹیاں عملی مدرسے کا صحیح اور اصلی نمونہ ہیں۔ ایسے لوگوں کے خیال میں عموماً کوآپریٹو کی تعلیم حلقہ مطالعہ، کوآپریٹو مدرسے وغیرہ سے ہوتی ہے۔ اس طرح کے اسکولوں میں حلقوں میں اور جماعتوں میں عملی طریقوں کے بتانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن ان عملی

امدادِ باہمی کی تعلیمی اہمیت

تمہید

یہ بات یقینی طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ کوآپریٹو تعلیم کے صحیح مفہوم، صحیح تجسس یا مزاج کو ہم ابھی تک نہیں سمجھ پائے ہیں اس بات سے تو سبھی کو اتفاق ہے کہ کوآپریٹو تحریک کا آخری مقصد آدمی کو ڈھالنا ہے یا جیسا کہ البرٹ تھامسن نے چلتی ہوئی بات کہی ہے "آدمی بنانا" ہے۔ مگر اس مقصد کو حاصل کیسے کیا جائے؟

اس سوال کا جواب انھی لوگوں کے لئے مشکل نہیں جن کی معلومات کوآپریٹو سرگرمیوں کے بارے میں محدود ہیں ان لوگوں کے لئے بھی مشکل ہے جو اس تحریک کے سرگرم حامی ہیں بلکہ ان حضرات کے لئے بھی جو تجربہ کار معلّم اور استاد ہیں۔

یہ اس چیز پر جس کا نام انھوں نے "کوآپریٹو سوسائیٹیوں کی تعلیمی سرگرمیاں" دے رکھا ہے بہت سنجیدگی سے غور کرتے ہیں اور اس غور و خوض کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے: مطالعے کے حلقے۔ کوآپریٹو اسکولوں کے لئے پڑھائی کا نصاب، خط کتابت کے ذریعے تعلیم کے کورس وغیرہ۔ کوئی شک نہیں کہ یہ چیزیں کوآپریٹو تعلیم کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر اس کے مغز اس کی حقیقت اس کی تہ کو نہیں پہنچ پاتیں۔

امدادِ باہمی یا کوآپریشن کا اسکول

ہر ایک کوآپریٹو کا چاہے وہ کھیتی باڑی کی ہو چاہے کاروبار کی، پیداوار کی ہو یا ساہوکاری کی، محض وجود ہی لوگوں کی تعلیم و تربیت کی ضمانت ہے۔ یہ انسانی مدرسہ ہے۔ یا جیسا کہ پال کلاڈیل (PAUL CLAUDEL) زیادہ اچھے الفاظ میں بیان کرتا ہے، آدمی بننے کے آرٹ کا اسکول ہے۔ پر اب کیا یہ چیز ختم ہو رہی ہے؟ اس کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی ختم ہوتی جا رہی۔ اب یہ سوال کیا جانے لگا ہے کہ کوآپریٹو سوسائٹی کے ممبروں کو آخر اس سے فائدہ کیا ہے؟ سو اس تحریک میں یا تو پھر سے جان ڈالنی ہے یا اسے اپنی موت آپ مرنے دینا ہے۔

یہ چیز ہمیں ذہن میں رکھنا ہے کہ کوآپریٹو ہے کیا چیز؟ یہ لوگوں کی ایک جماعت یا گروہ ہے جس نے رضا کارانہ طور پر ایک

۳۔ .... جوتے کے ڈپارٹمنٹ کی مشکلات۔

۴۔ .... پھلوں اور سبزیوں کی فروخت یا بکری میں مقابلہ

۵۔ .... اسٹاف کی زندگی کا بیمہ (لائف انشورنس)

۶۔ .... اسٹور میں سے بیچنے والی عورتوں کو ملازم رکھنے کا مسئلہ

۷۔ .... ورلڈ کوآپریٹو ڈے یا دنیا کا کوآپریٹو دن" منانے کی تیاری

اس خاص کوآپریٹو میں ایجنڈے کی بہت سی مدوں پر پچھلے جلسوں میں بحث ومشورہ ہوچکا ہے۔ اس میٹنگ یا جلسے میں اس سوال پر بحث ہے کہ کس طرح اسٹور کا باقاعدہ افتتاح یا ادگھاٹن کیا جائے کہ اس سے اسٹور کا پروپیگنڈا بھی ہوجائے۔ کن اخباروں کو پبلسٹی یا اشتہار کا ذریعہ بنایا جائے؟ کیا اس موقع پر عورتوں اور بچوں کو کچھ چیزیں تحفہ کے طور پر دی جائیں؟ آیا پبلسٹی اور اشتہار کا یہ طریقہ کوآپریٹو کے لئے اجنبی تو نہیں ہے؟ نامناسب تو نہیں ہے؟ پھر تقریب کس وقت منائی جائے۔ آیا کام کے جو اوقات ہیں ان کے علاوہ کسی وقت منائی جائے تاکہ سوسائٹی کے وہ ممبر جو دوسری جگہ کام کرتے ہیں اس تقریب میں شریک ہوسکیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس بحث ومشورے کی تفصیل جو روداد میں درج ہے یہاں پیش نہیں کرنا ہے۔ لیکن یہ بات خاص طور سے بتانا ہے کہ اس مسئلے کے ہر پہلو پر تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ صحیح طور پر بحث ومشورہ حقیقت یہ ہے کہ برابر کے لوگوں میں ہی ہوسکتا ہے۔ ایک کوآپریٹو سوسائٹی میں ممبروں میں مساوات یا برابری ایک اصول نہیں ایک حقیقت ہے۔ چاہے ان ممبروں کی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ ان میٹنگوں یا جلسوں میں ہر ایک آزادی سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے۔ .... یہ نقطۂ نظر ہر معاملے میں اس کے سماجی پس منظر پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی کنبے کا ماحول، تجارت، پیشہ وغیرہ۔ جس میٹنگ کا اوپر ذکر ہوا اس میں ایک اسکول ماسٹر نے بچوں کو مفت تحفہ دینے کی مخالفت کی۔ اس نے صرف یہی نہیں کہا "یہ طریقہ اتحاد باہمی کے فائدے ذہن نشین کرانے کا صحیح طریقہ نہیں ہے اور کوآپریٹو سوسائٹی کے لئے یہ چیز بالکل اجنبی ہے۔ بلکہ اس نے اپنی بحث میں ایسی باتیں کہیں جو بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں لوگوں کے لئے مفید، قابل قبول اور لائق غور تھیں

برابر کے لوگوں میں بحث ومشورہ

آپس میں خیالات کا تبادلہ دوسروں کی رایوں اور مشوروں کو غور وتوجہ سے سننا جماعتی زندگی گزارنے کا عمل۔ یہ نتائج ہیں ان جلسوں کے جو سال میں پچاس بار تو ضرور منعقد ہوتے ہیں۔

طریقوں کی صحیح جگہ کو ابھی تک نہیں پہچانا گیا ہے۔ یہ ایک عام دستور سا ہو گیا ہے کہ کم از کم ابتدا محض زبانی تعلیم سے کی جائے۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کوآپریٹو پر ہی کیا موقوف ہے، ٹریڈ یونین اور اس طرح کے اور بہت سے ادارے اور انجمنیں اسی طرح تعلیمی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور کیا خود زندگی شروع سے آخر تک ایک بہترین معلم بہترین اُستاد نہیں ہے؟

یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن کوآپریٹو انسانوں کی محض ایک انجمن ہی نہیں ہے اس کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ وہ ایک کاروباری مہم بھی چلاتی ہے۔ اور اس طرح اس پر معاشی اور مالی ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے بے شمار مسئلے پیدا ہوتے ہیں اڑچنیں آتی ہیں جنھیں بحث و مشورے کے ذریعے بلا کسی تاخیر کے جلد سے جلد حل کرنا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کوآپریٹو میں اصول او عمل اور عمل اور اصول میں ربط و تعلق اور ہم آہنگی بھی ضروری ہے۔

ایک مثال

کوآپریٹو کی تعلیمی اہمیت کا محض دعوی ہی کرنا کافی نہیں ہے۔ ٹھوس مثالیں بھی ہونی چاہئیں۔

مثال کے طور پر ایک اوسط درجے کی کوآپریٹو سوسائٹی کو لیجئے۔ یعنی جس کے ممبروں کی تعداد پانچ ہزار اور دس ہزار کے درمیان ہو اور اس کی کمیٹی کے ممبر جن کی تعداد دس یا پندرہ ہو ہفتہ میں ایک بار (یا دوبار) جلسے کی شکل میں سوسائٹی کے دفتر میں ملتے ہوں۔ اور ان ممبروں کا انتخاب سوسائٹی کی جنرل میٹنگ کی طرف سے دو یا تین سال کے لئے کیا گیا ہو۔ یہ ممبر عموماً ہر طبقہ، خیال سے چنے گئے ہوں اس لئے کہ سوسائٹی کے قوانین و ضوابط مکمل سیاسی و مذہبی غیر جانبداری کی ہدایت کرتے ہیں[1]۔ اسٹاف کا ایک نمائندہ بھی مشیر یا ایڈوائزر کی حیثیت سے سوسائٹی کی میٹنگ میں شریک ہوتا ہو۔

نیچے ایک پورا ایجنڈا دیا جاتا ہے۔ یہ بطور مثال کے سوئٹزرلینڈ کی ایک سوسائٹی سے لیا گیا ہے۔

۱- .... سڑک پر ہمارے اسٹور کھولنے کا انتظام۔

۲- .... سوسائٹی کے لئے ڈبل روٹی کی فراہمی۔

---

[1] بلجیم میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں کوآپریٹو سوسائیٹیوں کا تعلق سوشلسٹ پارٹی سے ہے۔ اسی طرح برطانیہ میں بھی جہاں یہ سوسائٹیاں اپنی الگ پارٹی بناتی ہیں۔

تعارف

فوج کے سپاہیوں میں سوشل ایجوکیشن کی مہم

فوج کے تعلیمی شعبے کی سرگرمیاں

فوجیوں کی تعلیم کی ضرورت

فوج کے تعلیمی شعبے کا قیام یوں تو ۱۹۲۹ء میں ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی موجودہ شکل کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اور ۱۹۴۷ء سے اس کی صحیح معنوں میں شروعات کہی جا سکتی ہے۔

فوج کے اعلیٰ افسران نے یہ محسوس کیا کہ جنگ میں پڑھے لکھے سپاہی جاہل اور ان پڑھ سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔ اس لئے دونوں عالمگیر جنگوں سے پہلے اور بعد میں تیزی سے تعلیمی کام شروع ہوا ہے۔ دوران جنگ میں یہ بھی محسوس کیا گیا کہ لڑائی میں بڑی تعداد چھوٹے بڑے افسروں کے کام آجانے سے معمولی سپاہیوں پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی کمان کی ذمہ داری آجاتی ہے۔ ایسے نازک موقعوں پر تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ سپاہی اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں۔ انھی سب وجہوں سے فوجی ٹریننگ میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم پہ زور دینا بھی ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔

شہریت کی تعلیم

ملک کے آزاد ہو جانے پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ فوجی نوجوانوں کو دوسرے شہریوں کی طرح جمہوریت کی غرض و غایت اور ایک شہری کی حیثیت سے ان کے جو حقوق و فرائض ہیں ان سے ان کو پوری واقفیت ہونی چاہئے، اس لئے جاہل لوگوں کو باقاعدہ لکھنا پڑھنا سکھانے کا موقع نہیں تھا وہاں فرصت کے اوقات میں دوسرے طریقوں سے ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور فلم اور سمعی بصری ذرائع تعلیم سے انھیں ادب، تاریخ اور دوسرے فنون سے متعلق معلومات فراہم کرانے کا انتظام کیا گیا۔

مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ ایک کوآپریٹر یا کوآپریٹو سوسائٹی کے ممبر کا دماغ نتیجے کے طور پر نت نئے خیالات کا گھر بن جاتا ہے۔ اس کی نظر وسیع ہو جاتی ہے اور زندگی کا مقصد واضح، صاف اور بالکل کھلا کھلا نظر آتا ہے۔ یہ ممبر چاہے فیکٹری میں کام کرنے والا ہو۔ مستری یا صناع ہو کلرک ہو یا مزدور ہو۔ اسی طرح عورت چاہے گھر گھرستن ہو یا ماں ہو۔ یہ سب، چیزوں کی تقسیم کے وسیع میدان اور طلب اور رسد کے قانونوں کو جان گئے ہیں۔ ان کی سست، بے حرکت اور جامد زندگی حرکت و عمل سے بدل گئی ہے۔ وہ کام کرتے ہیں وہ موقع محل کے مطابق ان کاموں میں ترمیم و تبدیلی کرتے ہیں۔ مختصر طور پر وہ ایک ایسے گروہ ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جسے کچھ کرنا ہے۔ ایک ایسی جماعت سے تعلق پر وہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کی آزادیوں میں ایک معنیٰ، روح اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے ان کا عسلم ان کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے وہ اپنے شہر کے اپنے ملک کے اور پوری دنیا کے صحیح معنوں میں شہری بنتے جاتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس حرکت و عمل میں ان کا اپنا بھی حصہ ہو۔

جو ایجنڈا ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اس پر دوبارہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ اس میں جو جو سوالات ہیں سبھی غیر معمولی طور پر تعمیری قسم کے ہیں۔ اب ان میں سے ہر ایک سوال کے سلسلے میں کسی نہ کسی نتیجے اور فیصلے تک تو پہنچنا ہے اور یہ چیز ہر قدم پر کوآپریٹر یا کوآپریٹو کے ممبر کی عقل و رائے کو آزمائش میں ڈالنے والی ہوتی ہے۔ ہم خود اس ایک ہی میٹنگ کے سلسلے میں بحث کرنے میں خاصا وقت لگا سکتے تھے۔ اس طرح کی کاروباری سوسائٹیوں کی روداووں کے خلاصوں (طالب علم اس طرح کی ہزاروں سوسائٹیوں میں سے ایک کو چن سکتا ہے) کی ایک یا ایک سے زائد جلدوں میں اشاعت ہمارے لئے وقت کا ایک اہم ریکارڈ فراہم کرے گی۔ ان ریکارڈوں سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح یہ عملی اسکول نئی دنیا کے لوگوں کی تربیت اور ٹریننگ میں لگے ہوئے ہیں اور اگرچہ سیاسی نظریوں کی ہنگامہ خیزی کے مقابلے میں جو آدمی کو آدمی سے جدا کرتے ہیں۔ ان میں آپس میں نفرت کے بیج بوتے ہیں، کوآپریٹو کا نظریہ زیادہ دلکش اور جاذب نظر نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح یہ صلح و امن اور باہمی تعاون کی پوری استقامت اور استقلال سے خدمت کر رہا ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کوآپریٹو اصول بجائے خود تعلیمی اہمیت رکھتے ہیں:۔ اپنی مدد آپ، آپس میں ایک دوسرے کی مدد، ممبر بننے کی آزادی (یعنی ہر ایک کا یہ حق کہ وہ سوسائٹی کا ممبر بن سکے اور ممبر بنتے ہی موجودہ ممبروں کی جدوجہد سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کا حقدار بن جائے۔ اسی طرح وہ جب چاہے سوسائٹی سے الگ ہو جائے۔ اس آخری حق کے مطالبہ پر اصرار کیا گیا تاکہ ایک صحیح کوآپریٹو اور حکومت کی زیر نگرانی مصنوعی کوآپریٹو میں امتیاز ہو جائے) جمہوری طرز کی نگرانی اور ایک ممبر ایک ووٹ کا اصول۔ سرمایہ پر محدود منافع جس سے یہ ظاہر ہو کہ کوآپریٹو سوسائٹی میں سرمایہ کی حیثیت مالک اور مخدوم کی نہیں خادم

(باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھیے)

آزادی کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ فوج کے زیادہ سے زیادہ افسر غیر ملکی زبانیں سیکھیں۔ اسی غرض سے وزارت دفاع نے اپنی نگرانی میں غیر ملکی زبانیں سکھانے کا ایک اسکول ۱۹۴۹ء میں کھولا گیا ہے۔ اس اسکول سے اب تک بہت سے افسر چینی، فرانسیسی، جرمن، جاپانی، فارسی، روسی اور تبتی زبانوں کی ابتدائی تعلیم پا چکے ہیں۔

خواندگی کی مہم

اس شعبے نے خواندگی کی مہمیں بھی شروع کی ہیں، جس کے نتیجے میں آج بہت کم فوجی اَن پڑھ رہ گئے ہیں۔ کچھ پُرانے باورچیوں کو چھوڑ کر باقی سب ہی لوگ ملازمت کے شروع میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ نئے قوانین کے مطابق ہر ایک کو تعلیمی سند پیش کرنی ہوتی ہے۔ فوج کے سبھی مرکزوں میں تھوڑی تھوڑی مدتوں پر باقاعدہ امتحانات لینے کا انتظام ہوتا ہے۔

فوج والوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ایک طرح سے تعلیمِ بالغان کا ہی حصہ ہے۔ چونکہ ان لوگوں کو اپنے اپنے کاموں کی پوری پوری ذمہ داری بھی سنبھالنی ہوتی ہے اس لئے اس تعلیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں آتی رہتی ہیں۔ کبھی پڑھنے کا ٹھیک سے موقع نہیں ملتا تو کبھی فرصت نہیں ہوتی ہے۔ موسم کی خرابی اور دوسرے سامانوں کے نہ ہونے سے بھی پڑھائی میں رکاوٹ آتی ہے۔ مگر ان سب مشکلوں کے باوجود پڑھائی کا کام برابر جاری رہتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۶)

اور نوکر کی ہے اور اسی طرح منافع جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سوسائٹی (کاروبار نہیں بلکہ) خدمت ہے۔ اس لئے کہ منافع کی تقسیم ممبر گاہکوں کی خریداری کے تناسب سے ہوتی ہے۔

یہ اصول جو راشڈیل (ROCH DALE) رہنماؤں کے زمانے سے چلے آرہے ہیں کوآپریٹروں کا دستور العمل بن گئے ہیں۔ ان کی سوسائٹیاں ان کی پیروی کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی ہیں۔ یہ ایک اہم اور قابل ذکر حقیقت ہے کہ عملاً دنیا میں کوئی بھی ملک نہیں جو ان اصولوں کو نہ جانتا ہو۔ وہاں بھی جہاں سوسائٹیاں قائم نہیں ہوئی ہیں۔ اور جہاں "اپنی مدد آپ" کا فخر اور باہمی اتحاد عمل کی مسرت کوآپریٹروں کے چہروں پر نہیں پڑھی جا سکتی۔

(مسلسل)

اس شعبے نے جونیر کمیشن افسروں کو اس بات کی مشق کرائی ہے کہ وہ سپاہیوں کو بات چیت، ڈراموں اور تقریروں کی مدد سے تعلیم دیتے رہیں۔ اس سے سپاہیوں میں بحث مباحثے، اور بات چیت کا شوق بڑھا ہے، اور سپاہی آج کے مسائل جیسے بغداد پیکٹ، بین الاقوامی انجمن کی کامیابی اور ناکامی، اجتماعی کھیتی، ہندوستان کی بیرونی پالیسی وغیرہ پر بھی سوچ بچار کرنے لگے ہیں۔

ہفتہ وار "روز بروز"

فوجیوں کو ملکی اور غیر ملکی خبروں اور خاص طور سے ان خبروں سے جن کا تعلق ہندوستان سے ہوتا ہے باخبر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں جو سب سے بڑا کام ہوا ہے وہ ایک ہفتہ وار رسالے کی اشاعت ہے۔ یہ رسالہ ۶ر جون ۱۹۴۸ء سے "روز بروز" کے نام سے انگریزی اور رومن ہندوستانی رسم الخط میں برابر شائع ہو رہا ہے۔

کتب خانہ

اس شعبے نے جہاں جہاں ہو سکا ہے کتب خانے بھی قائم کئے ہیں۔ آج ہندوستانی فوج کی قریب قریب ہر ٹکڑی میں مختلف مضامین پر ہندی اور انگریزی کی کتابیں فراہم کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسالے اور اخبار بھی شائع ہوتے ہیں جو فوجیوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ان اخباروں میں فوج کے نوجوانوں کے لئے خبریں اور مختلف مضامین شائع ہوتے ہیں۔

مختلف سرگرمیاں

اس شعبے نے صرف فوجیوں کی تعلیم کا انتظام ہی نہیں کیا ہے بلکہ چھاؤنیوں میں مقیم اعلیٰ افسروں اور جونیر کمیشن افسروں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام بھی کیا ہے اور مختلف جگہوں پر بچوں کے اسکول بھی قائم کئے ہیں۔

جب سارے ملک میں ہندی سکھانے کا چرچا چلا تو یہ بات فوجیوں تک بھی پہونچی اور فوجیوں کی تعلیم کا انتظام کرنے والا یہ شعبہ اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہا۔ آج اس شعبے نے ابتدائی جماعت سے لے کر ہندی کے مختلف امتحانوں کے لئے لوگوں کو تیار کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ بہت سے افسر ہندی کے امتحانات دے کر فارغ ہو چکے ہیں اور کوئی ۹۶ فیصدی افسروں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔

ضمیمہ یادگار محترمہ صدیقہ قدوائی مرحومہ

تاثرات از

شریمتی رامیشوری نہرو

شریمتی ارونا آصف علی

پروفیسر محمد عاقل (جامعہ ملیہ)

محترمہ کملا چوپڑہ (ٹائمز آف انڈیا)

شری ابرارالرحمان قدوائی

محترمہ مس عائشہ حارث

بالک ماتا سنٹر کی طالبات

اداریہ

رکھا تھا اور یہ کام اُن کو بہت عزیز تھا۔ صدیقہ بیگم نے اب اُسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد اولین بنایا اور رات دن غریب عورتوں اور بچوں کی خدمت میں صرف کرنے لگیں۔

کوچہ نمیا محل میں اُن کا پرانا مکان جو پہلے بھی رفاہ عام کے کاموں کا مرکز تھا اب اسی کام کے لئے وقف کر دیا گیا۔ حاجت مند عورتیں اور بچے وہاں جمع ہوتے اور ان کو پڑھنا لکھنا اور دستکاری وغیرہ سکھائی جاتی۔ صدیقہ بیگم ان کے دُکھ درد میں شریک ہوتیں، ان کی خدمت کرتیں اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتیں مصیبتوں سے نجات دلاتیں اور خود کفیل ہونے میں ان کی مدد کرتیں۔

ابھی کچھ دن ہوئے جب ان کے ماتم میں ایک جلسہ کیا گیا جہاں کئی سو عورتیں جمع تھیں۔ وہ عورتیں جن کی وہ مدد کیا کرتی تھیں اپنے آپ کو بے سہارا سا محسوس کر رہی تھیں! ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ نظارہ بڑا رقت آمیز تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ان کے درمیان سے ایک فرشتہ اُٹھ گیا تھا جو ان کی ہر مشکل کا مشکل کشا تھا سب عورتوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ فیض و کرم کا چشمہ جس سے ہزاروں ضرورت مند فیض یاب ہوتے تھے اچانک خشک ہو گیا تھا۔ چاروں طرف ماتم چھایا ہوا تھا۔ ہر بولنے والا اپنے دل کا درد زبان سے ادا کرتا اور آنکھ سے آنسو بہاتا تھا۔

مسز قدوائی کو بنا مانگے بہت سے بلند عہدے پیش کئے گئے۔ میونسپل کمشنری اور پارلیمنٹ کی ممبری ان کو ملی۔ ہر جگہ انھوں نے صدق دلی سے اپنے فرض کو پورا کیا۔ لیکن سب سے زیادہ قدر کے قابل ان کی وہ مخلصانہ اور بے غرض خدمت ہے جو انھوں نے غریبوں کی کی جس کو لوگ بار بار یاد کر رہے ہیں۔ ان کے اچانک چلے جانے سے دہلی کی سماجی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا بڑا کٹھن ہے۔

افسوس ہم سے وہ بے وقت جدا کر دی گئیں۔ بھگوان سے اب یہی دعا ہے کہ ان کے ساتھیوں اور دوستوں کو طاقت دے کہ وہ ان کے ادھورے کام کو پورا کریں اور رفاہِ عام کی جو شمع انھوں نے روشن کی ہے اس کو ہمیشہ روشن رکھیں۔

شریمتی رامیشوری نہرو

مسز صدیقہ قدوائی کی بے وقت موت کی خبر اچانک ان کے عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں اور مداحوں نے سُنی اور صدمہ کی شدت سے کراہ اُٹھے۔ دہلی والے جن کو مسز صدیقہ قدوائی نے اپنی بے لوث و بے غرض خدمات سے اپنا عزیز بنا لیا تھا، اس خبر کو سُن کر فرطِ غم سے سکتے میں آ گئے۔ ان لوگوں میں سے جن کو یہ افسوس ناک خبر سُن کر دلی صدمہ پہنچا ان میں ایک میں بھی تھی۔

مسز قدوائی سے میرا پچھلے کئی سال سے تعارف تھا۔ میں ان کے قابل شوہر کے کارناموں اور رفاہ عام کے کاموں کو سُنتی اور پڑھتی رہی تھی۔ تعلیم کے میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں کئے ان کے لئے میرے دل میں خاص طور پر قدر تھی۔ ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور میرا تعارف صدیقہ بیگم سے کرایا۔ اس وقت وہ پردے میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر چاہتے تھے کہ وہ پردے سے باہر آئیں لیکن وہ پُرانے دستور کی زنجیروں میں ایسی بندھی تھیں کہ شوہر کی زندگی میں ایسا نہ کر سکیں۔ جب میں پہلی بار ان سے ملی تو ان کا رہن سہن اور لباس پُرانے ڈھنگ کا تھا۔ بہت سے زیور بھی پہن رکھے تھے۔ لباس بھی پرانے ڈھنگ کا تھا جیسے پردے کی عزت دار عورتیں رہتی ہیں اسی طرح سے وہ رہ رہی تھیں۔ وہی نیچی نگاہیں اور بولتے ہوئے شرمانا کسی غیر کے سامنے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھیں لیکن شوہر کی موت کے صدمے نے ان کو بالکل بدل دیا۔

پہلے تو جب میں ملنے گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ اس صدمے سے بالکل نڈھال ہو گئی تھیں اور آنکھ بھی نہیں کھول سکتی تھیں۔ زبان بالکل شل ہو چکی تھی اور بولنے کی قوت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ ان کے دوستوں اور ساتھیوں نے ہمت بندھائی اور انھوں نے اپنے شوہر کی مثال کو سامنے رکھ کر ان کے ادھورے کاموں کو ہاتھ میں لے لیا۔ ان کا رہن سہن اور لباس بالکل بدل گیا۔ وہ ایک نئی شکل میں نمودار ہوئیں۔ سادی سفید کھادی کی ساری میں وہ اپنے سہاگ کے لباس سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتی تھیں۔ وہ پردے کی چاردیواری سے باہر آ گئیں اور بچوں اور عورتوں کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان کے مرحوم شوہر نے "بالک ماتا سنٹر" کے نام سے عورتوں اور غریب بچوں کا کام اپنی زندگی ہی میں شروع کر

پروفیسر محمد عاقل

ایک تیماردار بہن

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سب کو اپنا سمجھتے ہیں اور اس لئے سب کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ انہی لوگوں میں شفیق صاحب مرحوم تھے اور اس معاملے میں ان کی صحیح جانشینی ان کی اہلیہ محترمہ صدیقہ قدوائی صاحبہ نے کی جو خود بھی ہمیں سوگوار چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

ایک لفظ میں کوئی مجھ سے بیگم شفیق کی سیرت کا خلاصہ بیان کرنے کے لئے کہے تو میں کہوں گا "سرچشمۂ یگانگت"۔

وہ جب ملتی تھیں تو اس طرح کہ جیسے اپنی سگی بہن کسی بھائی سے مل رہی ہے۔ وہ کسی کے لئے کام کرتی تھیں تو اس طرح جیسے بہن اپنے بھائی یا بہن کا کام کر رہی ہے، اور جس سے کام کراتی تھیں تو اس انداز سے جیسے کوئی بہن اپنے بھائی سے کام کرا رہی ہے۔

ان کے کام میں چونکہ کبھی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی تھی بلکہ ہمیشہ پُرخلوص جذبۂ خدمت شامل ہوتا تھا اس لئے اُن کو کسی سے فرمائش کرنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی اور اُن کے مطالبے میں اتنی بے ساختگی اور اپنائیت ہوتی تھی کہ کسی طرح بھی کوئی اس سے انکار نہیں کر پاتا تھا۔

جو ڈاکٹر بڑی بڑی فیس لے کر بھی کسی کا علاج کرنے کے لئے تیار نہ ہوں وہ ان کی سفارش پر مفت، بڑی دلسوزی اور محنت سے کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ جو افسر بڑے ترش رو اور کرخت ہوں وہ ان کے سامنے نہایت ملائم اور ہمدرد بن جاتے تھے۔ جو کام کسی اور سے نہ ہو سکتا ہو وہ ان سے کرایا جا سکتا تھا۔

پنڈت نہرو کی سالگرہ کے دن یہ اپنے بالک ماتا سنٹر کے بنائے ہوئے کبوتر اور بندر اور اسی طرح کی اور اناڑی ڈھنگ کی بنی ہوئی چیزیں ان کو سجاوٹ کے ساتھ پیش کرنے لے جاتی تھیں اور ان کی پُرخلوص پیش کش ایک بہن کی سوغات کی حیثیت سے، عزت و احترام اور شوق و شکریہ کے ساتھ قبول کی جایا کرتی تھی۔

اُن کی کسی سے لڑائی نہیں تھی۔ وہ کسی ایک پارٹی کی نہیں تھیں۔ وہ سب پارٹیوں میں یکساں مقبول تھیں دلی کی کانگریس پارٹی میں سخت پھوٹ پڑی اور دو دل بن گئے۔ لیکن ان کا دونوں فریقوں سے یکساں میل رہا اور یہ دونوں کے ساتھ بھائی بندی کے تعلقات کو نبھاتی رہیں۔ کیونکہ ان کی ملاقات سیاسی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ سگے

شریمتی ارونا آصف علی

صدیقہ بیگم کا شمار ان لوگوں میں ہے جو اپنی بے لوث خدمت سے دوسروں کے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک خوش اخلاق، ملنسار اور سُلجھے ہوئے خیالات کی مالک تھیں۔

شفیق صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، تعلیمی اور سماج سدھار کے کاموں میں اُن کا ایک بڑا مقام ہے۔ یہ کام اس وقت شروع کیا گیا جب کہ ہندوستانی خواتین تعلیمی لحاظ سے بہت پیچھے تھیں۔ صدیقہ بیگم نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اُن میں ایک نئی روح پھونکی۔

شوہر کی وفات ایک بہت بڑا صدمہ تھا لیکن انھوں نے ساری ذمہ داری اپنے سر لی۔ تاکہ شفیق صاحب کے اَدھورے کام کو پورا کر سکیں۔ خراب صحت کے باوجود وُہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے آخری وقت تک سنبھالتی رہیں۔

اُن کی بے وقت موت سے بچوں اور خواتین کی تعلیمی تحریک کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

کا خیال رکھا جاتا تھا اور بہت شفقت اور خلوص سے میری تیمارداری کی جاتی تھی۔

میرے ذہن میں ان کی جو یاد محفوظ ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ ایک تیماردار بہن کی یاد ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ ان کو اسی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

محترمہ کملا چوپڑہ

مسلمان عورتوں کی بیداری کی مورت

ذیل میں ہم محترمہ کملا چوپڑہ کا ایک مضمون نقل کر رہے ہیں جو معاصر ٹائمز آف انڈیا میں اس زمانے میں چھپا تھا جب محترمہ صدیقہ قدوائی مرحومہ دوسری بار راجیہ سبھا کی ممبر منتخب ہوئی تھیں۔ یہ مضمون ایک ملاقات کا نتیجہ ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ مرحومہ کی زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ اور باتیں محفوظ ہو گئی ہیں اور ان سے ان کے خیالات اور سوچنے کے طریقے پر روشنی پڑتی ہے۔

اس مضمون کے لئے ہم محترمہ کملا چوپڑہ اور معاصر ٹائمز آف انڈیا کے ممنون ہیں ——— ایڈیٹر

آزادی کے بعد ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے، بیگم صدیقہ قدوائی اس کی بہترین مثال ہیں۔ اب سے دس سال پہلے وہ ایک برقع پوش خاتون تھیں جن کی زندگی کی سرگرمیاں مکان کی چہار دیواری کے اندر ہی اندر محدود تھیں۔ جس خاندان سے ان کا تعلق ہے، اس کا نسل بانسل تک دستور رہا ہے کہ عورتیں اپنے گھروں سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھیں اور اگر کسی عورت کو اپنی کسی سہیلی یا رشتہ دار کے یہاں جانا ہوتا تو وہ رات کے وقت جا سکتی تھی اور اس کے لئے بھی یہ اہتمام ہوتا تھا کہ وہ ایک ڈولی میں بیٹھتی تھی جسے بھردسے کے کہار اُٹھاتے تھے اور اس کی نگہبانی کے لئے خاندان کا کوئی مرد ڈولی کے ساتھ جاتا تھا۔ آج اُسی خاندان کی یہ خاتون آزادی سے اپنے محلے میں گشت کرتی پھرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے فرقے کی سیکڑوں عورتوں کو اُن کے حقوق و واجبات سے باخبر بنا دیا ہے اور یہ بھی جتلا دیا ہے کہ سماج نے ان کے اوپر کیا کیا فرائض عاید کئے ہیں۔

محترمہ صدیقہ قدوائی کو سماجی کاموں میں حصہ لینے کا حوصلہ دراصل ان کے شوہر شفیق صاحب نے دلایا۔ شفیق صاحب

سمبندھیوں کی سی تھی۔

غرض، ان کی یگانگت ہمہ گیر تھی۔ اس میں تنگ دلی اور تنگ نظری کی مطلق گنجائش نہیں تھی۔ لوگ بھی ان کی سیرت کی اس امتیازی خصوصیت کو سمجھ کر اُن سے اس وفاداری اور پارٹی کے ضبط و انضباط کی توقع نہیں کرتے تھے جس کا دوسروں سے سختی کے ساتھ مطالبہ کیا جاتا تھا۔

دلی اسٹیٹ کے منسٹر اور آفیسر ہوں یا دلی میونسپلٹی کے کمشنر اور سربراہ کار، پارلیمنٹ کے ممبر اور منسٹر ہوں یا دوسرے اعلیٰ عہدہ دار، دوسرے ملکوں کے عالم گیر شہرت رکھنے والے معزز اور سربلند مہمان ہوں یا اپنے ملک کے برگزیدہ اور محترم عالم و فاضل اور اہل جاہ و ثروت ——— سب سے ملاقات کے موقع پر ان کی بے ساختہ یگانگت کا مخصوص رنگ برابر قائم رہتا تھا۔ گویا وہ ساری بنی نوعِ انسان کو ایک بڑی برادری اور کنبہ سمجھتی تھیں اور سب کے ساتھ بھائیوں اور بہنوں جیسا برتاؤ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے انداز میں مرعوبیت، تکلف، کھچاؤ یا رکاوٹ نام کو نظر نہیں آتی تھی۔ ملاقات کے وقت اپنے سادہ لباس میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے معصومیت کا ایک زندہ پیکر، خیر مقدم میں روحانیت کا نور بکھر رہا ہے اور یہ منظر ایسا ہوتا تھا جو ملاقات کرنے والے پر ایک دیرپا اثر چھوڑ جاتا تھا۔

ان کو سر کے درد کے دورے اکثر پڑتے تھے اور ایک دو دن کے لئے ان کو بالکل معذور کر دیتے تھے لیکن اس درد کی حالت میں کوئی انھیں دیکھتا تھا تو ان کا یہ درد کوئی ذاتی تکلیف نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ خود تو اس حالت میں بھی ہنستی ہنساتی رہتی تھیں بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے انسانیت کی کرب و تکلیف اور آلام و مصائب ان کے درد میں جھلک رہے ہیں جن میں سکون پیدا کرنے اور آرام و راحت پہنچانے کی وہ انتہائی جد و جہد میں مصروف ہیں۔

ایک دفعہ میری طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ کچھ ٹمپریچر سا رہنے لگا تھا اور صحت برابر گرتی جا رہی تھی۔ شفیق صاحب مجھ سے ملنے آئے اور اپنی کار اپنے ساتھ لائے۔ انھوں نے کہا "اس حالت میں تم یہاں اکیلے نہیں رہ سکتے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا" میرا سامان بندھوایا اور اپنے ساتھ مجھے مٹیا محل لے گئے۔ وہاں میرے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ صدیقہ بھابی[1] بھی مجھے دیکھنے آئیں۔ شفیق صاحب نے اپنے مخصوص ظرافت آمیز انداز میں ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اب یہ گھر نرسنگ ہوم ہوگیا ہے اور آپ کو اس نووارد مریض کی نرس مقرر کیا گیا ہے۔ نرس کے جو فرائض ہیں سب آپ کو انجام دینا ہوں گے۔ نرسنگ میں کوئی کوتاہی ہوئی تو آپ سے جواب طلب کیا جائے گا" صدیقہ بھابی نے خندہ پیشانی سے اس خدمت کو قبول کیا اور بڑے خلوص کے ساتھ نباہا۔ میرے لئے پرہیزی کھانا تیار کرایا جاتا تھا۔ میرے تمام معمولات

---

[1] پروفیسر فاضل صاحب اور شفیق صاحب کے دوسرے ساتھی مرحومہ کو بھابی کہہ کر خطاب کرتے تھے۔



Shrimati Siddiqua Qidwai with her husband
Late Shafiq Sahib and their Children

جامعہ ملیہ کے ایک نہایت مخلص کارکن اور ریاست دہلی کے وزیر تعلیم تھے۔

قدوائی خاندان یو۔پی کے ایک ضلع بارہ بنکی میں رہتا ہے۔ اسی ضلع کے ایک گاؤں (بڑا گاؤں) میں اس خاندان کی بہت بڑی زمینداری تھی۔ شفیق صاحب جب علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے تو ان کے ساتھ دو ملازم بھی گئے تاکہ ان کو کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ مگر شفیق صاحب نے گاندھی جی سے متاثر ہوکر سادگی کی زندگی اور کھدر پوشی اختیار کرلی تھی اس لئے وہ ملازم گھر واپس آگئے۔ اس صورتِ حال سے خاندان والوں کو بڑی تکلیف ہوئی۔ صدیقہ قدوائی صاحبہ نے دلچسپی لیتے ہوئے فرمایا " اُن سے میری شادی تین دفعہ ملتوی ہوئی اس لئے کہ جب جب شادی کی تاریخ ہوتی، معلوم ہوتا کہ وہ جیل چلے گئے۔"

بیگم صدیقہ قدوائی نے سماجی زندگی میں حصّہ لینا دراصل اپنے شوہر کے انتقال کے بعد شروع کیا۔ کہتی تھیں "میں نے سوچا کہ جس کام سے انھیں اتنا عشق تھا، اس میں کمی صرف اس وجہ سے نہیں آنی چاہئے کہ اس کی طرف توجہ نہیں ہے۔"

سماج سیوا کا کام انھوں نے نام و نمود اور نمائش کی خواہش سے پاک اور بے نیاز ہوکر شروع کیا۔ انھوں نے اپنی نوعمری میں دوپٹوں اور کرتوں پر لکھنوی وضع کی کشیدہ کاری کا فن سیکھا تھا۔ چنانچہ عورتوں کو کشیدہ کاری کا یہ فن سکھانے کی غرض سے صدیقہ قدوائی صاحبہ نے ایک سینٹر کھولا جس میں پہلے پہل صرف دو عورتیں آتی تھیں۔ مگر اس وقت اس سنٹر میں ڈیڑھ سو عورتیں داخل ہیں۔

بیگم صدیقہ قدوائی کہتی ہیں "ماں جب کوئی کام کر رہی ہو، اُس وقت اُس کے بچے کی خبرگیری کرنا ضروری ہے۔" اسی خیال کے تحت ننھے بچوں کے لئے ایک نرسری بھی قائم کی گئی جہاں تربیت یافتہ اُستانیاں کام میں لگی ہوئی ماؤں کے بچوں کی نگہبانی کرتی ہیں۔ یہ اُستانیاں چار گھنٹے نرسری میں بچوں کے ساتھ رہتی ہیں اور دو گھنٹے وہ اُن کے گھروں کا گشت لگانے میں صرف کرتی ہیں۔ اس دوران میں وہ عورتوں کو خانہ داری کے مختلف گُر مثلاً کھانا پکانا، مکان کی صفائی اور بچوں کی پرورش و پرداخت کے اصول سکھاتی ہیں۔

بیگم صاحبہ کہتی ہیں " میں جانتی ہوں کہ میرا کام سمندر میں ایک قطرے سے بھی کم حیثیت ہے۔ لیکن اگر ہمیں جہالت اور غریبی کو دُور کرنا ہے تو ہمیں اس کی جڑ پر ضرب لگانی ہوگی اور یہ جڑ دراصل لوگوں کے گھروں کے اندر جمی ہوتی ہے۔"

برقع پوش عورتوں میں سماجی بیداری پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی عورت برقع چھوڑنے کے لئے آمادہ ہوگی۔ ان کے سامنے ان کے معاشی اور قانونی حقوق کا ذکر کیجئے تو وہ اس کی طرف سے منہ

موڑلیں گی۔ جس وقت انھوں نے ان مسلمان عورتوں میں نئے خیالات کی اشاعت کی غرض سے جلسے، مباحثے، ڈرامے اور فلم شو وغیرہ کرانے شروع کئے اس وقت ان کی زبردست مخالفت ہوئی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ انھوں نے علاقے میں پہلی بار ایک اصلاحی ڈرامہ اسٹیج کرانا چاہا اس کی اتنی مخالفت ہوئی کہ علاقے کی ایک لڑکی بھی ڈرامے میں پارٹ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ مجبور ہوکر انھوں نے اپنی لڑکی اور بہن کو پارٹ دیا اور ڈرامہ اسٹیج ہوا۔ جس وقت ڈرامہ ہو رہا تھا اس وقت ان کے گھر پر پتھر برسائے جارہے تھے۔ بیگم صدیقہ کہتی ہیں کہ "میں بالکل خاموش رہی اور ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ مگر میں اپنے مقصد میں اس مخالفت کے باوجود کامیاب رہی۔ ڈرامے کے بعد میں نے دیکھا کہ بے جوڑ شادیاں ہفتوں عورتوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہیں۔ یہی اس ڈرامے کا بھی بنیادی خیال تھا۔

میں نے پوچھا "اس علاقے کی عورتوں کے اوپر آزادیِ نسواں کی گفتگو کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟" کہنے لگیں "ارے، وہ تو اُچھل اُچھل پڑتی ہیں! ان میں سے بیشتر ایسی ہیں کہ بوڑھی ہوگئی ہیں مگر اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ پچھلے ہفتے میں نے ان کی پکنک کا انتظام کیا تھا۔ دلی سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر ایک مقام "سونا" ہے وہاں!"

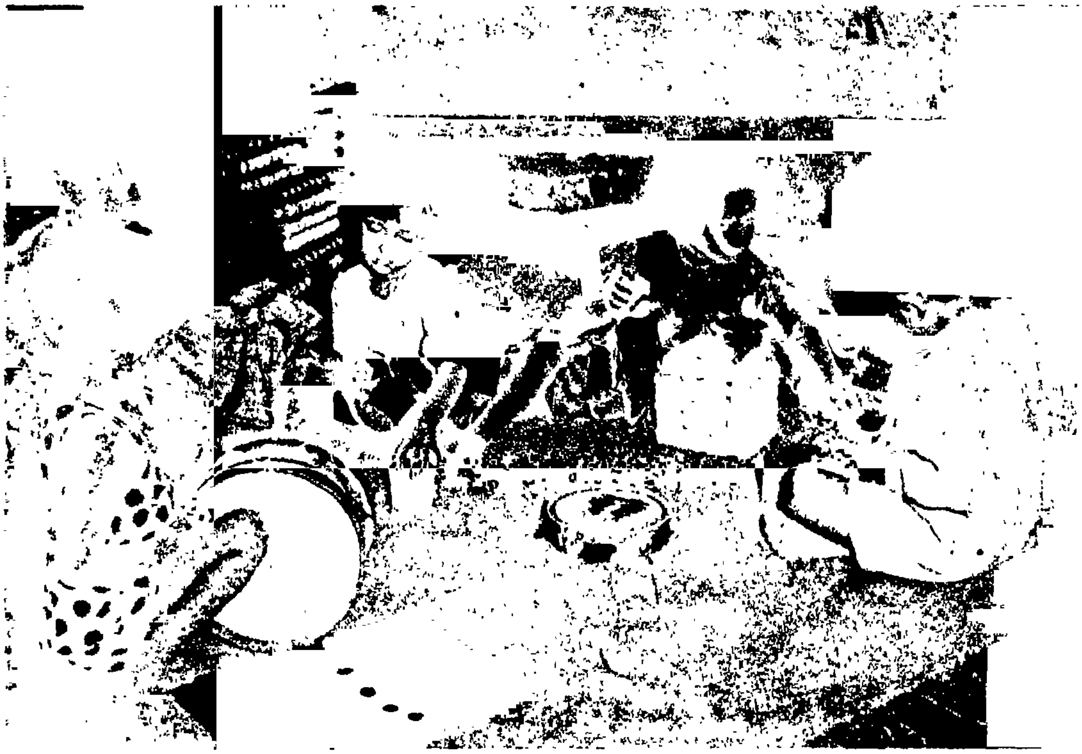
میں نے دریافت کیا کہ اگر حکومت مسلمانوں کے سماجی قوانین کی اصلاح کرے تو آپ کے خیال میں کیسا رہے گا؟"

"جی نہیں" انھوں نے جواب دیا "کم سے کم سرِدست اس طرح کا قدم نہیں اُٹھانا چاہیئے۔" انھوں نے دلیل دینی شروع کی "پہلے ہمیں اس کے لئے زمین تیار کرنی چاہیئے اور عورتوں کو تعلیم دینا چاہیئے۔ جب اُنھیں اپنی قابلِ رحم حالت کا اندازہ ہو جائے گا تو وہ خود ہی اصلاحات کا مطالبہ شروع کردیں گی۔"

بیگم قدوائی کو ۱۹۴۷ء کے فسادات کا پوری طرح اندازہ ہے۔ ان فسادات میں ان کا مکان (دلی میں) لوٹ لیا گیا تھا۔ کہتی ہیں "اس کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں مگر اس کے لئے میں کسی کو الزام نہیں دیتی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ ایک جنون تھا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ لے لیا تھا۔"

بیگم قدوائی کو پارلیمنٹ میں اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ میونسپل کمیٹی کی ممبری کے زمانے میں وہ پارلیمانی آداب و ضوابط سے خوب واقف ہو چکی تھیں۔ سیاسی معاملات کے بارے میں کہنے لگیں "میں سیاست دیا میں زیادہ نہیں پڑتی۔ یہ پنڈت نہرو اور کرشنا مینن جیسے لیڈروں کا کام ہے اور یہ لوگ اُسے سنبھالنے کے لئے

In Smt. Siddiqua Qidwai's Balak Mata Centre.





A Class of Hor

دیکھا ہے کہ اجنبی خواتین تو درکنار، آپا جنیاں اُن اجنبی مردوں سے بھی کس سلیقے اور جرأت کے ساتھ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر گفتگو کرتی تھیں جو دوسرے ملکوں کے ہوتے تھے۔ میں حیران ہوں کہ ان میں یہ جرأت اور سلیقہ کہاں سے آگیا تھا۔ کہاں وہ آداب اور پابندیاں کہ گھرانے کی کسی عورت کو اگر ایک گھر سے دوسرے گھر جانا ہوتا تو ڈولی کا اہتمام ہوتا اور اہتمام بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ ڈولی کے دائیں بائیں دو تین ملازم یہ دیکھتے ہوئے چلیں کہ ڈولی کے اوپر کسی غیر مرد کی نظر نہ پڑنے پائے اور کہاں زندگی کا یہ ڈھنگ کہ وہی خاتون تنِ تنہا دلّی کے گلی کوچوں میں رواں دواں تھی اور اس شان سے کہ بڑے بڑے جواں مرد حیران دیکھتے رہ جاتے کہ یا اللہ یہ کون فرشتہ ہے کہ انسان کے روپ میں لاچاروں اور امداد کے طلبگاروں کے دروازوں پر دستک دیتا پھرتا ہے کہ " کوئی کام ہو تو مجھے بتاؤ، کوئی تکلیف تو نہیں جس کی فکر ہے؟ کوئی فکر ہے تو اُسے اب میرے لئے چھوڑ دو، تمہارا غم اب تمہارا غم نہیں، وہ میرا اپنا غم ہے "۔ یہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!!

مگر یہ تفاوت کس لئے تھا! آپا جنیاں نے سیکڑوں غم اپنے دل میں سمو لئے تھے۔ دن رات یہی دھن رہتی کہ اُس بڑھیا کو کچھ کھانے کا سہارا مل جائے۔ اُس مریض کو دوا مل جائے، اُس یتیم کو اور اُس بیوہ کو کوئی مستقل ذریعۂ معاش مل جائے!! اس کوشش میں ناکامی ہوتی تو اپنی جھولی سے بانٹنا شروع کر دیتیں۔ میں نے تو جب دیکھا یہی دیکھا کہ روزانہ دو چار ضرورت مند آتے اور کچھ لے ہی کر جاتے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ اگر کسی دن کوئی نہ آتا تو وہ خود ہی ضرورتمندوں کے گھروں پر پہنچ جاتیں اور اس کی فکر اور پریشانی میں دامے، درمے، قدمے سخنے شریک ہوتیں، اور گھر آکر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتیں کہ اُس نے انھیں کسی ضرورت مند کے کام آنے کی توفیق بخشی۔

میں سوچتا ہوں تو اُن کی خوبیاں ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کی زندگی میں ان خوبیوں کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے انھیں اکثر مشورہ دیا کہ آپ کی فیاضی کا رُخ اگر اپنے بچوں کی طرف بھی ہوتا تو اچھا تھا۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ انھوں نے کبھی ہاں کی ہو۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ بات کو ہنس ہنس کر ٹال دیا۔ پیسے کی اُن کے یہاں کوئی قیمت نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کو اس روپے میں سے کبھی کچھ نہ دیا جو انھیں پارلیمنٹ کے ممبر ہونے کی حیثیت سے ملتے تھے۔ اِس روپے کو دوسروں کے اوپر خرچ کر کے اور دوسروں کی امداد کر کے انھیں اطمینان ہوتا تھا۔ وہ کہتی تھیں "میں ان روپوں کی مستحق نہیں ہوں اور اسی لئے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی"۔

آپا جنیاں کو میں نے بہت قریب سے دیکھا اور انھیں سمجھنے کا موقع مجھے گذشتہ چند سال میں اچھی طرح ملا۔ میں بچپن سے سمجھتا آیا تھا کہ آپا جنیاں میری نہایت ہمدرد اور پُر خلوص بہن ہیں۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ میں نے اِدھر چند سال میں دیکھا کہ بہن کو بھائی سے خلوص اور ہمدردی کا جو زبردست جذبہ ہوتا ہے، وہ جذبہ ان کے دل میں صرف

کافی ہیں۔ میں تو ایک معمولی سی کارکن ہوں۔ میری جگہ عوام میں ہے۔"

بیگم صدیقہ قدوائی جامع مسجد کے علاقے کے بیچ کے حصے میں ایک بڑے سے مگر بوسیدہ مکان میں رہتی ہیں واپس ہوتے وقت جب میں مکان کے ایک تنگ اور ڈگمگاتے ہوئے زینے سے اُتر رہی تھی تو میں نے ان سے پوچھا۔ "پارلیمنٹ کے ممبروں کے رہنے کے لئے نئی دہلی میں نئے نئے بنگلے بنے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی بنگلے میں جاکر کیوں نہیں رہتیں؟"

"جی نہیں" انھوں نے دبے لفظوں میں کہا "مجھے اپنے لوگوں ہی کے درمیان رہنا اچھا لگتا ہے۔ ان سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کا اس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں۔"

شری ابرارالرحمان قدوائی

آپا جنیاں[1] نے جس گھرانے میں جنم لیا اور جس ماحول میں پلیں بڑھیں اس کا دستور تھا کہ عورتیں ان عورتوں سے نہ ملیں جو اس گھر کے لئے اجنبی ہوں، بچے اُن بچوں کی طرف رُخ نہ کریں جو پاس پڑوس یا باہر کے ان گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں جن کا مرتبہ اپنے گھرانے یا خاندان سے کم تر ہے، اور جہاں کے مرد، عورتیں اور بچے ایک ایسی چہار دیواری کے اندر رہتے سہتے تھے جس کے ارد گرد بھی کسی اجنبی کا گزر نہ ہو۔ سوچتا ہوں اگر وہ بزرگ آج موجود ہوتے جنھوں نے اپنے رہنے سہنے کا یہ طریقہ بنایا تھا تو وہ یہ بات ایک لمحے کے لئے بھی باور نہ کرتے کہ آپا جنیاں اسی گھرانے کی ایک خاتون تھیں۔ خود مجھے بھی حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے گذشتہ چند سال میں اپنی زندگی کا ڈھنگ کس طرح بدل ڈالا! میں نے

---

[1] یہ لفظ دراصل آپا جان کی ایک مقامی شکل ہے۔ مرحوم کے بھائی بہن محترمہ صدیقہ قدوائی کو اسی لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ جب ان کے بچے ہوئے تو وہ بھی گھر میں لوگوں سے سُن کر ماں کو اُسی نام سے خطاب کرنے لگے اور پھر تو خاندان میں چھوٹوں کی طرف سے ان کا نام ہی آپا جنیاں پڑ گیا۔ اسی نسبت سے جامعہ میں اور خصوصاً بالک ماتا سینٹر میں بھی ان کو اسی لقب سے لوگ خطاب کرنے لگے جو بڑی بہن اور ماں دونوں معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

ان باتوں کے پیچھے ایک بہت بڑی طاقت کارفرما تھی جو اُن کو ان کے کام میں مدد دیتی تھی اور اسی سے وہ ہمت اور حوصلہ حاصل کرتی تھیں۔ یہ زبردست طاقت تھی بھائی صاحب مرحوم کی یاد۔ اس غم کو وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھیں اور اس کا اظہار نہ کر کے وہ اندر ہی اندر اپنی زندگی کو ختم کئے ڈال رہی تھیں۔ بھائی صاحب مرحوم کو عوام کی اور جامعہ کی خدمت کی دُھن تھی۔ اُن کی یاد کے سہارے آپا جنیاں خلقِ خدا کی خدمت میں آگے قدم بڑھائے چلی جاتی تھیں۔ حالانکہ نہ خود اُن کو یہ اندازہ تھا اور نہ ہم میں سے کسی کو کہ اس صدمے کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے وہ بہت دور نہ چل سکیں گی۔ بہت جلد تھک جائیں گی اور زندگی بہت جلد ان کا ساتھ چھوڑ دے گی۔

آج جب ہمیں ان کی باتیں یاد آتی ہیں تو ہم سوچتے ہیں کہ آپا جنیاں نے کس حیرت انگیز طریقے پر اپنی زندگی کے آخری چند سال گذارے اور جامعہ ملیہ اور بالک ماتا سنٹر کی خدمت میں اپنا عیش و آرام اور اپنی زندگی کے روز و شب قربان کر دیئے۔ خدا کرے یہ ادارے اور زیادہ پھلیں پھولیں اور ان باہمت ہستیوں کے ارادے کامیاب ہوں جو دنیا کی کسی طاقت سے نہیں ہارے۔ ہاں اگر ہارے تو صرف اس ذاتِ پاک کے اٹل فیصلے سے جو تمام جہان کا مالک ہے اور جس کے آگے ہم سب مجبور ہیں۔

میرے ہی لئے نہیں بلکہ ہر انسان کے لئے تھا ـــــ اور جذبہ بھی اتنا وسیع، اتنا گہرا، اور اتنا نرم کہ اُسے کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ میں دیکھتا تھا کہ اگر ایک بار بھی کوئی ان کے پاس آ جاتا، تو وہ غیر ارادی طور پر اس کی ہمدرد بن جاتی تھیں۔ مگر اس ہمدردی کا اظہار وہ زبان سے کبھی نہیں کرتی تھیں۔

میں نے حقیقی بھائی ہونے کے رشتے سے آپا جنیاں کی بے پناہ محبت حاصل کی مگر لوگوں سے ان کا اس قدر زیادہ خلوص تھا کہ اس کے سامنے کبھی کبھی اپنے آپ کو بہ حیثیت ایک حقیقی بھائی کے اُن سے بہت دور سمجھنے لگتا۔ ایسے لوگوں میں بیشتر جامعہ کی برادری کے لوگ تھے اور کچھ بھائی صاحب (شفیق صاحب) مرحوم کے احباب تھے۔ میرے ذہن میں اکثر یہ کشمکش رہی کہ "آپا جنیاں کا خلوص اور محبت میرے لئے زیادہ ہے یا اُن لوگوں کے لئے جو اُن کے حقیقی بھائی نہیں ہیں" مگر یہ عقدہ ان کی وفات کے بعد اب کھلا کہ میں دھوکے میں تھا۔ ان کے حقیقی بھائی اور بہن وہ سب لوگ تھے، صرف میں ہی نہیں تھا۔

آپا جنیاں نے اپنے اور پرائے میں کبھی تمیز نہیں کی اور کبھی کی بھی تو جامعہ کے معاملے میں۔ جامعہ ہی کے لئے وہ زندہ تھیں اور اس کو اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ جامعہ کی خدمت میں دن رات لگی رہیں۔ جامعہ کی ہر چیز کو وہ اپنی چیز سمجھتی تھیں اور اس کی حفاظت کے لئے وہ دنیا بھر کی بلائیں مول لینے کے لئے بخوشی تیار رہتی تھیں۔ یوں تو جامعہ سے ان کا رشتہ تقریباً تیس سال پرانا تھا۔ لیکن بھائی صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے آپا جنیاں کے دل میں وہی لگن دیکھی جو مرحوم کے دل میں تھی۔ آپا جنیاں کی یہ آرزو تھی کہ اپنی زندگی جامعہ کے حوالے کر دیں اور اسی آرزو کو لئے وہ آگے بڑھتی چلی گئیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ مجھے کوئی اعزاز ملتا ہے تو مجھے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی۔ اور اگر تھوڑی بہت خوشی ہوتی بھی ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے توسط سے جامعہ کا نام ہوتا ہے۔ میں نے اُن کو اکثر مشورہ دیا کہ اگر سرکاری یا عوام کے مطلب کی بات کے لئے آپ کسی کو خط لکھیں تو پارلیمنٹ کے چھپے ہوئے کاغذ پر لکھا کیجئے۔ مگر وہ اس مشورے سے مکدّر ہو جاتی تھیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پارلیمنٹ کی ممبری کے دو سال کے زمانے میں انھوں نے پارلیمنٹ کے شاید دو ہی ایک کاغذ اور لفافے استعمال کئے ہوں گے اور وہ بھی مجبوراً۔ وہ سرکاری خط و کتابت کے لئے ہمیشہ بالک ماتا سنٹر کا کاغذ استعمال کرتی تھیں کہا کرتی تھیں کہ "پارلیمنٹ کو تو دنیا جانتی ہے اس کے لیٹر پیڈ پر کیا لکھنا! میں ایسا فضول کا اشتہار نہیں کروں گی۔ بالک ماتا سنٹر اور جامعہ کے لیٹر پیڈ سے لوگ ہم کو اور ہمارے کام کو زیادہ جانیں گے اس لئے میں تو وہی کاغذ استعمال کروں گی۔ پارلیمنٹ کی ممبری چار دن کی ہے اور ہماری یہ جامعہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔" انھوں نے اپنے دل میں صرف جامعہ اور عوام کی خدمت کے جذبے کو سمو لیا تھا اور اس پر سختی سے کاربند تھیں۔

یا خالہ یا پھوپھی کا پیار دے سکتی ہیں۔ ماں کا پیار اپنے بچوں کے علاوہ اوروں کو دینا عورت کا سب سے بڑا کمال
ہے۔ عموماً ہر عورت ماں کے پیار کو اپنے بچوں تک محدود رکھتی ہے لیکن اپنے بچوں کے علاوہ دوسروں کو ماں
کا پیار دینے والی ہستی بہت بڑی ہستی ہوتی ہے۔ آپ کا شمار انہی بڑی ہستیوں میں تھا۔ لوگ چاہے آپ کو
چچی جان کہتے ہوں یا بھابی یا آپا جنیاں کہتے ہوں۔ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرتے وقت یہی محسوس کرتے تھے گویا
وہ اپنی ماں سے مخاطب ہیں۔ خلوص اور لگن سے کام کرنے والے لوگ رہ ہی کتنے گئے ہیں؟ جسے دیکھئے وہ نام و
نمود کی فکر میں ہے۔ دو چار تقریریں کرنے والا اور اخباروں میں تصویریں چھپوانے والا ہر آدمی اپنے آپ کو سماج
کا خادم ظاہر کرتا ہے۔ ایسے ماحول میں اپنے آپ کو پس پردہ رکھ کر ایمانداری اور لگن سے کام کرنے کا عملی سبق
دینا آپ ہی کا کام تھا اور تعجب تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کے تیس، پینتیس سال آپ پردے میں گزار چکی تھیں۔
اس کے باوجود جب آپ نے کام سنبھالا تو اُسے پوری ذمہ داری کے ساتھ پو   اب تو خدا سے یہی دعا ہے
کہ وہ آپ کو جنت میں شفیق چچا مرحوم کے پاس جگہ دے اور آزاد ہندوستان کی بچیوں کو خاص کر مسلمان
بچیوں کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے اور آپ کی ہمت اور آپ کا حوصلہ عطا فرما۔ کہ پردے
کی پابندیوں کے باوجود وہ اپنے خیالات کو اتنا بلند بنا سکیں کہ جب ملک و قوم کی خدمت کرنے کا وقت آئے
تو وہ اپنے ملک کی عورتوں کی صف میں پیش پیش ہوں۔

مس عائشہ حارث

چچی جان[1] آپ ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلی گئیں! نہ خدائے تعالیٰ سے کوئی شکوہ ہے نہ آپ سے گلہ۔ خدا نے تو آپ کو اس دنیا سے اُٹھالیا اور اپنے سایۂ رحمت میں اُونچی جگہ دی۔ ظاہر ہے آپ کے لئے وہی مناسب جگہ تھی۔ آپ سے بھی گلا نہیں۔ آپ نے شفیق چچا مرحوم کے انتقال کے بعد پانچ سال کس طرح کاٹے یہ آپ ہی جانتی تھیں۔ آپ کا بس چلتا تو آپ اُسی روز ہم سب سے دور ہو جاتیں۔ آپ کے چلے جانے پر آج ہم لوگوں کو خود اپنے حال پر ترس آرہا ہے کہ ہم لوگ اتنے خوش نصیب نہ تھے کہ آپ کا سایہ اور کئی سال تک ہمارے سر پر سلامت رہتا اور آپ کے پیار و محبت کی چھاؤں میں ہم سب پروان چڑھتے۔

دنیا میں چچی جان! دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک وہ لوگ جنھیں انسان نہیں آدمی کہا جاتا ہے، جو دنیا میں بسنے والے اور جانوروں کی طرح ہاتھ پیر رکھتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، اور ایک روز مرجاتے ہیں۔ ان کی زندگی صرف اپنے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کے مرجانے پر سوائے ان کے قریبی اعزہ و اقارب کے کوئی دو آنسو بھی نہیں بہاتا۔ انسانوں کی دوسری تعریف میں وہ لوگ آتے ہیں جو انسان سے زیادہ فرشتہ کہلانے کے لائق ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ دوسروں کی راحت و خوشی کے لئے وقف ہوتا ہے وہ اپنے لئے نہیں اوروں کے لئے جیتے ہیں۔ اوروں کی خوشی ان کی خوشی ہوتی ہے۔ اوروں کا دُکھ درد ان کا اپنا دُکھ درد ہوتا ہے۔ آپ اُنہی خوش قسمت اور فرشتہ صفت انسانوں میں سے تھیں اسی لئے آج نہ صرف آپ کی اولاد اور آپ کے بھائی بہن بلکہ آپ کے جاننے والوں میں سے ہر ایک آپ کی وفات پر آنسو بہا رہا ہے اور اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی محسوس کر رہا ہے۔ آج آپ کے بغیر ملیا محل[2] کی بچیاں لاوارث نظر آرہی ہیں اور ہم سب جامعہ والے کھوئے کھوئے سے نظر آرہے ہیں۔

پیاری چچی جان! دنیا میں انسان اوروں کو کئی قسم کی چیزیں دیتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز اور سب سے اہم چیز پیار اور محبت ہے۔ عورتوں میں یہ جذبہ بہ نسبت مردوں کے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اکثر عورتیں بہن

---

[1] مس عائشہ حارث کے والد اور شفیق صاحب جامعہ ملیہ میں ہم جماعت تھے اور ان دونوں میں سگے بھائیوں جیسا رشتہ مس عائشہ مرحومہ کو چچی جان اسی نسبت سے کہتی تھیں۔ [2] وہ جگہ جہاں بالک ماتا سنٹر قائم ہے۔

دیس کو انھی جیسی ان تھک اور پُرخلوص کام کرنے والی ہستیوں کی ضرورت ہے۔

سینٹر کی ترقی کے لئے نئی نئی باتیں سوچا کرتی تھیں اور ہم لوگوں سے کہتی تھیں کہ "کام کرو۔" باتیں تو انھوں نے ہم کو بہت بتائیں لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ ہمیں یاد نہیں۔ پڑھانے کے معاملے میں ان کا طریقہ محبت کا طریقہ تھا۔ اُنھوں نے کبھی کسی ٹیچر کو یا ہمیں حکم نہیں دیا۔ ہمارے اوپر ان کی بات کا اتنا اثر ہوتا تھا کہ انھوں نے بات کی اور وہ ہمارے دلوں میں اُترتی چلی گئی۔

آپا جنیاں ہماری سیر و تفریح کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ حالانکہ خود کبھی تفریح میں حصہ نہیں لیا۔ ہمارے لئے لاری کا انتظام کرواتیں۔ تفریح کا پروگرام طے کرتیں اور جب ہم سب مل کر مرکز سے نکلتے تو اوپر کھڑی ہنستی جاتی تھیں۔ یہ سوچ کر ہمارا دل پھٹنے لگتا ہے کہ ہمارے ہنستے چہروں کو دیکھ کر ہنسنے والی اور ہمارے دکھ درد کو دور کرنے والی آپا جنیاں ہم سے دور ہو گئیں۔ آہ ایسی اچھی آپا جنیاں کو اب ہم کہاں سے لائیں گے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا سہارا ٹوٹ گیا۔ اس وقت بھی جب کہ میں ان کی یاد میں مضمون لکھ رہی ہوں ان کا ہنستا ہوا چہرہ نظروں کے سامنے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہہ رہی ہوں کہ " میں نے ایک راستہ چھوڑا ہے اُسی پر چلو۔ وہ ہے سچائی خدمت اور محبت کا راستہ۔

افسر غوری

جنھیں ہم آپا جنیاں کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ کون تھیں؛ ان کی ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ عظیم ہستی جو ہمارے اور ان کے درمیان تھی۔ خدا نے ہم سے چھین لی۔ ان کی جدائی سے جو صدمہ ہمیں ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص کو بخوبی ہوگا جو ان سے ایک بار بھی مل چکا ہو۔ ایک شفیق ماں کو اولاد ساری زندگی یاد کرتی اور روتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی ساری زندگی آپا جنیاں کو یاد کریں گے اور روئیں گے کیونکہ وہ ہمیں اولاد سے کچھ کم نہ سمجھتی تھیں۔ ہم لوگوں کو وہ ہر وقت "میری لڑکیاں" کہہ کر پکارتی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی ہمارے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ دن رات نئی نئی اسکیمیں بناتیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی تھیں۔ کس حد تک ان کی اسکیمیں کامیاب ہوئیں اس کا ثبوت سینٹروں کی کامیابی سے ظاہر ہے۔ باضابطہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بھی ان کے کارناموں نے تعلیم یافتہ لوگوں کو مات کر دیا تھا جو بھی اُن کاموں کو دیکھتا دنگ رہ جاتا تھا۔ انھوں نے ہم جیسی جاہل لڑکیوں

بالک ماتا سنٹر کی طالبات

محمودہ جہاں انصاری

آج ہم اپنی عزیز ترین ہستی کا سوگ منا رہے ہیں۔ وہ آپا جنیاں جن میں بہن کی محبت، ماں کا پیار اور سرپرست کی شفقت تھی! آج ہم سے وہ ہستی بچھڑ گئی ہے جو ہمارے رنجیدہ چہرے دیکھکر پریشان ہوجاتی تھی جو ہر طرح ہماری دلداری کرتی تھی وہ ہستی، وہ آپا جنیاں ہمیں چھوڑ کر اتنی دور چلی گئیں کہ ہماری دُکھ بھری صدائیں ان تک نہیں پہنچ سکتیں۔

ان کی کس کس بات کو یاد کریں۔ ہر دم ہنستا مسکراتا چہرہ نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے بس وہی وہ ہیں۔

ابھی کچھ ہی دن کی بات ہے۔ ہم سب دوپہر میں لیٹے ہوئے تھے کہ صحن میں کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا تو آپا جنیاں کھڑی تھیں۔ ہم سب اُٹھ گئے۔ وہ بہت بے تکلفی سے دیر تک ہمارے پاس لیٹی رہیں۔ پھر محلہ میں دو چار جگہ گئیں۔ یہ تو ایک دن کی بات ہے۔ ان کی پوری زندگی اسی سادگی اور اسی نیکی کی آئینہ دار تھی۔ دن بھر ہم لوگ اوپر ان کے پاس دوڑا کرتے تھے۔ سر میں درد ہو رہا ہے، سر پر ہاتھ رکھے لیٹی ہیں۔ مگر ہم میں سے کوئی پہنچ گیا ہے یا کوئی اور آگیا ہے تو باتیں بدستور کر رہی ہیں۔ اکثر بہت درد ہوتا تھا۔ ہم لوگ کہتے کہ "آرام کیجئے اور کسی سے نہ ملئے" تو کہتیں "آرام تو ملنے میں ہے۔ نہ معلوم کون کس ضرورت سے آیا ہے"۔ خاکساری اتنی تھی کہ کوئی ہو، اس سے بڑی خوش اخلاقی اور محبت سے ملتی تھیں میں نے اکثر دیکھا ہے کہ غریب عورتیں اوپر گئی ہیں اور کچھ دیر بعد وہ مٹھیاں بھرے اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا کسی کی مدد کرنے سے گریز نہیں کرتی تھیں۔

میں آج ان دنوں کو بھی یاد کر رہی ہوں جب وہ اوپر سے ہمیں دیکھا کرتی تھیں اور کہتی تھیں "تم سب کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے" وہ ہمارے سیکھے ہوئے کام اور ہماری پڑھائی کو دیکھ کر باغ باغ ہوجاتی تھیں۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کی ترقی دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اکثر کہتی تھیں کہ میں چاہتی ہوں کہ سب لڑکیاں پڑھ جائیں۔ پڑھے لکھے لوگوں سے دیس ترقی کرتا ہے" وہ چاہتی تھیں کہ دیس ترقی کرے۔ آج

اداریہ

شفیق صاحب کی بیگم محترمہ صدیقہ قدوائی نے بھی ۳ر جون ۱۹۵۸ء کو اس دنیا سے منہ موڑ کر جنت کی راہ لی۔ مرحومہ کی شخصیت سوشل ایجوکیشن کی تحریک میں سوائے دلی کے حلقے کے اتنی جانی پہچانی نہیں تھی جتنی ان کے شوہر کی شخصیت مشہور و معروف تھی۔ ان کو اگر کوئی تھوڑا بہت جانتا بھی ہوگا تو ان کے راجیہ سبھا کے ممبر ہونے کی وجہ سے، اور غالباً اتنا بھی نہ ہوتا اگر خود پارلیمنٹ کے سکریٹریٹ کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبروں کا اعلان و اشتہار نہ کیا جاتا اور اب جو اور اخباروں میں اور سوگ کے جلسوں میں ان کا ذکر ہوا ہے اور ہو رہا ہے، یہ بھی نہ ہوتا اگر ان کا انتقال نہ ہوا ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحومہ جو کچھ تھیں اور انھوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد شہرت اور نام و نمود تھا ہی نہیں۔ جامعہ کے بالک ماتا سینٹر (۱) کی وہ ڈائرکٹر تھیں مگر اس اعزاز کی انھوں نے کبھی کسی سے خواہش نہیں کی بلکہ یہ عہدہ جامعہ نے ان کے اوپر زبردستی عاید کیا تھا۔ اسی طرح وہ میونسپل کمیٹی، راجیہ سبھا اور دوسری غیر سرکاری انجمنوں اور کمیٹیوں کی رکن تھیں مگر ان میں سے انھوں نے کسی کے لئے نہ کبھی خواہش کی نہ کوئی کوشش۔ ان چیزوں سے ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ نہ کبھی اپنے نام کا لیٹر ہیڈ چھپوایا، نہ ملاقاتی کارڈ، یہاں تک کہ راجیہ سبھا کے چھپے ہوئے لیٹر ہیڈ کا استعمال بھی بس ایک ہی آدھ بار کیا اور وہ بھی مجبوراً۔ بالک ماتا سینٹر کا لیٹر پیڈ استعمال کرتی تھیں مگر اپنے دستخط کے نیچے ہمیں یاد نہیں کہ کبھی ڈائرکٹر کا لفظ لکھا ہو۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی اعزاز یا عہدہ کسی کو کچھ کئے دھرے یا کہے سُنے بغیر بیٹھے بٹھائے مل جائے تو اس میں اعزاز پانے والے کا کیا کمال! اگر یہ بات مرحومہ سے کوئی بے تکلف اور منہ پھٹ دوست کہتا تو اُسے یہ جواب ملتا کہ "میرا تو کوئی کمال نہیں، اور میں تو چاہتی بھی نہیں مگر لوگ ہیں کہ نہ جانے کیوں مجھے گھسیٹے لئے پھرتے ہیں۔" لیکن ایک بات ہے جس کا ثبوت مرحومہ صدیقہ قدوائی نے زبان سے نہیں

---

(۱) بالک ماتا سینٹر ادارہ تعلیم و ترقی کے اس سیکشن کا نام ہے جس کے ذریعے ننھے ننھے بچوں اور ان کی ماؤں کی تربیت ہوتی ہے۔ اس سینٹر سے متعلق مفصل مضمون اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

اور عورتوں کو ہنرمند بنا دیا اور ایسا ہنرمند بنایا کہ مصیبت کے وقت اپنے اور اپنے بچّوں کے لئے معاش کا ذریعہ خود پیدا کرسکتی ہیں اور عزت کے ساتھ بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ انھوں نے ہمیں مصیبت سے مجبور ہوکر دوسرے کے گھروں کی پتیلیاں مانجھنے سے بچالیا۔ غرض ہماری زندگی تو بنادی مگر اپنی زندگی اس جد و جہد میں ختم کردی۔

درد سر کی شکایت انھیں والد صاحب کا اچانک انتقال ہونے سے ہوگئی تھی۔ وہ اس تکلیف کو بائیس تیئیس سال سے برداشت کررہی تھیں۔ محترم شفیق صاحب کی وفات کے بعد سے انھیں دورے کی شکایت اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ اس حالت میں بھی جامعہ کا تمام کام اور پارلیمنٹ کی ممبری کی ذمہ داریاں بخوبی انجام دیتی رہیں۔ باوجود ان کاموں میں منہمک رہنے کے ہر ایک کی مصیبت کو اپنی مصیبت اوروں کے درد کو اپنا درد سمجھتی تھیں۔ وہ غیروں کو اپنا خیال کرتیں اور غریب مسکینوں اور بیواؤں سے شفقت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ ان کی خوشی اور مصیبت میں برابر کی شریک رہتی تھیں۔

آپا جنیاں نے شفیق صاحب کے لگائے ہوئے پودے کو اپنے خون سے سینچ کر اتنا بڑا اور سایہ دار درخت بنالیا تھا کہ ساٹھ پینسٹھ عورتیں اور لڑکیاں اور ستر پچھتر بچے اس کے سایے میں بیٹھ کر علم و ہنر سے فیضیاب ہورہے تھے۔ ان کی نگرانی میں اس وقت تین سینٹر چل رہے ہیں بالک ماتا سینٹر ٹلیا محل۔ بالک ماتا سینٹر قصاب پورہ بالک ماتا سینٹر بیری والا باغ۔ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس سایہ دار درخت کو ہم پھل دار درخت کی شکل میں بدل دیں تاکہ ان کی روح خوش ہو۔ یہی ہماری اور آپ کی محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلیں اور ہمارے دلوں میں بھی ان کی طرح قوم کی خدمت کی لگن پیدا ہوجائے۔

عمل سے دیا اور وہ ہے مرحومہ کی وہ صلاحیت جس کے بل بوتے پر انھوں نے ان ذمے داریوں کو نبھایا اور اس شان سے نبھایا کہ تین چار سال کی قلیل مدت میں انھیں وہ مرتبہ نصیب ہوگیا جو ان لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا جو اعزاز اور نام و نمود کے پیچھے نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں اور اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں۔

ہندوستانی عورت کی سیرت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور وجود کو کھو کر شوہر کی شخصیت اور وجود کا جزو بن جاتی ہے اور اگر شوہر اس کی زندگی ہی میں مرجاتا ہے تو اپنی زندگی کو اپنے لئے عذاب سمجھنے لگتی ہے مگر شوہر سے اس کی محبت کی آزمائش بھی دراصل شوہر کے انتقال کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اس آزمائش میں وہی عورتیں پوری اُترتی ہیں جن کی محبت کی تڑپ سچی ہوتی ہے اور جو واقعی اپنے وجود کو شوہر کے وجود میں مدغم کر چکی ہوتی ہیں۔ محترمہ صدیقہ قدوائی انھی خوش قسمت اور جنّت نصیب عورتوں میں تھیں، انھوں نے اپنے عمل سے مرحوم شفیق صاحب کی روح پر واضح کر دیا کہ وہ ان کی زندگی ہی میں ان کی خوشی میں خوش نہیں تھیں بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی خوشی میں خوش رہنے کو انھوں نے اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لیا تھا۔

اس بیان کی وضاحت کی نہ ہم ضرورت سمجھتے ہیں، نہ اس کا یہاں موقع ہے۔ جو لوگ خصوصاً شفیق صاحب کے جو احباب اور ساتھی مرحومہ سے قریب تھے، وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اُنھوں نے شفیق صاحب کے سوچنے اور کام کرنے کے طریقے کو اپنا لیا تھا۔ چنانچہ اُن کو دیکھ کر اور اُن کے ساتھ کام کر کے شفیق صاحب کے احباب اور ساتھی مرحوم کا غم بھول چکے تھے۔ شفیق صاحب کے ایک ساتھی نے مرحومہ کی وفات پر بالکل سچ کہا کہ

"شفیق صاحب کا انتقال دراصل آج ہوا ہے"

تعلیم و ترقی



The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

Printer and Publisher : BARKAT ALI Firaq : Printed at Rama Krishna Printing Press Delhi.

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جلد (۹) جولائی ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر (۷)

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ، جامعہ نگر نئی دہلی،

ٹیلی فون نمبر ۴۲۲۴۶۱

قیمت سالانہ: چار روپے

کمیونٹی ڈیولپ منٹ میں

سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کا مقام

پچھلے چند سال سے سوشل ایجوکیشن کے بارے میں یہ بحث چل رہی ہے کہ وہ ایک مبہم اور غیر واضح سا تصور ہے۔ اس گفتگو کا آغاز ہمارے خیال میں اُس وقت سے ہوا جب کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی اسکیم پر عمل شروع ہوا اور اس میں سوشل ایجوکیشن کے لئے بھی ایک عہدہ دار مقرر ہوا۔ اس بحث نے یہاں تک طول پکڑ لیا کہ سنا ہے کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی ماؤنٹ آبو کی کانفرنس میں اسے کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام سے خارج کر دینے کی بات بھی آگئی تھی۔

اس صورتِ حال میں شری اے۔ آر۔ دلیش پانڈے کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے بہت سی غلط فہمیوں کی حقیقت روشن ہوتی ہے۔ مناسب ہوگا اگر کوئی اور صاحبِ نظر کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا یا اپنا آزادانہ نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے مضمون سپردِ قلم فرمائیں۔ ہم ایسے مضامین کو بڑے شوق سے شریکِ اشاعت کریں گے۔

——— ایڈیٹر

کیا سوشل ایجوکیشن کے مفہوم میں اُلجھاؤ ہے؟

نئی چیزوں کے بارے میں لوگوں پر عجیب عجیب ردِ عمل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اُلجھی ہوئی بات کو مان لیتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ اُسے سمجھ گئے ہیں۔ بعض اوقات اس کے برعکس ہوتا ہے،

ترتیبِ مضامین

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

آرگنائزروں کی پہلی ٹولی کا انتخاب ہوا اور اُن کی ٹریننگ شروع ہوئی۔

اس سلسلے میں ممکن ہے لفظ "اُلجھاؤ" (کنفیوژن) کا جو مطلب ہے، اس سے مسئلے کو سمجھنے میں کچھ مدد ملے۔ "کنفیوژن" (الجھاؤ) کے معنی ہیں "پھینک کر بکھیر دینا" یا "دماغ میں خلط ملط کی کیفیت کا پیدا ہونا"۔ آیئے تجزیہ کر کے دیکھیں کہ آیا واقعی یہ صورتِ حال رہی ہے ؟

جس وقت سوشل ایجوکیشن کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کا ایک حصّہ قرار پایا، اُس وقت اسے افسری ماتحتی کے ایک بالکل مختلف نظام سے دوچار ہونا پڑا۔ جہاں تک انتظامی مشینری کا تعلق ہے، اسے اپنے آبائی وطن یعنی محکمۂ تعلیمات سے الگ کر دیا گیا اور کام کے جانے پہچانے گلی کوچوں سے نکال کر دُور پھینک دیا گیا۔ اس کے لئے جو عہدہ دار (سوشل ایجوکیشن آرگنائزر) مقرر ہوا وہ اپنے اپنے مضمون سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی ایک ٹیم کا ممبر بن گیا۔ اس ٹیم کا افسرِ اعلیٰ جسے بلاک ڈیویلپ منٹ آفیسر یا پروجیکٹ ایکزی کیوٹیو آفیسر کہا جاتا ہے شروع شروع میں بیشتر محکمۂ مال سے منتخب ہو کر آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محکمۂ مال آزادی سے پہلے کے زمانے میں کارنامے کر کے دکھانے کے لئے مشہور تھا قطع نظر اس کے کہ وہ یہ کارنامے کن طریقوں کی بدولت دکھاتا تھا۔ پولیس کے زور سے کام لے کر کامیاب ہونے والے اس افسر کے بارے میں سمجھ لیا گیا کہ اگر اسے تبلیغ و تعلیم کے دھارے پر ڈال دیا جائے تو وہاں بھی وہ اسی طرح کامیاب رہے گا۔

تحلیل نفسی کے عالموں نے جہاں اور بہت سی ذہنی گتھیوں (کمپلیکس) کا پتہ لگایا ہے، اُسی طرح معلوم ہوتا ہے بعض لوگوں کو الہ دینی کمپلیکس بھی ہوتا ہے۔ انسان کے دماغ میں معلوم ہوتا ہے غیر شعوری طور پر ایک خواہش یہ ہوتی ہے کہ جادو کا کوئی چراغ ملے، جسے رگڑ کر جن کو بلا لیا جائے اور وہ آناً فاناً ان کی خواہش کے مطابق کام کر دے۔ جادو کا چراغ رگڑا گیا "جن" نمودار ہوا اور اس نے کھاد اور بیج وغیرہ تقسیم کرائے، سڑکیں بنوانے، گلیاں پکی کرانے اور کنوئیں پکے کرانے شروع کئے۔ گویا "کارنامے" انجام دینے والے عملے نے کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کے پروگرام کو اس معنی میں لیا۔ صحیح قسم کا طریقۂ فکر پیدا کرنا اوّل تو یوں ہی دیر طلب عمل ہے، اس کے لئے ابتداء میں جو راستہ اختیار کیا گیا، اس سے یہ اور بھی دیر طلب ہو گیا۔

اس لیل و نہار میں سوشل ایجوکیشن راستہ بھٹک گیا۔ یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ سوشل ایجوکیشن کو اپنا منصب ہی معلوم تھا بلکہ اس لئے ہوا کہ اُسے بن بُلائے مہمان کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس طرح کے ماحول میں غلط فہمیاں

لوگ واضح سے واضح بات کے بارے میں یہی کہتے جاتے ہیں کہ اس میں اُلجھاؤ ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سوال نفسیات کے ماہرین کے لئے ریسرچ اور تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس ریسرچ سے جو بات واضح ہوگی وہ یہ کہ اس قسم کا ردِ عمل، چاہے وہ اوّل الذکر نوعیت کا ہو چاہے مؤخر الذکر نوعیت کا، نتیجہ ہوتا ہے سوچنے والے کے طرزِ فکر کا، اس رجحان کا کہ "میں سب پر چھایا رہوں" یا اس خوف کا کہ کہیں میرے مخصوص نظریات پر ڈاکہ نہ پڑ جائے" یا پھر فرد، فرد، اور سنستھا سنستھا کے آپس کے تناؤ اور عداوت کا۔

اسی طرح کا ایک دلچسپ ردِ عمل سوشل ایجوکیشن کے بارے میں کمیونٹی ڈیولیپمنٹ پروگرام میں ہوا ہے اور یہ اُس وقت ہوا جب اس کی کچھ شکل نکلنے لگی کہا جاتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے مفہوم میں اُلجھاؤ ہے کچھ لوگ تو بڑی شد و مد سے یہ بات کہتے ہیں اور کچھ لوگ کانا پھوسی ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں کچھ اُلجھاؤ ضرور ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے انگلی رکھ کر بتانا کہ یہاں ہے اُلجھاؤ، ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ پارہ مچھلی کی طرح کی یہ چیز پکڑائی میں نہیں آتی۔

کچھ عرصہ پہلے ۱۹۴۷ء میں جب سوشل ایجوکیشن کا وسیع مفہوم سامنے آیا، اُس وقت اس طرح کے شکوک و شبہات اور جھگڑے نہیں تھے۔ یہ مفہوم ۱۹۵۱ء تک قائم رہا اور اس میں پختگی آتی رہی۔ اُسی زمانے میں (اور غالباً اس کے اسی وسیع مفہوم کی بنیاد پر) اُسے پہلے پنج سالہ پروگرام میں جگہ دی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ "کمیونٹی ڈیولیپمنٹ" کے چو طرفہ ترقی کے پروگرام میں اسے شامل کیا گیا اور یہ سمجھ کر شامل کیا گیا کہ پروگرام کے ماتحت جو عملی کام ہوگا اور جس کی بنیاد اس نظریئے پر ہوگی کہ جو کچھ ہو عوام کی شرکت سے ہو، سوشل ایجوکیشن اس کا سب سے اہم جزو ہوگا۔ یہ چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ جس وقت آزادی کی صبح نمودار ہوئی اس کے بعد سے بلا استثنا، ہر شخص یہی کہتا تھا کہ ہندوستان میں صحیح قسم کی جمہوری ریاست کی بنیاد رکھنے کے لئے سوشل ایجوکیشن بہت زیادہ ضروری چیز ہے۔ سوشل ایجوکیشن کے اصول اور ان اصولوں کی بنیاد پر جو پروگرام بنے ان کا اندازہ اب بھی وہی ہے جو ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد تھا اگرچہ اس کی تشریح و تعبیر میں اب زیادہ وضاحت آگئی ہے۔ اس صورت میں یہ بڑی ہی حیرت انگیز بات ہے کہ وہی تصور جو ۱۹۴۷ء کے زمانے میں تعریف و تحسین کا موضوع بنا ہوا تھا اور جسے سب لوگ اچھی طرح سمجھتے تھے، اب کمیونٹی ڈیولیپمنٹ پروگرام میں شامل ہونے کے بعد کیوں اور کس طرح تنقید و تحقیر کا موضوع بن گیا اور اس کے متعلق یہ کہا جانے لگا کہ یہ ایک اُلجھا ہوا تصور ہے۔ یہ تنقید اُبھر کر اس وقت سامنے آئی جب سوشل ایجوکیشن اور چیف سوشل ایجوکیشن

مہروں کی طرح ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک اُونچے افسر کو سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کے بارے میں یہ کہتے سنا گیا "اِن اُلو کے پٹھوں کو تقاوی بانٹنے پر لگا دو۔ اس میں وہ کچھ مفید کام کریں گے۔ اور نہ سہی تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیں گے۔"

جب سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے ساتھ انتظامی مشینری کے افسرِ اعلیٰ کا طرزِ عمل یہ ہو تو اُس کے دوسرے ساتھیوں اور گرام سیوک (ویلج لیول ورکر) اُس کے بارے میں کیا روش اختیار کرتے ہوں گے، اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی انتظامی مشین کا مخصوص کارنامہ ویلج لیول ورکر تھا جس کو مختلف النوع کام کرنے والے کارکن کی حیثیت دی گئی تھی، مگر وہ عملاً ایک واحد کام کرنے والا کارکن یعنی زراعتی مددگار کا مددگار بن کے رہ گیا۔ اُسے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام کی رتی برابر بھی پروا نہیں تھی سوائے کسی ایسی صورت کے جب کہ اُسے انتظامی مشینری کی پوری پوری حمایت حاصل ہوتی اور بلاک ڈیولپمنٹ افسر خود اس میں دلچسپی لیتا۔ خرابی تو تھی دراصل یہاں یعنی بلاک ڈیولپمنٹ افسر کے طرزِ عمل کی لیکن اوپر کے انتظامی افسران برابر یہ کہے جاتے تھے کہ ویلج لیول ورکر اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے درمیان جھگڑا اور عداوت رہتی ہے۔ ویلج لیول ورکر اور کسی دوسرے ماہرِ خصوصی کے درمیان بھی تناؤ اور عداوت کی یہی صورت پیش آ سکتی تھی اگر ویلج لیول ورکر کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پڑ جاتی کہ "صاحب" کو اس پروگرام سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے باوجود سب کے سب لوگ یہی کہتے رہے کہ جو کچھ کام ہو، اُسے ویلج لیول ورکر کے توسط ہی سے ہونا چاہئے۔

تو پھر کیا یہ سب واقعات اس لئے ظہور میں آئے کہ سوشل ایجوکیشن کے مفہوم میں الجھاؤ اور ابہام تھا؟ یا اس لئے کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا جو منصب اور پارٹ ہونا چاہئے وہ غیر واضح تھا اور اس کے فرائض کی وضاحت کے ساتھ فہرست بندی نہیں کی گئی تھی؟ اس طرح کی باتیں ہر جگہ اور ہر چھوٹے بڑے کی زبان سے سننے میں آتی ہیں اور غیر ملکی ماہروں اور کام کا اندازہ کرنے والی جماعت کی رپورٹوں میں بھی جگہ پا جاتی ہیں۔

جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا مفہوم صاف اور واضح نہیں ہے۔ تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ (الف) مفہوم یہ بات کہنے والے شخص ہی پر واضح نہیں ہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہو سکتا ہے کہ اُس شخص میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اگر یہ سبب ہو تو

بڑی آسانی سے راہ پاتی ہیں۔ گاڑی میں چار پہیئے پہلے ہی سے لگے تھے اور "منزل بہ منزل" مار رہے تھے۔ وہ کون سا کام ہے جو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کرتا ہے اور دوسرے افسران نہیں کر رہے ہیں ؟" یہ تھا وہ سوال جو اوپر سے نیچے تک تمام افسران اور کارکن اُٹھاتے تھے مگر اسی کے ساتھ اس کا جواب سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ یہی صورتِ حال دیکھ کر کاموں کی مقدار کا اندازہ کرنے والی جماعت (پروگرام ایوے لوایشن آرگنائزیشن) نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ سوشل ایجوکیشن کو گاڑی کے پانچویں پہیئے (مدِ فاضل) کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔" کتنا حسین فقرہ ہے! مگر اس کا جواب بھی اسی قدر حسین فقرے سے دیا جا سکتا ہے : "جی ہاں! پانچواں پہیہ یعنی اسٹیرنگ کا پہیہ! جس کے بغیر کل پُرزے کی چار پہیوں والی تیز رفتار گاڑی ٹھیک راستے پر چل ہی نہیں سکتی!" مگر یہ بات کہتا کون! کہنے والا پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے ڈرائیوروں کی چینِ جبیں کا شکار نہ ہو جاتا!

اپنے صحیح مقام سے محرومِ ہونے کے بعد اب تو یہی رہ گیا تھا کہ انتظامی مشینری کا افسر اعلیٰ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے لئے جو جگہ تجویز کرے، وہی اس کی جگہ ہو۔ یہ صورت حال بھی اس بات پر منحصر تھی کہ افسرِ اعلیٰ سوشل ایجوکیشن کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے۔ وہ اُسے بخوبی سمجھتا ہے، یا کچھ سمجھتا ہے کچھ نہیں، یا سرے سے اس کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس طرح اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا رہا جیسی انتظامی مشینری کے اوپر کے طبقوں سے آواز آتی رہی۔ اگر افسر نے یہ نظریہ قائم کیا کہ سوشل ایجوکیشن ڈرامے اور گانے بجانے کا نام ہے تو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر گیت لکھنے اور ڈرامے کرانے پر مامور ہو گیا۔ اگر اس نے سوچا کہ اس کا کام کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کا پروپیگنڈا کرنا ہے تو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی ڈیوٹی ڈھول پیٹنا اور نعرے لگانا قرار پائی۔ اور اگر "صاحب" نے سوشل ایجوکیشن کے مقابلے میں زیادہ فہم وادراک کا ثبوت دیا اور یہ سوچا کہ وہ گاؤں کی صحت وصفائی کی اصلاح یا دیہی صنعتوں کو فروغ دینے والا محکمہ ہے تو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر ہیلتھ ورکر یا دیہی صنعتوں کا انچارج بن گیا۔ اس طرح کی سرگرمیاں جو سوشل ایجوکیشن کا منصب قرار پاتی تھیں، وہ تو اس کے اصل منصب سے کچھ لگاؤ رکھتی بھی تھیں، لیکن سوشل ایجوکیشن کے فہم کے معاملے میں اگر معاملہ بالکل گول ہوا تو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی شامت آگئی۔ کبھی اُسے تقاوی بانٹنے کا کام دے دیا گیا، کبھی حساب کتاب رکھنے کا، کبھی سڑکوں کی پیمائش کا، کبھی دیہی صنعتوں کی مصنوعات فروخت کرنے کا، غرض اسی طرح کے اور بیسیوں کام جن کے لئے وہ آسانی سے ہاتھ آسکتا تھا۔ اگر اس نے کبھی کچھ کہا سنا تو اُسے یہ کہہ کر ڈانٹ بتائی گئی کہ ٹیم کے دوسرے

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے عملی کاموں (جاب) کی فہرست بندی نہیں کی گئی ہے۔ یہ ایک دوسرا ثبوت ہے اس بات کا کہ لوگوں کو جو بات جاننی چاہیے تھی، وہ اُن کے پلّے نہیں پڑی۔ جاب (عملی کام) کے معنی ہیں وہ کام جس کے وسیلے سے کارکن اپنے منصب کو عملی روپ میں لاتا ہے۔ اس قسم کے عملی کاموں کی فہرست بڑے شرح و بسط کے ساتھ مرتب کی گئی تھی۔ یہ کام یوں ہی نہیں ہو گیا تھا بلکہ سنہ ۱۹۵۲ء میں ریاستی حکومتوں کے مشورے سے ہوا تھا یعنی اس وقت جبکہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر ابھی میدان میں اُترا بھی نہیں تھا۔ مگر اس وقت سے اب تک کسی بھی موقعے پر یا کسی کانفرنس میں کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ یہ فہرست ناقص ہے اور اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں لوگوں کے منہ بند ہو جانے چاہئیں مگر وہ ہیں کہ مسلسل کہے ہی چلے جا رہے ہیں۔

یہ تو ہے حقیقت اس بات کی کہ سوشل ایجوکیشن کے مفہوم میں اُلجھاؤ ہے۔ کنفیوژن کے دوسرے معنی ہیں "دماغ میں خلط ملط کی کیفیت کا پیدا ہونا"۔ آئیے دیکھیں اس کی کیا حقیقت ہے۔ سوشل ایجوکیشن کا اصل مقصود ہے "وہ تعلیم جو زندگی میں بہتری پیدا کرے"۔ اس معنی میں سوشل ایجوکیشن عوام کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے، جن میں تعلیم کے عمل سے بہتری پیدا کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سوشل ایجوکیشن کے جامع پروگرام میں وہ تمام تعلیمی سرگرمیاں آتی ہیں جن کا زراعت، صحت، گھریلو صنعتوں، امداد باہمی کی انجمنوں، بستی کی تنظیم، سوشل ورک، گھریلو معیشت وغیرہ سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر ہوتا کیا ہے، زراعت کا ماہر خصوصی سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ زراعتی تبلیغ (ایکس ٹنشن) کے تحت آتا ہے، کسی دوسرے محکمے سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اُدھر سوشل ورک کا ماہر سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ سوشل ورک، کمیونٹی آرگنائزیشن اور گروپ ورک کے دائرے میں آتا ہے۔ سوشل ایجوکیشن کا مفہوم اس صورت میں یقیناً خلط ملط ہو جاتا ہے، اُن چیزوں کو جڑ سمجھ لیا جاتا ہے جو در اصل اس کی شاخیں ہیں اور زور اصل چیز پر سے ہٹ کر چند مادی سرگرمیوں پر آ جاتا ہے۔ اس طرح کا خلطِ مبحث کسی حد تک سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کے ٹریننگ سنٹروں میں بھی موجود ہے اس لئے کہ وہ ایسے اداروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں جن کا ایک نہ ایک مخصوص نصب العین سے تعلق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کچھ بعید نہیں کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر جو انھی ٹریننگ سنٹروں کی پیداوار ہوتا ہے، اُلجھن میں پڑ جائے اور سوشل ایجوکیشن کا صاف اور صحیح مفہوم اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے، اُسے ایک کامل سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے سانچے میں ڈھالنا

اس کا علاج یہ ہوسکتا ہے کہ وہ فرد مخصوص کسی لائق اُستاد کے پاس بیٹھ کر اس مضمون کا مطالعہ کرے۔ دوسرے یہ کہ (ب) سوشل ایجوکیشن کے بارے میں جو عبارت لکھی گئی ہے وہ ناقص ہے اور اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کہنے والے کی بات کا مطلب یہ ہے تو پھر ذمہ داری خود یہ بات کہنے والے کے اوپر آن پڑتی ہے کہ وہ سمجھائے اور ثابت کرے کہ مفہوم کے سلسلے میں جو عبارت لکھی گئی ہے وہ کہاں اور کس حیثیت سے ناقص اور نامکمل ہے۔ جب معاملہ اس منزل پر آتا ہے تو سو میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں نکلتا جو اس چیلنج کو قبول کرے! اور آخر پانی یہیں آکے مرتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے بارے میں وزارتِ تعلیم کی مطبوعات، پہلے پنج سالہ پلان، کمیونٹی پروجیکٹ کی جیبی کتاب اور سوشل ایجوکیشن کے ہدایت نامے (مینول) میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ان حضرات نے اُسے پڑھنے اور سمجھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ تو جانتے نہیں کہ مفہوم (کانسپٹ) کے معنی ہیں "عام تصوّر" کے، اور تنقید کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے منصب، اور اُس کے عملی کاموں کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تفصیلات ضروری ہیں، مگر وہ سوشل ایجوکیشن کے مفہوم کے باب میں جو بیان ہوگا، اس میں نہیں دی جائیں گی، اس لئے کہ وہ تو ہوتا ہی مختصر، جامع اور عام ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا پارٹ (رول) صفائی کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ رول کے معنی ہیں "کارِ منصبی" وہ کام جس کو انجام دینے کے لئے کسی کا تقرر کیا جاتا ہے اور جس کی کارکن سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اُسے انجام دے گا۔ سوشل ایجوکیشن کے ہدایت نامے (سوشل ایجوکیشن مینوَل) میں اس کا بھی ذکر موجود ہے اور اُس کے دو پہلو قرار دیئے گئے ہیں اور ہر ایک کو سمجھا کر بیان کیا گیا ہے۔ ایک (۱) عام رول جس کے ماتحت سوشل ایجوکیشن آرگنائزر تمام فنّی خدمات کے لئے ایک ہمہ گیر تعلیمی محکمے کے افسر کے طور پر کام کرے گا اور دوسرے (۲) اس کا سب سے الگ اور مخصوص منصب جس کے ماتحت وہ خواندگی کی کلاس، دیہی کتب خانے اور دوسرے تعلیمی کام کرے گا جن کی سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کے تحت پوری پوری وضاحت کی گئی ہے۔ یہ تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ اوّل الذکر پارٹ کے ادا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں گی مگر یہ کہنا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے منصب کی وضاحت نہیں کی گئی ہے، اپنی بے وقوفی کا اعلان کرنا ہے۔

خواندگی کی حمایت میں

زیادہ دن نہیں ہوئے، ہم نے نوسکھ بالغوں کے لئے ہندی کی کچھ کتابوں کی افادیت کا جائزہ لیا تھا اور یہ معلوم کیا تھا کہ ان نوسکھوں کی دلچسپیاں کیا ہیں اور انھیں کس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں مدھیہ پردیش، راجستھان، دہلی، اُتر پردیش اور بہار میں گاؤں گاؤں پھرنا پڑا۔ نوسکھوں اور اُستادوں سے تبادلۂ خیال ہوئے، سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں، کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور پلاننگ کمیشن کے افسروں سے بات چیت ہوئی، اور خواندگی کی متعدد کلاسوں کا مفصّل اور گہرا معائنہ کیا گیا۔ اُن معائنوں اور تجربوں کی روشنی میں میں چاہتا ہوں کہ خواندگی سے متعلق چند معروف خیالات اور بالغوں کو خواندہ بنانے کی جد و جہد میں جو خامیاں رہ گئی ہیں، ان کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کراؤں۔

ہندوستان میں بالغ خواندگی کی تحریک کی تاریخ بڑے اتار چڑھاؤ سے گذری ہے۔ ایک انجان آدمی کو جو صرف تماشائی کی حیثیت سے چیزوں کو دیکھتا ہے یہ تحریک بس ناکامیوں ہی ناکامیوں کا منظر پیش کرتی ہے کامیابیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ضعیف کی سفید داڑھی میں ایک آدھ کالے بال ہوں۔ "خواندگی ایک کوشش ناکام ہے۔" یہ بیان ایک مسلّمہ بن گیا ہے اور اتنا بدیہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہوتی ہے وہ بھی تعجب کرتے ہیں کہ یہ ناشدنی شدنی کیسے ہوگئی! یہ بڑی خطرناک صورتِ حال ہے اور یہ بیان جس شدّت اور یقین و ایمان کے ساتھ دیا جاتا ہے، وہ میرے خیال میں مغلوب الذہنی اور احساسِ شکست کا نتیجہ ہے۔ یہ احساس جتنا پریشان خیالی اور غیر واضح فکر کا نتیجہ ہے اتنا اس بات کا نہیں کہ کام سائنٹفک اور منظّم طریقے پر کیا گیا ہو اور پھر اس میں ناکامی ہوئی ہو۔ میں عام ڈگر سے ہٹ کر کہوں گا کہ "خواندگی کوشش ناکام نہیں ہے۔" اور اُسے مثبت اور منفی دونوں طرح کے طریق استدلال سے ثابت کروں گا۔

منفی استدلال

۔ اگر بالغ خواندگی ناکام رہی ہے تو ڈیولپ منٹ کی کونسی سرگرمی ہے جسے کامیاب کہا جاسکتا ہے؟

سان نہیں رہتا۔

مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود نہ جانے کیوں سوشل ایجوکیشن اب تک کمیونٹی ڈیلپ منٹ پروگرام کا جزو بنا ہوا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی یہ حوصلہ کیوں نہیں کرتا کہ اسے گھر سے ل دینے کی تجویز کرے۔ اس کے برعکس ابھی حال کی بات ہے کہ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں سوشل یلیشن ہی کو پروگرام کا سب سے اہم جزو قرار دیا گیا ہے۔ کیا لوگوں کے ذہنوں میں سوشل ایجوکیشن کا مفہوم اب ضح ہو رہا ہے یا یہ بات ہے کہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد اب آنکھیں کھل گئی ہیں کہ بغیر سوشل ایجوکیشن کی ۔ کے جو کچھ بھی عمارت ہم نے کھڑی کی ہے، اس کی بنیاد بن ریت کے اوپر ہیں؟

(انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن کے شکریے کے ساتھ)

ریاست	داخل ہونے والے بالغوں کی کل تعداد (سنہ ۵۴ء - سنہ ۵۵ء)	خواندہ بن کر نکلنے والے بالغوں کی تعداد (سنہ ۵۴ء - سنہ ۵۵ء)	اوسط فی صدی
آسام	۴۶,۳۸۵	۳۱,۴۴۴	۶۷.۸
بہار	۹۸,۰۲۳	۶۷,۰۹۹	۶۸.۵
بمبئی	۴,۱۷,۷۳۳	۱,۲۲,۱۷۸	۲۹.۲
مدھیہ پردیش	۴۷,۵۴۲	۷,۸۰۰	۱۶.۵
اتر پردیش	۱۰,۸۱۱	۶,۰۶۶	۵۶.۱
مغربی بنگال	۱,۲۱,۵۳۱	۴۳,۴۴۶	۳۵.۷
حیدرآباد	۵۶,۱۶۸	۴۶,۴۳۲	۸۲.۷
میسور	۲۴,۸۷۶	۱۶,۳۷۰	۶۵.۸
راجستھان	۱۱,۰۲۵	۱۱,۰۲۵	۱۰۰.۰
دہلی	۱۱,۶۰۹	۸,۰۰۲	۶۸.۶
میزان	۸,۴۵,۶۷۶	۳,۵۹,۴۶۲	۴۲.۶

مندرجہ بالا اعداد و شمار وزارت تعلیم کی کتاب "سنہ ۵۴-۵۵ء میں ہندوستان میں تعلیم کی کیفیت" سے لئے گئے ہیں۔ اس نقشے کے مطابق جتنے بالغ خواندگی کی کلاسوں میں داخل ہوئے تھے ان میں سے ۴۲.۶ فیصدی نے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس تعداد میں جو لوگ فیل ہوئے انھیں بھی شمار کرلیا جائے تو کلاس میں آخر وقت تک ٹکنے والوں کا اوسط کچھ نہیں تو ۵۰ فیصدی تک تو یقیناً پہنچ جائے گا۔ ہمارے دوسرے پروگراموں میں وہ کون سا پروگرام ہے جس میں حصہ لینے والوں میں سے ۵۰ فیصدی آخری وقت تک حصہ لیتے رہتے ہیں اور ان میں سے ۴۲.۶ فیصدی منزل مقصود پر بھی پہنچ جاتے ہیں؟

اب آیئے اس "کوشش ناکام" کے اوپر ایک دوسرے زاوئے سے نظر ڈالیں۔

ایک گاؤں ہے جس میں تیس خاندان رہتے ہیں۔ ہر خاندان پانچ افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تقریباً

ڈیولیپ منٹ کی اُن سرگرمیوں کو تو شاید کامیاب کہا جائے جن کے اوپر سب لوگوں کی نظریں جمتی ہیں جیسے بیج اور کھاد کی تقسیم۔ مگر ایسے پروگرام جن کے ذریعے لوگوں کو ہم کوئی نئی بات سکھانا چاہتے ہیں، یا اُن کے طرزِ عمل اور طریقۂ فکر میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں، کچھ بہت کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ کسی ایک گاؤں کو لے لیجئے اور سوچئے کہ اس میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو نئے قسم کے پاخانوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ بے دھوئیں کے چولھے بناتے اور استعمال کرتے ہیں، اچھی نسل کی مرغیاں پالتے ہیں یا جاپانی طرز پر چاول کی کاشت کرتے ہیں؟ اسی طرح کتنی پنچایتیں ایسی ہیں جو پارٹی بازی یا اسی طرح کی دوسری لعنتوں سے پاک ہیں؟ یہی حال چھوت چھات، فرقہ پرستی، اور ذات پات کی تمیز کا ہے۔ کیا ہم ان چیزوں سے نجات پاگئے ہیں؟ امداد باہمی کی سوسائیٹیوں کو لیجئے۔ کیا یہ سوسائیٹیاں واقعی، اپنے ممبروں ہی میں سہی، تعاون اور سہجوگ کا شعور پیدا کر رہی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے ذریعے چالاک اور زمانہ ساز ممبر سیدھے سادے ممبروں کو اکسپلائٹ کر رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے عوام کو امن پسند، وسیع القلب اور جمہوری المزاج بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ کیا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے جو کوششیں کی ہیں، وہ کامیاب کہی جاسکتی ہیں؟ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری یہ کوششیں حوصلہ شکن نہیں ہیں، ہماری ترقیاتی سرگرمیاں براہِ راست نہ سہی، لوگوں کے طرزِ فکر پر اچھا اثر چھوڑ رہی ہیں، نئے خیالات تیزی کے ساتھ نہ سہی، مگر جڑ ضرور پکڑ رہے ہیں اور یہ کہ تھوڑی ہی تعداد میں سہی، لوگ نئے خیالات اور ڈھنگوں کو اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

جب ڈیولیپ منٹ کے اپنے دوسرے پروگراموں کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر اس طرح کا ہے تو پھر وہ کون سا معیار ہے جس کے اوپر پرکھ کر ہم بالغ خواندگی کو ناکام کہتے ہیں؟ کیا ہر بستی میں لوگوں کی ایک تعداد خواندگی کی دعوت پر لبیک نہیں کہتی؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بالغ خواندگی کی ہر کلاس سے کچھ لوگ ہمارے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق خواندہ بن کر نکلے ہیں؟ ایک عام شکایت یہ ہے کہ خواندگی کی کلاسوں میں جتنے طالب علم بھرتی ہوتے ہیں، ان میں سے بہت کم آخر وقت تک ٹکتے ہیں۔ مگر کیا آخر وقت تک ٹکنے والوں کا تناسب اوسطاً پچاس فی صدی نہیں ہوتا؟ ذرا اعداد و شمار کے مندرجۂ ذیل نقشے کو ملاحظہ فرمائیے:-

سخت گرمی کا زمانہ ہے۔ پسینہ سے تر اور ہو رہے ہیں اور کیڑے ہیں کہ پلے پڑ رہے ہیں۔ کمرے میں ٹھوسم ٹھاس اتنی ہے کہ ہلنے کو جگہ نہیں ہے، آرام سے بیٹھنا تو دُور رہا۔

لکھنؤ میں دو کلاسیں کھلی ہوا میں لگی ہیں۔ دو فٹ لمبے اور ڈیڑھ فٹ چوڑے دو بلیک بورڈ کرسیوں پر اٹکا دیئے گئے ہیں۔ ذرا تیز ہوا چلی کہ بورڈ اُڑے۔ لالٹین بھڑک اُٹھتی ہے اور اس سے اس کے شیشے کالے پڑ جاتے ہیں۔ مگر طلباء ہیں کہ قدرت اور انسان کی ان ستم ظریفیوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور آٹھ سے دس بجے رات تک اپنی اپنی کتابوں پر جیسے گرے پڑ رہے ہیں۔

ایک اور کلاس ہے جو یوں سمجھئے سڑک کے کنارے لگی ہے۔ ۲۰ طالب علم دو روز سے آتے ہیں اور ۸ سے ساڑھے نو بجے رات تک اُستاد کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب تیسرے دن تشریف لاتے ہیں، مگر پھر بھی طلباء خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ سبق شروع ہوتا ہے۔ ماسٹر صاحب بورڈ پر کچھ لکھتے ہیں۔ بورڈ پر روشنی نہیں ہے اور لکھی ہوئی چیز پاس والے مکان اور سڑک کے بجلی کے کھمبے سے جو ذرا ذرا روشنی آ رہی ہے، اس کی مدد سے دُھندلی دُھندلی نظر آ جاتی ہے۔ مگر پھر بھی طلباء اُسے پڑھ لیتے ہیں اور اپنی اپنی کاپیوں پر اس کی نقل اُتارتے ہیں۔ ہم جب دوسری کلاس دیکھ کر پونے گیارہ بجے لوٹے تو دیکھا کہ وہ اُسی حالت میں اب بھی جمے بیٹھے ہیں۔

میسور کے ایک گاؤں میں خواندگی کی کلاس کا نقشہ یوں ہے :- پرائمری اسکول کا ایک کمرہ ملا ہُوا ہے جس میں گنجائش بھی ہے، پکا فرش اور کھڑکیاں بھی ہیں۔ کمرے کی دیواروں سے ۳۰ طالب علم لگے بیٹھے ہیں۔ ہر طالب علم کے سامنے مٹی کا ایک ایک دیولا رکھا ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے تو دیولے ٹمٹمانے لگتے ہیں اور کمرہ دھوئیں سے گھٹنے لگتا ہے۔ ہر طالب علم کے سامنے جو اُکڑوں بیٹھے ہیں ایک ایک پرائمر اور ایک ایک سلیٹ رکھی ہے۔ ایک عمدہ قسم کا بلیک بورڈ آویزاں ہے جو سب سے دُور بیٹھے ہوئے طالب علم سے ۱۵ فٹ کے فاصلے پر پڑتا ہے۔ بلیک بورڈ کے نیچے ایک میلی کچیلی سی لالٹین رکھی ہے جس کی روشنی دیوار میں اونچائی پر لگے ہوئے بورڈ پر بس یوں ہی سی پڑ رہی ہے۔ اُستاد بورڈ پر کچھ لکھتا ہے جس کی طرف طالب علم اپنی نگاہیں جماتے ہیں اور خدا خُدا کر کے حروف کی شکلیں دیکھ لیتے ہیں، اور پھر پورے انہماک کے ساتھ اپنے اپنے سلیٹ پر اس کی نقل اُتارتے ہیں۔ انھیں جو پنسل دی گئی ہے وہ اتنی سخت ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نقش اُبھرتا ہے مگر پھر بھی طلباء صبر و سکون کے ساتھ ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے اسی حالت میں لکھتے پڑھتے رہتے ہیں اور ان

۳۰ مرد یا تو ۴۵ سال سے اوپر کی عمر کے ہیں یا خواندہ ہیں۔ اس طرح گاؤں بھر میں کل ۲۵ آدمی ایسے ہیں جو خواندگی کی کلاسوں میں آسکتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۱۵ آدمی تو کلاس میں آتے ہی ہیں یعنی کل تعداد کا ۶۰ فیصدی۔ ان ۱۵ میں سے سات آٹھ ایسے ہیں جو آخر وقت تک ٹکیں گے یعنی داخلہ لینے والوں کا ۵۰ فیصدی۔ پھر ان ۱۵ میں سے چھ سات یعنی تقریباً ۴۰ فیصدی امتحان میں پاس بھی ہوتے ہیں۔ تو کیا کسی ایسے پروگرام کو جس میں آبادی کا ۶۰ فیصدی حصّہ شریک ہوا اور اس کا ۵۰ فیصدی آخر وقت تک شریک رہے اور اس ۵۰ فیصدی میں سے ۴۰ فیصدی منزلِ مقصود پر بھی پہنچ جائے، "کوشش ناکام" کا لقب دیا جا سکتا ہے؟

اب اُن حالات اور ماحول پر بھی نظر ڈالئے جس میں آبادی کا ۵۰ فیصدی حصّہ مسلسل چار پانچ مہینے زندگی گذارتا ہے۔ نیچے ہندی بولنے والی چند ریاستوں میں خواندگی کی کلاس کی جو کیفیت ہوتی ہے، اس کا منظر پیش کرتا ہوں۔

یو۔ پی کے ایک گاؤں میں ہریجنوں کی ایک کلاس کی تصویر ملاحظہ فرمایئے:۔ مٹی کا بنا ہوا ایک پنچایت گھر ہے جو کلاس لگانے کے لئے دے دیا گیا ہے۔ ہال میں ۲۰ طالب علموں کے لئے کافی گنجائش ہے، جاڑے کے دن ہیں اس لئے گرمی پہنچانے کے لئے فرش پر پیال ڈال دیا گیا ہے۔ ہال میں دو عدد ٹمٹماتی ہوئی لالٹینیں اور چھ دیولے روشن ہیں۔ پیال بچھے ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے فرش ہموار نہیں ہے، اور دیولوں کو فرش پر جما کر رکھنا اور اُس کی روشنی میں پڑھنا مشکل ہے۔ پیال میں آگ لگ جانے کا بھی ڈر ہے۔ مجبوراً طالب علم ایک ہاتھ سے دیولے کو تھامے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے سلیٹ پر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی حالت میں وہ ہر روز رات کو دو دو گھنٹے کام کرتا ہے۔

دلّی کے ایک گاؤں کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ بھی ہریجنوں کی کلاس ہے۔ نیچے فرش گرد سے اٹا ہے اور اوپر چھت کی جگہ آسمان ہے۔ بیٹھنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ البتّہ ایک ڈھیلی ڈھالی اور خستہ حال کھاٹ بیچ میں پڑی ہے۔ کھاٹ کے بیچ میں ایک لالٹین رکھی ہوئی ہے جو اس قدر ڈگمگا رہی ہے کہ کسی وقت اُلٹ سکتی ہے۔ کلاس کے طلبا، گھٹنوں کے بل کھاٹ کے ارد گرد بیٹھے ہیں اور اپنی اپنی کتابیں اس کی پٹیوں پر ٹکائے ہوئے ہیں اس حالت میں وہ ایک مدّت تک لکھنا پڑھنا سیکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مدھیہ پردیش کا ایک گاؤں ہے۔ اس میں ایک کمیونٹی سنٹر ہے جس میں ایک ریڈیو سٹ لگا ہوا ہے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں طالب علم ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے ہیں اور کچھ اور لوگ آس پاس کھڑے ہیں

بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔

۲۔ اپنا وقت اور توجہ بچوں کی تعلیم پر صرف کیجیے۔ ایک یا دو نسلوں کے بعد ملک میں کوئی شخص ان پڑھ نہیں رہے گا۔

۳۔ لوگوں کے لئے پڑھنا لکھنا سیکھنے میں کوئی "کشش" نہیں ہوتی۔

۴۔ داخلہ لینے کے بعد بہت بڑی تعداد میں لوگ کلاسوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا خواندگی سے کچھ حاصل نہیں۔

مضمون کی آئندہ شائع ہونے والی قسطوں میں
مضمون نگار نے ان دلائل کا جواب دیا ہے۔
ایڈیٹر

میں بعض کا خط بھی نہایت عمدہ ہے۔

خواندگی کی کلاسوں کے طریقۂ تنظیم، ان کے ماحول اور امتحانوں کے نتائج کو نظر میں رکھئے تو میرا خیال ہے کہ بالغ خواندگی کے باب میں مایوسانہ نقطۂ نظر قائم کرنا صحیح نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود کچھ لوگ جو احساسِ شکست یا خیال پرستی کا شکار ہیں، یہاں تک کہنے میں تکلّف نہیں کرتے کہ "تعلیم کے لئے خواندگی ضروری نہیں ہے۔ عوام کو دکھا سُنا کر تعلیم دینے والے آلات، مظاہروں اور بحث مباحثے کے ذریعے تعلیم دی جاسکتی ہے۔" اس مضحک طرزِ فکر کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اس کا جواب بھی اُسی قدر مضحک طریقے پر دیا جائے۔ "بہت اچھا! تو پھر ٹانگ پھیلا کر سو جایئے اور صبح کو اس شان سے اُٹھیئے کہ آپ کی لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رخصت ہو چکی ہو۔ اور پھر دیکھیئے کہ آپ سرکاری اور سماجی حیثیت سے جس مرتبے پر فائز ہیں، وہ کب تک قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد کوشش کیجئے کہ دکھا سُنا کر تعلیم دینے والے آلات اور دوسرے ذرائع سے اپنے آپ کو تعلیم دے کر اُسی مرتبے پر پھر پہنچ جائیں!" میرا مقصد ان ذرائع تعلیم کی مخالفت کرنا نہیں ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے دماغ کھلتا ہے۔ یہ ایک حقیقی تجربہ ہے۔ یہ دماغ کو تبدیلی قبول کرنے کے لئے تیار کرتا ہے اور تعلیم کے غیر رسمی ذرائع سے مستفید ہونے کے قابل بناتا ہے۔ یہی وہ بُنیاد ہے جس کے اوپر سوسائٹی کی عمارت کھڑی کی جانی چاہیئے۔

جس قسم کے کارکنوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ عوام کو خواندہ بنانے کی کوششوں کو ترک کرنے کے حق میں مندرجۂ ذیل فرسودہ دلائل پیش کرتے ہیں —— خواندگی کے خلاف جو تبدیلی لانے اور اُسے قبول کرنے کا کارگر ترین ذریعہ ہے، جس کے ذریعے عوام آزاد شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق اور فرائض سے واقف ہوتے ہیں، جس کے فیض سے وہ اپنے آپ کو ذات پات، فرقہ پرستی اور بے بنیاد توہمات کے جال سے نجات پا سکتے ہیں۔ جس کی بدولت وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے پروگراموں اور دعووں کے بارے میں صحیح فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں، جس کے اثر سے ان کے اندر جذبات سے الگ ہو کر سوچنے کی عادت پڑ سکتی ہے۔ غرض وہ جمہوری سوسائٹی کا سنگِ بنیاد بن سکتے ہیں۔

وہ دلائل یہ ہیں:

۱۔ ایک شخص جو "تعلیم یافتہ" بننا چاہتا ہے، اس کے لئے "خواندہ" بننا ضروری نہیں ہے۔ لوگوں کو دکھا سُنا کر تعلیم دینے والے آلات، مظاہروں اور بحث مباحثے کے ذریعے "تعلیم" دی جاسکتی ہے۔ خواندگی

وہ معاشی پلان سے غیر مربوط اور الگ الگ سا معلوم ہو"

تو کیا جس بات کا ذکر ڈاکٹر خاکیہ نے کیا ہے اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ یہ بات کوآپریٹیو اور تعلیم کے موضوع سے اتنی متعلق نہیں ہے جتنی فنڈامنٹل ایجوکیشن یا بالغوں کی تعلیم سے متعلق ہے؟ ہم کہیں گے "ایسا نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ زراعتی یا کسی بھی کوآپریٹیو میں اس بات کا امکان نہیں ہوتا کہ اس میں باہر کے لوگ ممبر بنیں اور بالغوں کے معلم کی حیثیت سے کسانوں کو کھیتی باڑی کے کسی ایسے طریقے کی تعلیم دیں جس سے وہ پہلے سے بے خبر تھے۔ اس کے برخلاف کوآپریٹیو کی تحریک ایک ایسی تحریک ہے جو اپنے آپ آگے بڑھتی ہے اور اس میں کھیتی باڑی کے فنی طریقوں میں انقلاب پیدا کرنے پر بہت زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ تعلیم کا جو پہلو اس قسم کی سوسائٹیوں میں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ کے موقعے زیادہ ملتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے اور باہمی عہد و پیمان کے احترام کا سلیقہ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح سے کسان تنہائی کی چہار دیواری سے باہر نکل آتا ہے اور اپنی انفرادیت کو کھوئے بغیر ایثار و قربانی اور دوسروں کی خدمت کے جذبے کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور آگے چل کر نہ صرف یہ کہ کھیتی باڑی کی دوسری سوسائٹیوں سے اس کا تعلق پیدا ہوتا ہے بلکہ پیدا کرنے والی (پروڈیوسر) اور خرچ کرنے والی (کنزیومر) سوسائٹیوں سے بھی اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

کچھ تھوڑے سے فرق کے ساتھ بالکل اسی طرح کی بات ساہوکارے کی سوسائٹیوں کے نظام پر بھی پوری اترتی ہے حالانکہ اس کا اولین مقصد خالصتہً معاشی ہوتا ہے یعنی اپنے ممبروں کو بنیکوں کے قرضوں سے نجات دلانا اور ان کی فوری ضرورتوں کے لئے کم مدت کے قرضے منظور کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان سوسائٹیوں کے تمام ممبروں میں جماعتی روح پیدا ہو گئی ہے۔ ان میں آزادی و خود مختاری کی لگن پیدا ہو گئی ہے اور انھیں اپنی ذمے داریوں سے ٹھیک ٹھیک واقفیت پیدا ہو چلی ہے۔

اب مزدوروں کی پیداوار کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کو لیجئے۔ اس قسم کی سوسائٹیوں کی تنظیم کا ڈھنگ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں اونچی سے اونچی قابلیت اور سوجھ بوجھ والے ممبروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دوسری قسم کی سوسائٹیوں کے مقابلے میں اس طرح کی سوسائٹیوں کا حال کم سننے میں آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعداد کم ہے۔ مگر ایسی بات نہیں ہے کہ اس طرح کی سوسائٹیوں کا کوئی تعلیمی پہلو نہیں ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی سوسائٹیاں دوسری قسم کی سوسائٹیوں کے مقابلے

امدادِ باہمی کی تعلیمی اہمیت

(۲)

اس مضمون کی یہ دوسری قسط ہے پہلی قسط میں جو جون ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، امداد باہمی کی ان انجمنوں کے بارے میں ذکر کیا گیا تھا جو عموماً چھوٹے پیمانے کی ہوتی ہیں اور جن کی تعلیمی اہمیت بیّن اور واضح ہوتی ہے۔ مضمون کی اس دوسری قسط میں بیشتر بڑے پیمانے کی اور اُن انجمنوں کا ذکر ہے جن کی حیثیت خالصتہً کاروباری اور معاشی ہوتی ہے اور ان کی تعلیمی اہمیت صاف اور واضح نہیں ہوتی۔ فاضل مضمون نگار نے اس قسط میں ثابت کیا ہے کہ تعلیمی اہمیت ان انجمنوں کی بھی ہوتی ہے اور اُن سے بھی وہی تعلیمی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو عام انجمنوں سے۔

—— ایڈیٹر

کھیتی باڑی کی، ساہوکارے کی اور مزدوروں کی سوسائٹیاں

کاروباری کوآپریٹو کی طرح دوسری سوسائٹیوں کے بارے میں بھی جو ان مقررہ اصولوں پر قائم کی گئی ہوں، تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ بھی یقیناً تعلیمی قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جی۔ فاکیٹ نے اپنی ایک کتاب میں بڑی صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کتاب میں جہاں اُنھوں نے ڈیری کوآپریٹیو سوسائٹی کے کام کے طریقوں کا ذکر کیا ہے، وہاں انھوں نے بتایا ہے کہ ایک زراعتی کوآپریٹیو میں کے لئے کیا کیا چیزیں ہونی چاہئیں اور کس طرح اس کی معاشی اور اخلاقی قدریں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے مصنف مسٹر مارس کولمبائن نے اپنی کتاب "کوآپریٹیو اینڈ فنڈامنٹل ایجوکیشن" میں پسماندہ ملکوں کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "معاشی امدادِ باہمی کا کوئی پروگرام بھی ایک تعلیمی پروگرام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان سوسائٹیوں کی طرف سے کوئی تعلیمی پروگرام شروع کیا جا-

۳۔ دو لاکھ پچپن ہزار قرضے کی سوسائیٹیاں جن کے ممبروں کی تعداد تین کروڑ ۱۳ لاکھ ہے، ہر سوسائٹی کی ایک کمیٹی ہے جس کے تین سے لے کر پانچ تک ممبر ہوتے ہیں اور ایک 'مینیجنگ' بورڈ ہے جس کے تین ممبر ہوتے ہیں۔

۴۔ نو ہزار سات سو سامان تیار کرنے والی سوسائیٹیاں جن کے آٹھ لاکھ ممبر ہیں۔

کیا اسے چند گنے چُنے آدمیوں کی گروہ بندی کہا جائے گا؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انھیں یعنی سوسائیٹیوں ان ممبروں کو جمہوریت کا نگہبان کہا جائے کیوں کہ وہ آزادی پر یقین رکھتے ہیں، اس کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور ی اس کے اصولوں کے پابند ہوتے ہیں۔

یہ اعداد و شمار تو اُن سوسائیٹیوں کے ہیں جو امداد باہمی کے بین الاقوامی وفاق سے الحاق رکھتی ہیں۔ کے علاوہ ہزاروں سوسائیٹیاں ایسی ہیں جن کا اس بین الاقوامی وفاق سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے چین، ہندوستان ریقہ، حبش، مراکو، نیوگنی، رومانیا۔ سوویٹ یونین، کناڈا، یوگوسلاویہ وغیرہ کی بڑھئیوں، مچھیروں، کسانوں ستکاروں اور جاپان اور دوسرے ملکوں کی صحت کی سوسائیٹیاں۔ کولمبائن نے جس کی کتاب کا پہلے حوالہ اجا چکا ہے، ان سوسائیٹیوں کے بارے میں بڑے غور و فکر کے بعد اور نہایت محتاط انداز میں لکھا ہے، اس نف کی کتاب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوسائٹیاں کس طرح پورے گاؤں کے لئے تعلیم و تربیت کا مرکز ن جاتی ہیں۔

یک مشکل مسئلہ

یہ تو ہوئی ان سوسائیٹیوں کی بات جو چھوٹے پیمانے پر منظم ہوتی ہیں اور بیشتر پیشہ ور لوگ اس کے ممبر وتے ہیں جیسے زراعت پیشہ لوگ، مچھیرے، دستکار وغیرہ جو اگر جلسوں کی شکل میں نہیں تو اپنے پیشے کے ناظ سے ان سوسائیٹیوں کے ماتحت مل جُل کر کام کرتے ہیں۔ مگر بڑی بڑی کاروباری سوسائیٹیوں کے بارے یں کیا رائے ہے جن کے ممبر تو کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں مگر ان کے درمیان اگر تعلق بالکل نہیں ختم ہو جاتا روز بروز کمزور ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ محض گاہک بن کے رہ جاتے ہیں اور اُن کی سوسائٹی عام کاروباری اداروں ی طرح ایک بڑا کاروباری ادارہ۔

میں مزدور کی شخصیت پر پوری طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور اس کی زندگی کو بالکل بدل دیتی ہیں۔ ان سوسائیٹیوں کی بدولت وہ محض اُجرت پر کام کرنے والا مزدور نہیں رہ جاتا، اور اس کی محنت اور کام صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہیں رہ جاتا، بلکہ ایک ایسی حقیقت بن جاتی ہے جو اس کی زندگی میں ایک مقصد پیدا کر دیتی ہے اور زندگی میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

مختصر الفاظ میں مزدوروں کی کوآپریٹیو ـــــ خواہ مزدور کسی طرح کے کاروبار میں کام کیوں نہ کرتا ہو، سرمایہ دارانہ قسم کے کاروبار میں، عوامی ملکیت کی قسم کے کاروبار میں یا امداد باہمی کے کاروبار میں ـــــ مزدوروں کے باہمی تعلقات کو امداد باہمی یا کوآپریشن کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ وہ ڈاکٹر فاکیٹ کے بقول مزدوروں کے لئے کوآپریشن کی عملی تعلیم کا سب سے کارگر اسکول ہے اور یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے امداد باہمی کی تمام انجمنوں کو جدوجہد کرنی چاہئے ـــــ یہ مقصد ایک ایسی تہذیب کی تعمیر ہے جس کی بنیاد فرد کے وقار اور ذمے داری کے اوپر ہو۔ تھوڑے لفظوں میں یوں کہئے کہ کوآپریٹیو اپنے ممبروں کی تربیت کرتی ہے اور یہی اس کی تعلیمی خصوصیت ہے۔

کیا اس تعلیمی پہلو سے کوآپریٹیو کے تمام ممبر فائدہ اُٹھاتے ہیں؟

کوآپریشن کی تعلیمی قدر و قیمت اگرچہ ایک حقیقت ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک کثیر تعداد اس فائدے سے محروم ہے، اعداد و شمار کے اعتبار سے لاکھوں ممبران کوآپریٹیو کے تعلیمی فائدوں سے محروم ہیں اور کوآپریٹیو کے کاروبار کے بس نفع نقصان سے مطلب رکھتے ہیں۔ تو کیا کوآپریٹیو تحریک کا اوّلین مقصد چند گنے چنے لوگوں کو پیدا کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب نیچے کے اعداد و شمار سے ملے گا۔ اس وقت امداد باہمی کی سوسائیٹیوں کے بین الاقوامی وفاق (انٹرنیشنل کوآپریٹیو الائینس) سے حسب ذیل کوآپریٹیو سوسائیٹیاں ملحق ہیں:

۱۔ بیالیس ہزار تین سو کاروباری سوسائیٹیاں جن کے پانچ لاکھ سے زاید ممبر ہر ہفتے ان ذمے داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے لئے آپس میں ملتے جلتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ چونسٹھ ہزار تین سو زراعتی کوآپریٹیو سوسائیٹیاں جن کے ایک کروڑ پچھتر لاکھ ممبر روزانہ ان سوسائیٹیوں میں کام کر کے اپنی مشترک ذمے داریوں کی مشق کرتے ہیں۔

۵۔ لیکچر اور تقریریں۔ بعض سوسائٹیوں کے یہاں تقریریں اور لیکچر بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر تقریر کرنے والا کوئی مشہور شخص ہوتا ہے تو سننے والوں کی تعداد کئی کئی سو تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکچر میں عام طور پر لوگ بہت کم دلچسپی لیتے ہیں اس لئے کسی موضوع کے اوپر مباحثہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں موافقت اور مخالفت میں بولنے والے تین تین مقرر حصہ لیتے ہیں۔ اس صورت میں سننے والے زیادہ تعداد میں بھی آتے ہیں اور نسبتاً دلچسپی بھی زیادہ لیتے ہیں۔

۶۔ سینما سینما یا فلم کے تماشوں کا قریب قریب ہر کوآپریٹیو میں انتظام ہوتا ہے اور ان میں حاضری بھی معقول ہوتی ہے۔ فلم کو اپنے مقصد سے زیادہ سے زیادہ قریب رکھنے کی غرض سے بہت سی کوآپریٹیو سوسائٹیاں خود اپنے یہاں فلم بنانے کا انتظام رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف سوسائٹیوں کے درمیان فلموں کی ادلا بدلی بھی ہوتی ہے۔

۷۔ کتابیں اور کتب خانے۔ تقریب قریب سبھی کوآپریٹیو سوسائٹیوں نے اپنے اپنے پبلشنگ ہاؤس قائم کر رکھے ہیں جو اپنے تعلیمی شعبوں کی چیزیں بھی چھاپتے ہیں اور عام مذاق کی کتابیں بھی۔ بہت سی کوآپریٹیو سوسائٹیوں اور کوآپریٹیو یونینوں کے اپنے اپنے کتب خانے بھی ہیں اور جہاں تک کوآپریشن، معاشیات اور دوسرے سماجی علوم کی کتابوں کا تعلق ہے، ان کا شمار ملک کی بہترین لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ یہ ادارے یعنی کوآپریٹیو پریس اور کتب خانے ریسرچ کے کام میں طالب علموں کی بڑی مدد کرتی ہیں؛ انھیں ریسرچ کے مقصد کے لئے کتابیں بہم پہنچاتی ہیں اور ان کے کاموں کو چھاپتی ہیں۔

۸۔ ممبروں کی سیر و سیاحت کا انتظام۔ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی طرف سے ممبروں کے جتھوں کے لئے سیر و سفر کا انتظام روز بروز ترقی پر ہے۔ ان سیاحتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹیوں کے ممبر خود اپنے ملک اور باہر کے ملکوں سے واقفیت حاصل کریں اور اپنے ملک کے اور دنیا کے اچھے اور صحت مند شہری بنیں۔ یہ کام یہ سوسائٹیاں ٹریڈ یونینوں اور دوسرے اداروں سے مل کر کرتی ہیں۔ ممبروں کے علاوہ سوسائٹیاں اپنے ملازموں کے لئے بھی اس طرح کے سفر کے موقعے بہم پہنچاتی ہیں۔ "کارکنوں کی سیاحت" کی اسکیم جس کے اوپر یونیسکو کی سرپرستی میں عمل ہوتا ہے، اسی مقصد کے تحت چلائی گئی ہے۔

مگر یہ تعلیمی پروگرام کیوں؟

کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے ممبر بیشتر بالغ ہوتے ہیں اور ان میں بعض اوقات (اور نیم ترقی یافتہ اور غیر

یہ سوال اس میں شک نہیں بہت اہم ہے اور اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک مصنف چارلس گانٹ نے اپنی ایک کتاب میں کہا ہے کہ "اگر کوآپریٹیو محض ایک کاروبار ہے تو بہت بُرا کاروبار ہے" اس بُرائی سے بچنے کے لئے اس قسم کی سوسائیٹیوں نے قریب قریب ہر ملک میں تعلیم کے وسیع پروگرام چلا رکھے ہیں جو اگرچہ کوآپریٹیو کی اصلی تعلیم نہیں ہے تاہم اس کی بڑی اہمیت ہے، اور اگر انھیں تعلیم بالغان کے اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو بہت نتیجہ خیز پروگرام ہیں۔

ان تعلیمی پروگراموں کی تفصیل کے لئے باقاعدہ ایک کتاب کی ضرورت ہے اس لئے ہم یہاں اُن کا مختصراً تعارف کرائیں گے۔

۱۔ اخبار نویسی۔ اس تعلیمی پروگرام کی ابتدا سوسائیٹیوں کا پروپیگنڈا کرنے کی غرض سے ایک آدھ اخبار شائع کرکے ہوئی۔ مگر اب نہ صرف اخبار نکلتے ہیں اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں بلکہ ان کے اہتمام میں اخبار نویسی کی ٹریننگ کا بھی بہت سے ملکوں میں انتظام ہے۔

۲۔ کوآپریٹیو اسکول۔ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور اسکینڈی نیویا کے ملکوں میں کوآپریٹیو اسکول قائم ہیں۔ یہ اسکول کوآپریٹیو سوسائیٹیوں کے ملازمین کی ماہرانہ ٹریننگ اور امداد باہمی کی عام تعلیم تو دیتے ہی ہیں ——— ان کی طرف دوسرے اداروں میں نسبتاً کم توجہ دی جاتی ہے ——— اس کے علاوہ اُن کا رُخ روز بروز یونیورسٹی بننے کی طرف ہے، ایسی یونیورسٹی جو عام یونیورسٹیوں سے مختلف اور جنتا یونیورسٹی کا رنگ لئے ہوئے ہو۔ ان اسکولوں میں خط کتابتی کورس، اور چھوٹی مدت کے کورس بڑی کثرت سے چلائے جاتے ہیں۔

۳۔ یونیورسٹی کورس۔ کوآپریشن کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بہت سے ملکوں میں یونیورسٹی کورس رائج ہیں۔ فرانس میں کوآپریشن پر یونیورسٹی پروفیسرشپ بھی قائم ہے۔ جرمنی میں لڑائی کے بعد کوآپریشن کے حامیوں نے بہت تیز قدم اُٹھائے ہیں۔ چنانچہ اس کی متعدد یونیورسٹیوں میں کوآپریشن کے علم کے یونیورسٹی ڈپارٹمنٹ کھل گئے ہیں۔

۴۔ جلسے اور میلے۔ کوآپریٹیو سوسائیٹیوں کے جلسوں میں معمولاً بہت کم لوگ شریک ہوتے ہیں اس لئے کہ یہ جلسے عموماً خشک ہوتے ہیں، مگر چھوٹے پیمانے کی سوسائیٹیاں اس معمول سے مستثنیٰ ہوتی ہیں اور ان کے جلسے دلچسپ میلوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں اور بستی کا ہر فرد ان میں حصّہ لیتا ہے۔

کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کیوں ؟

گاؤں سُدھار پروگرام کیوں نہیں ؟

دیہات کی ترقی اور نشو نما کے کام سے دلچسپی رکھنے والے ایک دوست نے اپنے خط میں ایک بہت دلچسپ سوال اُٹھایا ہے اور ہم سے اس سلسلے میں اظہار خیال کی فرمائش کی ہے ہم نے اپنا خیال ظاہر کرنے کے بجائے مناسب سمجھا کہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت کے کسی ذمّے دار عہدہ دار سے اس سلسلے میں رجوع کیا جائے. ہم شری ایم. سی. نانا وٹی کے جو وزارت مذکور میں سوشل ایجوکیشن کے ڈائرکٹر ہیں، ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر اپنے خیالات کا اس سوال کے باب میں اظہار فرمایا۔

ذیل میں ہم اپنے دوست کا خط اور شری نانا وٹی کا جواب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اگر کوئی اور دوست اس باب میں اپنے خیالات ظاہر فرمانا چاہیں تو ہم شکریے کے ساتھ اُسے آیندہ شریکِ اشاعت کریں گے ——— ایڈیٹر

خط

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب "تعلیم و ترقی"

آپ کے موقّر رسالے میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام سے متعلق جو مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں اُنھیں پڑھ کر میں نے اس اسکیم کو اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، اُنھیں تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی ہے. میں خود "بھوُ دان" اور گاؤں سدھار کے کاموں میں ایک عرصے سے لگا ہوا ہوں لیکن اِدھر کچھ دنوں سے کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی باتوں پر بھی غور کرنے لگا ہوں۔

مگر ایک بات اس سلسلے میں اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ گاؤں سدھار کی اس اسکیم کا نام "کمیونٹی

ترقی یافتہ ملکوں میں بیشتر اوقات ، ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ پہلے دوسرے کام کریں۔ ان کے اندر نہ کام کی اُمنگ ہوتی ہے نہ اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حوصلہ۔ وہ تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں تو وہ مضامین جو وہ پڑھے ہوتے ہیں، اُن سے جد و جہد کرنے کا تقاضا نہیں کرتے۔ ایسی حالت میں انھیں جمہوریت یا کوآپریٹیو کا سرگرم رکن بننے اور "اپنی مدد آپ" کی خوبیوں کا حامل ہونے کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ کوآپریشن کے رہنما اب اس بات کو بخوبی سمجھ گئے ہیں کہ انھیں نہ صرف بالغوں کی تعلیم میں دلچسپی لینی چاہیئے بلکہ بچوں کی تعلیم میں بھی اس لئے کہ یہی بچے کل کے شہری بننے والے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تہذیب اپنا گلا خود گھونٹ سکتی ہے اور اپنے آپ کو برباد کرسکتی ہے مگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو اونچا بھی اُٹھا سکتی ہے۔

"فنڈامنٹل ایجوکیشن" کے شکریئے کے ساتھ

(ترجمہ از محمد حسین حسان)

سوشل ایجوکیشن میں دیہاتی اسکولوں کے اُستادوں کا منصب
رشی کیش سیمینار کی سفارشات

پچھلے پرچے سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس سال جون میں سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا علاقائی سیمینار رشی کیش میں منعقد ہوا تھا اور اس کے سامنے زیر بحث موضوع یہ تھا کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں گاؤوں کے اسکولوں کے اُستادوں کا کیا منصب ہے۔ ہم نے پچھلے پرچے میں اس موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، زیر نظر سطور اُن سفارشات سے متعلق ہیں جو سیمینار نے اس موضوع کے بارے میں مرتب کی ہیں۔

——— ایڈیٹر

سفارشات

۱۔ سیمینار نے دیہاتی اسکولوں کے اُستادوں کے حالات کا کئی پہلو سے مطالعہ کیا — ان کی علمی قابلیت، ان کے ڈکپن کا ماحول، ان کی ٹریننگ، ان کی تنخواہ اور ان کے خانگی حالات، سب باتوں پہ غور کیا گیا اور یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ان کے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ اتنی قوت کہ وہ بچوں کو پڑھانے کے علاوہ جو ان کی اوّلین ذمّے داری ہے، کام کا مزید بوجھ اُٹھا سکیں۔

مگر پھر بھی سیمینار نے تسلیم کیا کہ گاؤوں کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ابھی کچھ عرصے تک دیہاتی اسکولوں کے استاد ہی کی شخصیت گاؤوں میں ایسی رہے گی جس کی کچھ تعلیم ہوئی ہوا ور جو کچھ تجربہ رکھتا ہو اور جو اپنی تعلیم اور تجربے کی بنیاد پر سوشل ایجوکیشن کا پروگرام چلا سکے۔

ڈیولپ منٹ پروگرام" کیوں رکھا گیا ہے؟ کیا اس کے پیچھے گاؤں سدھار سے مختلف کوئی خاص مقصد ہے؟

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا اگر آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کریں۔

آپ کا مخلص

نند کشور سنہا

اپنے پروگرام کا نام "گاؤں سُدھار" رکھنے کے بجائے "کمیونٹی ڈیولپ منٹ" رکھنے کا مقصد

شری ایم سی. ناناوٹی

کمیونٹی ڈیولپ منٹ سے مراد ہے کمیونٹی (جماعت یا سماج) کی نشو و نما۔ اس پروگرام میں کمیونٹی کی ہمہ گیر نشو و نما کا پہلو نکلتا ہے یعنی کمیونٹی میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کی تعمیر۔ معاشی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی غرض ہر نقطۂ نظر سے۔ اس کے مقابلے میں گاؤں سُدھار (ویلیج اپ لفٹ) کے پروگرام میں گاؤں میں رہنے والے لوگوں کی صرف عام اصلاح و ترقی کا اشارہ ملتا ہے۔

گاؤں کا سماج (کمیونٹی) " انسانوں کی مشترک زندگی کی ایک جاندار تنظیم ہے ایسے انسانوں کی جو عملاً اپنے رہنما آپ ہوں، اور بغیر کسی خارجی اثر کے بے ساختہ طور پر اور بغیر کسی قسم کے دباؤ کے آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے رشتہ قائم کرتے ہوں اور سماجی ایکتا کے مختلف الاجزا وجود کا تانا بانا اپنے آپ کرتے ہوں"۔ گاؤں سُدھار کے پروگرام کے سامنے ہو سکتا ہے، گاؤں کا سماج اِس حیثیت اور روپ میں نہ ہوتا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا پروگرام سماج کی زندگی کی نشو و نما اُسے ایک سالم اور کل سمجھ کر کرنا چاہتا ہے

اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ترقی کا پروگرام خود عوام کی تنظیموں اور سنستھاؤں کے توسط سے چلایا جائے جو اس وقت گاؤوں میں قائم ہیں اور مقامی اگوؤں (لیڈروں) کو بڑھاوا اور تربیت دی جائے تاکہ ان کی بدولت گاؤں کی ترقی اور نشو و نما کا پروگرام خود گاؤں والوں کے ہاتھوں انجام پذیر ہو۔

غرض "کمیونٹی ڈیولپ منٹ" اور "گاؤں سُدھار" کے ناموں میں جو فرق ہے وہ کام کی نوعیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کام کے معاملے میں زور کس بات کی طرف ہے اور اُسے پورا کرنے کے لئے راستے کیا اختیار کئے گئے ہیں۔

مرحومہ صدیقہ قدوائی کے انتقال خبر سُن کر

روح فرسا یہ کیسا خبر آئی | ایک برچھی جگر میں در آئی
دل سنبھلتا نہیں سنبھالے سے | چبھ رہے ہیں جگر میں بھالے سے
وہ سراپا خلوص و مہر و وفا | پیکرِ خلق، اہلِ صدق و صفا
اپنے چھوٹوں کی سرپرست و شفیق | دوستوں کی وہ غمگسار و رفیق
جان و دل سے وطن کی شیدائی | چل بسیں وہ صدیقہ قدوائی
موت کا اُن کی آتے کیسے یقیں | کتنے دل ہیں کہ جن میں ہیں وہ مکیں
ہے نظر میں وہ مہرباں صورت | نقش ہے دل پہ دل نشیں سیرت
چاہنے والی ماں تھیں کتنوں کی | خواہر مہرباں تھیں کتنوں کی
دل فراموش کر نہیں سکتے | لوگ ایسے کبھی نہیں مرتے

دیدۂ تر ہے خوں فشاں فرحت
اُٹھ گئیں تیری قدرداں فرحت

اس بات کی بنیاد پر سیمینار کی رائے ہوئی کہ سوشل ایجوکیشن کی مختلف سرگرمیوں کے معاملے میں اسکول کے اُستاد کی حیثیت اگوا کی نہیں بلکہ بڑھاوا دینے والے کی ہونی چاہئے۔ وہ جو مدد کرسکتا ہے وہ بس اتنی کہ گاؤں میں نئے نئے اگوا پیدا کرے۔ نہ یہ کہ خود سوشل ایجوکیشن کی سرگرمیاں منظم کرے۔

ایسے حالات میں جہاں اسکول کے اُستاد کے علاوہ اس کام کے لئے اور کوئی شخص دستیاب ہی نہ ہو، اس سے چند مخصوص سرگرمیاں منظم کرنے کی درخواست کی جاسکتی ہے مگر اس شرط پر کہ اُسے روزانہ ایک یا بہت سے بہت دو گھنٹے سے زیادہ وقت نہ دینا پڑے اور اُس کا اُسے مناسب معاوضہ دیا جائے۔ معاوضے کے علاوہ ایسا انتظام بھی کرنا چاہئے کہ اگر وہ کوئی نمایاں خدمت انجام دے تو اُسے انعام دیا جائے یا کسی خطاب سے اُسے نوازا جائے۔

۲۔ سیمینار نے سوشل ایجوکیشن کی تعریف میں آنے والی چند ایسی سرگرمیوں پر غور کیا جو اسکول کے اُستاد کے سپرد کی جاسکتی ہیں اور یہ رائے دی کہ مندرجہ ذیل سرگرمیاں ایسی ہیں جو سب کے لئے مشترک ہوسکتی ہیں۔

(۱) خواندگی کی کلاس منظم کرنا۔

(۲) ریڈنگ روم اور اطلاعات کا مرکز قائم کرنا

(۳) کتب خانہ چلانا اور

(۴) بھجن منڈلیاں، نوجوان کلب، کھیل کود کے کلب، بحث مباحثے کی مجلسیں، نوجوان کسانوں کے کلب، خواتین کی انجمنیں اور ننھے بچّوں کے مرکز (بال واڑی) چلانا۔

۳۔ سیمینار نے اس بات پر بھی غور کیا کہ سوشل ایجوکیشن کی کچھ سرگرمیاں اسکول کے اُستاد کی منصبی ذمّے داری کے تحت بھی آتی ہیں جنھیں اُسے بہرحال انجام دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں سیمینار کی رائے ہوئی کہ اُستاد بچّوں کی مختلف سرگرمیوں کے ذریعے لوگوں میں بھائی چارے کا احساس اور سماجی یکجہتی پیدا کرسکتا ہے۔ یہ سرگرمیاں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں، ایسی ہیں جن میں مِل جُل کر کام کرنا ہوتا ہے مثلاً بچّوں کی پنچایت، بچّوں کا بینک، بچّوں کی کوآپریٹیو، اور بچّوں کی باغبانی۔ اسی طرح اظہارِ نفس کی نشوونما کے لئے بھی کچھ سرگرمیاں مثلاً "سبز پوش فوج" (بلیو برڈز) اسکاوٹنگ، اور سیروسفر اور بعض سماجی سرگرمیاں ہیں جن میں بچّے حصّہ لے سکتے ہیں مثلاً صحت و صفائی کی مہم، اسکول کی عمارت کی آرائش وغیرہ۔ بچّوں کو ان تمام کاموں میں شریک کرنا اور انھیں ان کا شوق دلانا اسکول کے اُستاد کی منصبی ذمّے داری ہے جو اُسے پورا کرنا چاہئے۔ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

بے خبر نہ رہے بلکہ ان کے لئے کچھ مشقی (فالواپ) سرگرمیوں کا انتظام کرے۔

نوجوان کلبوں کی تنظیم پر دہلی کا سیمینار

کچھ دن ہوئے دہلی کے محکمۂ تعلیمات کے زیر اہتمام نوجوان کلبوں کی تنظیم کے موضوع پر سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا ایک سیمینار شاہدرہ ڈیولپمنٹ بلاک میں منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار کا افتتاح وزارت تعلیم کے مددگار مشیر تعلیمی شری سوہن سنگھ نے فرمایا تھا۔ شری سوہن سنگھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کارکنوں کو اس موضوع سے متعلق بڑے مفید مشورے دیئے اور فرمایا کہ "نوجوانوں کے اوپر خاص طور پر بڑی ذمہ داری ہے اس لئے کہ وہ ملک کی آبادی کا وہ جزو ہیں جو زندگی اور قوت سے بھرپور ہوتا ہے"

"جھا" لائبریری کے لئے گراں قدر عطیہ

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے انتظام میں "شفیق میموریل" کے نام سے جو عمارت بن رہی ہے اس کے ایک حصے میں پنڈت امرناتھ جھا مرحوم کی یادگار میں ایک لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ ہوا ہے۔

حکومت راجستھان نے اس "جھا لائبریری" کے لئے دس ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ ایسوسی ایشن کو دیا ہے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں ریسرچ کے لئے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کا قیام

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے مسائل کی ریسرچ اور مطالعے کی غرض سے مسوری میں ایک سنٹرل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے۔

یہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے چھ چھ ہفتے کے ٹریننگ کورس چلائے گا جس میں عموماً ڈیولپمنٹ کمشنر، ڈپٹی ڈیولپمنٹ کمشنر، کلکٹر اور ڈپٹی کمشنر شریک ہوں گے۔ ان کے علاوہ اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کچھ غیر سرکاری لوگ بھی جنھیں ڈیولپمنٹ کے پروگرام سے دلچسپی ہو شریک ہو سکیں۔

اس انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ٹریننگ کورس کا افتتاح ۹ رجون ۱۹۵۸ء کو پلاننگ کمیشن کے ممبر شری

سوشل ایجوکیشن کی تحریک

آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کا

پندرھواں اجلاس

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی مجلس منتظمہ نے اپنے ۱۷ر جون ۱۹۵۸ء کے جلسے میں طے کیا ہے کہ اس سال آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا اجلاس لٹریسی ہاؤس لکھنؤ میں منعقد کیا جائے۔

جلسے میں یہ بھی طے ہوا کہ اجلاس کی تاریخیں ۱۳ر اور ۱۴ر دسمبر رکھی جائیں اور اجلاس کے صدر پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ ہوں۔

نواں نیشنل سیمینار

اسی ایسوسی ایشن کی مجلس منتظمہ نے اپنے اسی جلسے میں یہ بھی طے کیا کہ نواں نیشنل سیمینار بھی لکھنؤ ہی میں اسی مقام (لٹریسی ہاؤس) پر منعقد ہو۔ اس کی تاریخیں ۱۵ تا ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۸ء رکھی جائیں، موضوع بحث "سوشل ایجوکیشن کی تنظیم شہری علاقوں میں" ہو اور اس کی رہنمائی (ڈائرکٹرشپ) شری رنجیت ایم چیت سنگھ صاحب فرمائیں۔

جنتا کالج کے پُرانے طالب علموں کا اجتماع

آندھرا پردیش کے ضلع نظام آباد میں ڈوماکنڈا نامی مقام پر ایک جنتا کالج ہے۔ اس کالج کے قدیم طلباء کا مئی کے آخری ہفتے میں ایک اجتماع ہوا تھا جس کے ڈائرکٹر شری ایم نرسنگھ راؤ وزیر رسل ورسائل تھے۔ آندھرا پردیش کے سوشل ایجوکیشن آفیسر شری ڈی۔ ایل آنند راؤ نے اس کا افتتاح کیا اور کالج کے سپرنٹنڈنٹ شری ڈی۔ سنجیوا نے اس کی صدارت کی۔

اس اجتماع نے منجملہ اور سرگرمیوں کے چند پرستاو بھی پاس کئے جن میں ایک قابل ذکر پرستاو یہ تھا کہ جنتا کالج کو چاہئے کہ جب اس کے طلباء کالج کی تعلیم پوری کر کے اپنے گھروں کو چلے جائیں، اُس وقت بھی وہ اُن سے

چند دلال ترویدی نے فرمایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں شری ترویدی نے کہا کہ چونکہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں کا منشا انسانوں کی نشوونما اور تربیت ہے، اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں کے او ان پروگراموں کی ذمے داری ہے، وہ عوام کے رسم و رواج، عادات و خصائل، اور ان کی جماعتو اور سنستھاؤں کو بخوبی سمجھیں، اس لئے کہ یہی چیزیں ان کی زندگیوں کا رُخ متعین کر ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ اگرچہ ابھی اسی قسم کے ٹریننگ کورس چلانے پر اکتفا کرے گا مگر منصوبہ یہ ہے کہ آ چل کر یہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے مسائل کے بارے میں ریسرچ کا پروگرام بھی شروع کرے گا۔

(صفحہ ۲۸ کا باقی)

۴۔ ریاستی حکومتیں جن حالات میں اور جس نقطۂ نظر کے ساتھ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کی منصوبہ بند کرتی ہیں، سیمینار نے اس کے اوپر بھی سوچ بچار کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ریاستوں میں تعلیم کے نگرانو (انسپکٹروں) کا حلقۂ عمل اتنا زیادہ وسیع ہوتا ہے کہ وہ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں جتنی چاہیئے اتن دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس بنیاد پر سیمینار کی رائے ہوئی کہ یا تو نگرانی کرنے والے افسر کے کام کا حلقہ کرنا چاہیئے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو صرف سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کے لئے الگ سے ایک عہدے دار کا تقرر کیا جانا چاہیے۔

۵۔ کارکنوں کی رہنمائی اور کام کی دیکھ بھال کے بارے میں سیمینار نے یہ رائے دی کہ سوشل ایجوکیشن سرگرمیوں کو صحیح راستے پر ڈالنے اور ان میں باہم ربط اور تال میل پیدا کرنے کی غرض سے ضلعوں اور بلاکو میں سوشل ایجوکیشن کے افسر مقرر کئے جانے چاہئیں۔

تعلیم و ترقّی



The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

Printer and Publisher : BARKAT ALI Firaq : Printed at Rama Krishna Printing Press Delhi

ادارہ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جلد (۹) اگست سنہ ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر ۸

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارہ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ، جامعہ نگر (نئی دہلی)

ٹیلی فون نمبر ۴۲۴۶

قیمت سالانہ، چار روپے

کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام، ایک مطالعے کی روشنی میں

آگرہ یونیورسٹی کے سماجی علوم کے انسٹی ٹیوٹ نے سماجی مسائل پر کئی تحقیقاتیں کی ہیں، ان تحقیقاتوں کی روشنی میں ان مسائل پر کام کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اداروں کے لئے بہت سے سبق ہیں، شرط یہ ہے کہ یہ ادارے ان تحقیقاتوں کی رپورٹوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

یونیورسٹی کے اسی انسٹی ٹیوٹ نے یو۔ پی کے تمام ڈیولپ منٹ بلاکوں کا جائزہ لیا تھا اور اس کی بنیاد پر اپنی رپورٹ شائع کی ہے۔ اصل رپورٹ تو ہمارے سامنے نہیں ہے مگر اس کا خلاصہ ایک مضمون کی شکل میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پندرہ روزہ اخبار "اکنامک ریویو" میں شائع ہوا ہے۔

اس خلاصے کی بنیاد پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام جو ہمارے پنج سالہ پروگراموں کی روح ہے، سب سے زیادہ توجہ کا محتاج معلوم ہوتا ہے۔ رپورٹ میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "لٹریچر اور کتب خانوں میں معقول ساز وسامان کی کمی کی وجہ سے ۳۶ فیصدی نوسکھ بالغ اپنی تعلیم کو جاری نہیں رکھ سکے اور اپنی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت کو کھو کر پھر ناخواندگی کی حالت کو پہنچ گئے ہیں۔" ظاہر ہے جب سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کو تقاوی کی تقسیم یا گھریلو صنعتوں کی مصنوعات کی فروخت سے کام پر لگایا جائے گا تو خواندگی اور سوشل ایجوکیشن کی دوسری سرگرمیوں کا یہ حشر نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا!

اس تحقیقات سے کمیونٹی پروجیکٹوں کے بارے میں ایک اور عبرت ناک واقعہ ظہور میں آیا ہے۔ رپورٹ کا بیان ہے کہ "ان پروجیکٹوں اور بلاکوں میں پروگرام بعض اوقات چند افسروں کی سنک کی خاطر یا اس مقصد سے بنائے جاتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی یا عہدے دار بلاک کو دیکھنے آنے والا ہے اور اسے خوش کرنا مقصود ہے۔" یہ ڈیولپ منٹ بلاکوں کے لئے بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ اصل میں، "جس کو" خوش کرنے کی غرض سے کمیونٹی پروجیکٹوں کی پوری اسکیم عمل میں آئی۔ "اسے" تو نظر انداز کیا جائے اور "صاحب" کو خوش کرنے کے لئے الگ سے منصوبہ بنا کر اس کی تکمیل میں رات دن ایک کر دیا جائے۔ یہ اسی انگریزوں کے زمانے کی غلامانہ ذہنیت کا عکس ہے جس کے لئے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔ (باقی صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمایئے)

ترتیبِ مضامین

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

منظم کرے جس میں بستی کے سبھی لوگ منظم طریقے پر حصہ لے سکیں۔ اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو دراصل کمیونٹی آرگنائزر رکھنا چاہئے۔ اس سے وہ کام جو کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کے تحت ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہے ہیں اور جو بستی کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں' ان پر خاص توجہ دی جانے لگے گی۔

مگر یہ سب ہو کیسے؟ اس پر بہت غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے بھی کہ ایک ڈیولپ منٹ بلاک میں سوشل ایجوکیشن کے ایک یا دو آرگنائزر ہی ہوتے ہیں۔ بستی کی صحیح معنوں میں ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ کام سب سے نچلی سطح یعنی گاؤں کی سطح پر کئے جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمیونٹی آرگنائزر کو اپنے حلقے میں سے جلد از جلد کچھ مخلص اور لگن والے کارکنوں اور اگوؤں کو ڈھونڈ نکالنا چاہئے۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو لوگوں کو مختلف سرگرمیوں کے لئے آمادہ کر لینا چاہئے۔ پھر یہ لوگ اپنی بستی کی بہبود کے لئے کام کریں' سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو اسی کی بنیاد پر کام کرنا چاہئے۔ جب تک کام اس ڈھنگ پر نہیں کیا جاتا ہے' کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے پروگرام نہ تو بستی والوں کی تحریک اور ان کی اپنی نگرانی میں ہو سکیں گے اور نہ یہ کوئی ایسا اثر ہی چھوڑ سکیں گے جو دیرپا اور دور رس ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو چونکہ ایسے گاؤں اور بستیوں میں کام کرنا ہوتا ہے جو ایک زمانے سے بے توجہی کا شکار رہی ہیں اور جن کے نزدیک کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا پروگرام بالکل نیا اور اجنبی ہے' سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا کام ایک کمیونٹی آرگنائزر کا ہو جاتا ہے جس کا کام مقامی کارکنوں کو عمل کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کا یہ کام ایک طرح سے سماج میں ایک ایسا ماحول تیار کرنے کا کام ہے جس میں فرد اور جماعت دونوں کی زندگی اور فکر و عمل میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو۔ سوشل ایجوکیشن کے بارے میں آخر دعوی بھی کیا کیا جاتا ہے؟ یہی نہ کہ وہ بے خبر عوام کو بیدار اور باشعور انسانوں کی شکل میں ڈھال دے گی۔ مگر سوشل ایجوکیشن کے ان اعلیٰ مقاصد کی ترجمانی اکثر غلط ڈھنگ پر کی گئی ہے جس سے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور چونکہ اس سلسلے میں ذہن صاف نہیں ہیں اس لئے مقامی لوگوں کی ضرورتوں اور مسائل کے پیش نظر اس غریب کو جو بھی سمجھ میں آیا اسی کام پر لگا دیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک سوشل ایجوکیشن کا ایک بہت ہی جامع اور واضح حلقۂ عمل ہے جس کے اندر یہ باتیں آجاتی ہیں۔

(۱) کام دھندے کی تربیت' روزگار کے سلسلے کی تفہیم اور مستعدی اور کارکردگی کا جوش پیدا کرنا۔

(۲) خواندگی۔

(۳) سماجی زندگی اور بستی کی زندگی میں حصہ لینے کی تربیت اور شہری علوم کی تعلیم۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر یا کمیونٹی آرگنائزر؟

جولائی کے شمارے میں ہم نے "کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا مقام" کے عنوان سے شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے کا ایک مضمون شائع کیا تھا۔ دیش پانڈے جی نے مختلف دلائل سے ثابت کیا تھا کہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اور اس کے لئے جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، ان کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے۔ نہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے منصب کے بارے میں کوئی ابہام ہے بلکہ یہ سب انتظامی ڈھانچے کے نقص کا نتیجہ ہے۔

اس کے مقابلے میں زیر نظر شمارے میں ہم سوشل ورک کے ایک ترجمان شری بی۔ اے مہتا کا ایک مضمون دے رہے ہیں۔ شری مہتا بمبئی کے ٹاٹا اسکول آف سوشل سائنس کے ایک ڈپارٹمنٹ کے صدر ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ موجودہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اپنے منصب کے اعتبار سے اپنی ذمے داریوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ لہذا اس کی حیثیت سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے بجائے کمیونٹی آرگنائزر کی ہونی چاہئے جو سیدھی سادی اور نسبتاً زیادہ کارگر تکنیک ہے۔

—— ایڈیٹر

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے اور اس کی یہ حیثیت اب قریب قریب تسلیم کی جاچکی ہے اس کے کاموں میں کمیونٹی سینٹروں کی تنظیم اور سوشل ایجوکیشن کے دوسرے کام کرنے والوں کی نگرانی کرنا، سماجی بہبود اور نوجوانوں کی بہبود کے کام، سماجی خدمت کے دوسرے کاموں کی تنظیم کرنا، عام تعلیمی سرگرمیاں منظم کرنا اور سماجی زندگی سے متعلق نئی نئی باتوں کی تلاش و تحقیق وغیرہ بھی کام شامل ہیں۔

اس کے کاموں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ عملی نقطۂ نظر سے اس کے لئے یہ سارے کام انجام دینا ممکن نہیں ہے۔ وہ بیشتر ان کاموں تک محدود رہ جاتا ہے جن کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی جاتی ہے بستی کی ترقی کے پروگرام شروع کرنے کے لئے سب سے پہلے بستی کی تنظیم کرنی ہوتی ہے۔ اس کے لئے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو چاہئے کہ وہ بستی کی ترقی سے متعلق کچھ ایسے

کی شکل میں ڈھال کر پورے ایشیا کی رہنمائی کرسکتا ہے۔

ترقیاتی منصوبوں کو اگر مؤثر اور نتیجہ بخش بنانا ہو تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے تحت جو کام ہوئے ہیں اور جس مقدار میں ہوئے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جائے، پھر اس قسم کا اندازہ کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جانچ، معائنے اور تحقیقات کا کام مسلسل ہوتا رہے۔

کمیونٹی ڈیویلپمنٹ کی تنظیم میں اس کام کے لئے الگ سے کوئی عملہ نہیں ہے۔ اور جب تک اس کام کے لئے کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے اُس وقت تک یہ کام کمیونٹی آرگنائزر کو جو سماجی معلم کا پارٹ بھی ادا کرتا ہے کرنا چاہیے۔

(انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

(بقیہ صفحہ ۳)

آگرہ یونیورسٹی کا سماجی علوم کا انسٹی ٹیوٹ بہرحال مبارکباد کا مستحق ہے جس کی محنت سے ہمارے قومی تعمیر کے منصوبوں کا حسن و قبح سامنے آجاتا ہے ورنہ ہمارا خیال ہے کہ کاموں کی نوعیت اور مقدار کا اندازہ کرنے والی جماعت (پروگرام ایویلیوشن آرگنائزیشن) کے بے لاگ تبصروں سے بھی یہ حقائق پورے طور پر واضح نہیں ہوئے

(۴) صحت کی تعلیم اور مرد عورت کے تعلقات اور خاندان کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم۔

(۵) تفریحی اور تہذیبی سرگرمیوں کی اور ان میں حصّہ لینے کی تربیت۔

ان چیزوں سے سوشل ایجوکیشن کی صرف نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ٹھوس پروگرام بستی کے لوگوں کی عمر صنف اور طبقات کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔ بہ ہر حال ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جو مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، جیسے دکھا سنا کر تعلیم دینے کے ذرائع کا استعمال، وہ ان سب پروگراموں میں یکساں طور پر کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

سوشل ایجوکیشن کے علم کی بنیاد نفسیات پر ہونی چاہئے اور اُسے رسمی تعلیم کے عام طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے ملے جلے طریقے ایجاد کرنے چاہئیں جو تعلیم تفریح اور لوگوں کے سرگرم تعاون اور اشتراک سے مل کر کام کا ایک جامع پروگرام بن جائیں۔ مگر سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں میں سے بیشتر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی ٹرینگ کی مختصر مدت میں بستی کی زندگی میں پورے انہماک سے حصّہ لئے بغیر، سوشل ایجوکیشن کے پیچ در پیچ طریقوں پر قدرت حاصل کر لیں۔ ہندوستان کو صحیح ڈھنگ کے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر تیار کرنے میں ابھی بہت دن لگیں گے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ تیار کر لئے جائیں جو کمیونٹی آرگنائزیشن کے سیدھے سادے مگر کارآمد مقاصد کو پورا کر سکیں۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا بنیادی کام اگرچہ وہی ہے جو ایک کمیونٹی آرگنائزر کا ہوتا ہے، مگر پھر بھی بستی کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اس کے کاموں میں کچھ دوسری سرگرمیوں کا شامل ہو جانا قدرتی ہے۔ اس طرح سماجی بہبود، نوجوانوں کی تنظیم اور بستی کی اقتصادی زندگی میں سدھار کے کاموں سے بھی اس کا تعلق قائم ہو جائے گا۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر سے آج ایسے کاموں کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو اُسے ایک کمیونٹی آرگنائزر سے زیادہ سماجی معلم کی حیثیت سے کرنے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے ـــــ اور یہ قدرتی بات ہے کہ ـــــ اس کا تعلق ریاستوں کے تعلیمی محکموں اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اکثر ان کاموں میں مشغول پایا جاتا ہے جو محکمۂ تعلیم کے کرنے کے کام ہوتے ہیں اور اس کی حیثیت بڑی آسانی سے محکمۂ تعلیم کے افسروں اور انسپکٹروں کے ایک مزید مددگار کی ہو جاتی ہے یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ اس سے کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کی تحریک جو ابھی ابتدائی مراحل سے گذر رہی ہے کمزور پڑ جائے گی۔ ان حالات میں جبکہ کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کی بنیادی اکائی بستی ہوتی ہے بہت اچھا ہوگا۔ اگر کمیونٹی ڈیویلپ منٹ ہر ریاست میں بجائے خود سماجی خدمات کا ایک محکمہ بن جائے جو تعلیمی اور صحتی خدمات بہم پہنچانے والے دوسرے شعبوں سے الگ رہ کر کام کرے۔ ہندوستان کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کو ایک اہم سماجی محکمے

ذریعوں کے کارگر اور نتیجہ بخش ثابت ہونے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوگی اور اس سے اُن کی افادیت اور تاثیر میں فرق پڑ جائے گا۔ خواندگی کے بغیر ان ذرائع کو اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے پتھریلی زمین میں ہل چلانا۔ آخر یہ کیوں نہ کیا جائے کہ پہلے پتھروں کو نکال دیں! مجھے تو کبھی کبھی اس میں بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ ہم دکھا سنا کر تعلیم دینے والے آلات کے ذریعے تعلیم دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کو جسے بہت سی باتوں کا علم ہو اور جس کے اطوار اچھے ہوں، "گن وان" اور مہذب تو کہہ سکتے ہیں، مگر اُسے "تعلیم یافتہ" نہیں کہا جا سکتا۔ اس وقت تک جب تک وہ حرف شناس نہ ہو پھر خواندگی جو ترقی اور نشوونما کی بنیاد ہے، خرچ کے لحاظ سے سب سے کم خرچ اور تنظیم کے لحاظ سے تعلیم کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ ہمیں یہ سبق نہ پڑھایا جائے کہ خواندگی بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ بات دہرائی جاتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ قلم، شو، کھاد اور بیج کی تقسیم وغیرہ بھی بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ اصل مقصود ہے فرد کی زندگی میں صحیح قسم کی خوش حالی اور اطمینان، ایک ایسا سماج، جس کے ارکان و افراد صحت مند زندگی گزارتے ہوں، ایک دوسرے سے تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں، مہذب اور شائستہ ہوں، اور امن اور شانتی کے حامی ہوں۔ خواندگی ان مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور غالباً سب سے کارگر اور اہم ذریعہ۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ کہیں کوئی ایسی تحقیق کی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کسی مسئلے کے بارے میں خواندہ اور ناخواندہ اشخاص کا جو ردِ عمل ہوتا ہے، اس کی کیفیت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مگر مجھے کمیونٹی پروجیکٹوں کے دورے کے زمانے میں متعدد بلاک ڈیولپمنٹ افسروں سے ملاقات اور بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے مجھے بتایا کہ ایک خواندہ شخص کے لئے ہمارے پروگراموں کا سمجھنا جتنا آسان ہوتا ہے اتنا ناخواندہ لوگوں کے لئے نہیں ہوتا۔ میسور کے ایک گاؤں میں بالغوں کو ایک فلم دکھائی گئی، اور جب اس بات کا اندازہ لگایا گیا کہ لوگوں نے فلم کو کس حد تک سمجھا تو معلوم ہوا کہ ناخواندہ بالغوں کے مقابلے میں ان لوگوں نے فلم کو بہتر طریقے پر سمجھا تھا جنھیں تھوڑی بہت بھی تعلیم مل چکی تھی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواندہ آبادی ہماری تمام ترقیاتی کوششوں اور سرگرمیوں کے لئے ایک سرمایہ ہے جس کے بغیر ہمارا یہ کاروبار چل نہیں سکتا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ خواندگی کی مخالفت خود ناخواندہ عوام نہیں کرتے۔ خواندگی کے باب میں شک و شبہے، بد عقیدگی اور اختلاف کا اظہار ان لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے جو خود اونچی تعلیم پائے ہوتے ہیں، وہ چاہے ہمارے اپنے ہندوستانی بھائی بند ہوں یا دوسرے ملکوں کے معزز مہمان، اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ ناخواندہ عوام سے دور رہتے ہیں، اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ جہاں تک خود

خواندگی کی حمایت میں

(۲)

شری مشتاق احمد

مضمون کی پہلی قسط میں مضمون نگار نے خواندگی کی "اہمیت" میں منفی استدلال پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ڈیولپ منٹ کے سلسلے کی دوسری سرگرمیاں کون سی ایسی کامیاب ہیں کہ ان کے مقابلے میں خواندگی کو ناکام بتایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے اعداد و شمار اور جن حالات میں خواندگی کی کلاسیں منعقد ہوتی ہیں، ان کا منظر بھی پیش کیا تھا اور آخر میں ان دلائل کی فہرست مرتب کی تھی جو خواندگی کی مخالفت میں پیش کئے جاتے ہیں

مضمون کی زیر نظر قسط میں مصنف نے ان دلائل کا جواب دیا ہے

—— ایڈیٹر

پہلی دلیل

ایک شخص جو "تعلیم یافتہ" بننا چاہتا ہے، اس کے لئے خواندہ بننا ضروری نہیں ہے۔ لوگوں کو دکھا سنا کر تعلیم دینے والے آلات، مظاہروں اور بحث مباحثے کے ذریعے تعلیم دی جاسکتی ہے۔ خواندگی بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔

میرے خیال میں یہ دلیل وہ لوگ دیا کرتے ہیں جنہیں اپنی قابلیت جتانے کی عادت ہوتی ہے اور جو حقائق کو نظرانداز کرکے فلسفیانہ بحثوں کے عادی ہوتے ہیں۔ مانا کہ خواندگی کو "تعلیم" نہیں کہا جاسکتا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ خواندگی تعلیم کے ذرائع میں سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر ذریعہ ہے۔ دکھا سنا کر تعلیم دینے والے آلات، بحث مباحثے اور مظاہرے بھی تعلیم کے ذریعے ہیں لیکن اگر ہم انہی ذریعوں پر اکتفا کرلیں اور عوام کو جوں کا توں اَن پڑھ رہنے دیں تو ان ذریعوں سے جو تعلیم ملے گی، وہ محض بے کار ہوگی۔ ناخواندگی ان

بلکہ ذریعے ہیں۔ دونوں اچھی سے اچھی زندگی کے وسائل ہیں اور اگر نہیں ہیں، تو انہیں یہی ہونا چاہئے۔ خواندگی زندگی کے مادّی پہلو کی ترقی کا ذریعہ تو ہے ہی، اس سے آگے اگر انسان کو اپنی جماعت کی زندگی اور تنظیم میں سمجھ داری اور مستعدی کے ساتھ حصّہ لینا ہے اور ایک مکمل انسان بننا ہے تو بھی اس کے لئے خواندہ ہونا لازمی ہے۔"

دوسری دلیل

"اپنا وقت اور توجہ بچّوں کی تعلیم پر صرف کیجئے۔ ایک یا دو نسلوں کے بعد ملک میں کوئی اَن پڑھ نہیں رہے گا۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ دلیل سب سے مضبوط اور کارگر معلوم ہوتی ہے۔ مگر کیا معاشی اعتبار سے نیم ترقی یافتہ ملکوں میں کسی ایک کے اندر بھی اتنی سکت ہے کہ وہ ایک یا دو نسل میں ۱۴ سال سے کم عمر والے تمام بچوں کی ابتدائی اور اس کے بعد کی تعلیم کا انتظام کرلے؟ بہت سے ملک تو ہیں جو اسکول جانے کی عمر والے تمام بچوں کی جبری ابتدائی تعلیم کی کوشش میں ایک عرصے سے لگے ہوئے ہیں مگر کیا دنیا میں پڑھے لکھے اور خواندہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یا ہو رہا ہے؟

امریکہ کے دفتر تعلیمات کی طرف سے ۱۹۲۹ء میں ایک بلیٹن چھپا تھا جس میں اندازہ کیا گیا تھا کہ دنیا میں ۱۰ سال سے اوپر کی عمر کے ۸۵ کروڑ آدمی اَن پڑھ ہیں۔ کوریر لکھتا ہے

"اگر اسی عمر کے لوگوں کا جائزہ ۱۹۵۰ء میں لیا جائے تو شاید ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دنیا میں ان پڑھوں کی تعداد ۸۰ سے لے کر ۸۴ کروڑ تک ہوگی۔ گویا اب سے ۲۵ سال پہلے ان پڑھوں کی جو تعداد تھی اس میں اتنی مدت میں بس یوں ہی سی کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں آیئے ان اعداد و شمار کا مطالعہ کریں جو مذکورۂ بالا مضمون کے ساتھ "کوریر" میں چھپے ہیں:

برازیل

سال	ان پڑھ آبادی	عمر	ان پڑھ آبادی کا اوسط فیصدی
۱۹۰۰ء	۶۳ لاکھ	پندرہ سال اور اس سے اوپر	۶۵٫۳
۱۹۲۰ء	۱ کروڑ ۱۴ لاکھ	"	۶۴٫۹
۱۹۴۰ء	۱ " ۳۳ "	"	۵۶٫۱
۱۹۵۰ء	۱ " ۵۳ "	"	۵۰٫۶

عوام اور ان کے اگوؤں کا تعلق ہے، وہ ناخواندگی کی لعنتوں سے باخبر ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان پڑھ پن دماغ کو قید ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج ترقی نہیں کر پاتا۔ خواندگی کورسوں میں آیندہ کی تمام ترقیاتی اسکیموں کا سنگ بنیاد دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی سرزمین سے ناخواندگی کی جڑ کاٹنے کا منصوبہ بنایا، اور اس میں کامیاب ہوا۔ کے پریسیڈنٹ نے سنہ ۱۹۶۲ء میں خواندگی کی مہم کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ ناخواندگی کو ختم کر دینے سے لوگوں کی تعلیم نہیں ہو جائے گی مگر میرا یہ بھی ایمان ہے کہ لوگوں کو تعلیم دینے کی مہم میں پہلا قدم یہی ہے کہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں۔"

آچاریہ ونوبا بھاوے نے ابھی حال میں فرمایا ہے کہ

"تعلیم (خواندگی) کی کمی نے انھیں (عوام کو) خوشحال اور بامسرت زندگی گذارنے کی خواہش اور جوش سے محروم کر دیا ہے۔"

بہت زمانہ ہوا لینن نے اس سلسلے میں کہا تھا:

"ان پڑھ کے لئے سیاست میں کوئی جگہ نہیں، اُسے سب سے پہلے حرف شناس بنانا چاہئے۔"

"کوریر" کے مارچ ۱۹۵۷ء کے شمارے میں جو جنتر بالغوں کی خواندگی سے متعلق ہے، یونیسکو کا حسب ذیل چھپا ہے:

"اب اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ثبوت کی کمی نہیں ہے کہ ناخواندگی کا بھوک، وبائی امراض، غربت و افلاس، توہم پرستی اور مغلوبیت کے ساتھ چولی دامن کا تعلق ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناخواندگی ان لعنتوں کو پیدا کرتی ہے، نہ یہ کہ اگر ہر شخص لکھنا پڑھنا سیکھ لے تو صرف لکھنا پڑھنا سیکھ لینے سے یہ نحوستیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ مگر اس بات سے اب انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھڑے ہوئے اور نیم ترقی یافتہ ملکوں میں سماجی اور اقتصادی ترقی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب پیدائش دولت، تقسیم دولت، اور طبی اور فلاحی خدمات کے سلسلے میں لوگ جدید ترین طریقوں کو اپنی زندگی میں پورا پورا سمو لیں۔ ان طریقوں کو اپنی زندگی میں سمونے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے اور اس تعلیم کی پہلی اور بنیادی منزل خواندگی ہے۔"

"کوریر" آگے چل کر لکھتا ہے:

"عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ خواندگی کی ضرورت صنعت و حرفت کے دور دورے کی پیداوار ہے اور اس لحاظ سے یہ اُسی کا ایک منصب ہے۔ یہ سمجھنا غلطی ہے۔ خواندگی اور صنعت دونوں فی نفسہٖ مقاصد نہیں

خواندگی کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے ملک کی کارکردگی کا معیار اونچا ہوتا ہے بلکہ اس کی بدولت ایک ایسا سماجی نظام بھی وجود میں آتا ہے جس سے خود بچوں کی تعلیم میں مدد ملتی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک خواندہ شخص کو اپنے بچوں کی تعلیم کا جتنا شوق ہوگا اتنا ان پڑھ کو نہیں ہوگا۔ بچہ جو دس سال کی عمر میں خواندہ ہوتا ہے، اُسے ووٹ دینے کے قابل ہونے اور اس طرح جمہوریت کی تعمیر میں حصہ لینے کے لئے گیارہ سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بالغ ہے جسے اس کام میں سمجھ داری کے ساتھ حصہ لینے کے لئے خواندگی کی صرف دو سال کی تعلیم کی مدت گذارنی ہوتی ہے۔

اس باب میں کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ "صاحب، ایسی جلدی کیا ہے! یہ کام ہم پچاس سال میں کرلیں گے"۔ میں کہتا ہوں "بے جلدی: ملک کی ترقی کو آخر پچاس سال تک کیوں روکیے۔ بچے اسکول میں اپنے وقت کے صرف ۵ گھنٹے گذارتا ہے۔ باقی وقت وہ اپنی ان پڑھ جماعت کے ساتھ گذارتا ہے۔ جب تک ہم اُس جماعت کو خواندہ نہ بنالیں جس میں بچہ رہتا سہتا ہے اُس وقت تک بہت ممکن ہے کہ جو تعلیم بچہ حاصل کرتا ہے وہ بھی رائگاں ہوجائے۔ بالغوں کی خواندگی، غرض، بچوں کی تعلیم کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے، تب بھی اس وقت سب سے زیادہ ضروری ہے۔

تیسری دلیل

لوگوں کے لئے پڑھنا لکھنا سیکھنے میں کوئی "کشش" نہیں ہوتی۔

کہا جاتا ہے کہ ان پڑھوں کے لئے لکھنا پڑھنا سیکھنے میں کافی "کشش" نہیں ہوتی۔ تسلیم! مگر کیا ان لوگوں کے لئے سماجی برائیوں کو چھوڑ کر شائستہ اقدار کو تسلیم کرنے میں کافی "کشش" ہوتی ہے؟ یعنی مل جل کر زندگی گذارنے، ہمسایگی کا حق ادا کرنے، اچھے شہری بننے، توہم پرستی سے آزاد ہونے، ذات پات کا فرق مٹانے کا شوق بہت ہوتا ہے؟ یا ان میں پنج سالہ پروگرام کو پورا کرنے کا جوش و خروش بہت ہے؟ قطعاً نہیں۔ مگر اس صورتِ حال میں ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم اپنی دکان بڑھا کر گاؤں کو مایوسی اور بے کسی کی حالت میں تو نہیں چھوڑ دیتے! لاکھوکھا روپے خرچ کرتے ہیں، طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں، انھیں طرح طرح سے شوق دلاتے ہیں اور اگر ایک آدھ کسان بھی جاپانی طرز پر دھان کی کھیتی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے یا اچھی نسل کی مرغیاں پالنے لگتا ہے تو سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں۔ اگر کوئی بدیسی مہمان آجاتا ہے تو اُسے فخر کے ساتھ چھ فٹ لمبا دھان کا پودا دکھاتے ہیں اور لیگ ہارن کے انڈے اُسے تحفے میں دیتے ہیں۔ تو اسی طرح اگر کوئی مہمان آجائے تو اُس کے سامنے اُسی فخر کے ساتھ ایک نوسکھ بالغ کو کیوں نہ پیش کیجئے! اور جس طرح دوسری

مصر

سال	ان پڑھ آبادی	عمر	ان پڑھ آبادی کا اوس
۱۹۰۷ء	۹۲ لاکھ	۱۵ سال اور اس سے اوپر	۹۲٫۸
۱۹۴۷ء	۹۱ "	"	۸۰٫۱۱

ترکی

سال	ان پڑھ آبادی	عمر	ان پڑھ آبادی کا اوس
۱۹۳۶ء	۷۷ لاکھ	"	۸۹٫۳
۱۹۴۵ء	۸۱ "	"	۷۱٫۵
۱۹۵۰ء	۸۸ "	"	۶۸٫۱

ہندوستان

سال	ان پڑھ آبادی	عمر	ان پڑھ آبادی کا اوس
۱۹۰۱ء	۱۶ کروڑ ۷۰ لاکھ	"	۹۳٫۵
۱۹۳۱ء	۱۸ " "	"	۹۰٫۴
۱۹۵۱ء	۳۰ "	"	۸۳٫۴

اعداد وشمار کے ان نقشوں سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ ان پڑھوں کا اوسط فیصدی برابر گر رہا ہے، اصل تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور آج دنیا میں ۷۰ کروڑ انسان ان پڑھ ہیں یعنی انسانی آبادی میں ہر پانچ اشخاص میں دو اَن پڑھ کا حساب ہے۔ اس صورتِ حال میں کیا کوئی شخص ناخ مسئلے کی طرف سے آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ اور اسے اس قسم کے بیانات سے حل کیا جا سکتا ہے کہ "اپنا وقت بچوں کی تعلیم پر صرف کیجئے، ایک یا دو نسلوں کے بعد ملک میں کوئی اَن پڑھ نہیں رہے گا؟" مذکورہ دشمار سے واضح ہوتا ہے کہ ہم اس مسئلے کو حل نہیں کر سکے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء میں ہندوستان کی تمام ریاستوں نے ابتد اوپر اپنی کل آمدنی کا ۱۰ء فیصدی حصہ صرف کیا تھا۔ اس پر بھی معلوم ہوا کہ اسکول کی عمر کے جتنے بچے ہیں ان میں ہر ایک کے حساب سے بچوں کو ابتدائی تعلیم مل سکی ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ان سب بچوں کو تعلیم دیں تو صرف ابتدائی تعلیم ہمیں اپنی آمدنی کا تقریباً ۲۲ فیصدی حصہ خرچ کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے ہم اتنا نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم کو ملک میں خواندگی فیصدی بڑھانے کی غرض سے اس سے کم خرچ کوئی تعلیمی نظام اختیار کرنا ہے اور وہ کم خرچ تعلیمی نظام یہی بالغوں کی

اندگی سے کس شکل میں فائدہ پہنچا	دہلی میونسپلٹی	نئی دہلی	دیہی علاقہ
تعلیم یافتہ سوسائٹی میں آنے جانے لگا	-	۱۸٫۱	۱٫۴
ں اچھے عادات واطوار سیکھ گیا	-	۱۸٫۱	۵٫۷
ی اور فائدہ ؟ پوسٹر، لبسوں کے نمبر، لوں کے نام، پڑھنے لگا ہوں۔ بچوں کی ھائی میں مدد کرسکتا ہوں۔ پڑوسیوں اور ستوں کو پڑھا سکتا ہوں	-	-	۸٫۶
ے بچوں کی پڑھائی میں ان کی مدد کرسکتا ہوں ردوستوں کو پڑھا سکتا ہوں۔	-	-	۱۳٫۰
ر کا روزانہ کا کام دھندا اچھی طرح کرسکتا ہوں گھر کا حساب کتاب رکھ سکتا ہوں۔	۱۶٫۶	۵۴٫۵	۴۰٫۵

مذکورہ بالا جوابات سے دو طرح کا اشارہ ملتا ہے ایک تو یہ ان سے اُن لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ندگی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ دوسرا یہ کہ خواندگی سے چاہے فوری طور پر پیسہ نہ ملے مگر پیسہ حاصل کرنے کے بڑھاوا دینے والی قوت ضرور حاصل ہوتی ہے

تعمیری کاموں میں لوگوں کے لئے کشش پیدا ہوتی ہے سنجیدگی سے اور باضابطہ سوچے سمجھے ہوئے گراموں کے ذریعے۔ الل ٹپ کوشش کرنا اور اس کے بعد اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ ان کوششوں میں ش آسمان سے نازل ہوگی، اور اگر یہ نزول آسمانی واقع نہ ہو تو آسمان کو الزام دینا کہ وہ کشش نہیں بھیجتا نہیں ہے۔ ہماری مہموں کے "کمانداروں" کے اوپر میرے ایک پروفیسر دوست کی مثال صادق آتی ہے جو ہیں "بھئی آپ کا ساتھی (پارٹ نر) بن کر برج کھیلنے سے کیا فائدہ جب آپ کے پاس کام کے پتے ہی نہیں ے!" دنیا جانتی ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں میں ایک خاص قسم کا نقطۂ نظر پیدا ہو یا وہ ایک ذرا مشکل کا ہنر سیکھ لیں تو ہمیں اس کی تربیت کے لئے ایک ماحول پیدا کرنا پڑتا ہے اور ماحول اتنا قوی کہ جمود کسل

سرگرمیوں پر ہزاروں لاکھوں روپے اور بے تحاشا محنت صرف کرتے ہیں، اُسی طرح روپیہ اور محنت خواندگی بھی کیوں نہ صرف کیجئے!

ہم میں سے بعض لوگ اپنے اطمینان کے لئے اپنے آپ دلیلیں گھڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "خواندگی میں کوئی نہیں ہے اور منطقی حیثیت سے دیکھئے تو ہونی بھی نہیں چاہیئے"۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے احباب عملِ ا کے بارے میں ایک مخصوص قسم کا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز کم و بیش اس طرح کا ہے: "ہم جو ہیں اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں اس سے فی الفور کوئی مادّی فائدہ پہنچے۔ ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سیکھ ا فوری طور پر کوئی مادّی فائدہ نہیں پہنچتا تو پھر اس کے لئے وہ کوشش ہی کیوں کریں؟ اُن کو اس سے کیا فائد اور پھر اُسی وقت اَن پڑھوں کی طرف سے اس سوال کا جواب بھی خود ہی دے لیتے ہیں "کچھ نہیں"۔ ایسا کر بجائے اگر ہم ذرا تامّل کریں اور یہ سوچیں کہ خود ان پڑھوں کی اس باب میں کیا رائے ہے تو زیادہ مناس

ابھی حال میں انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی طرف سے دہلی میں سوشل ایجوکیشن کے کام کا کرنے کی غرض سے ایک جائزہ لیا گیا تھا۔ ایسوسی ایشن نے سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں میں حصہ لینے والو ایک سوال نامہ رکھا تھا جس کے ذریعے اُن سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ بتائیں کہ آیا انھیں خواندگی کی بدو کوئی فائدہ ہوا ہے اور اگر ہوا ہے تو کس شکل میں۔ ذیل کے نقشے میں ان کے جوابات کا خلاصہ دیا جا رہا

خواندگی سے کس شکل میں فائدہ پہنچا	دہلی میونسپلٹی	نئی دہلی	دیہ
میں پڑھنا لکھنا سیکھ گیا	-	-	۹؛
میں دستخط کرنا سیکھ گیا	-	-	۹
میں خط پڑھنا اور لکھنا سیکھ گیا	۴۹٫۹	۹۰٫۰	۶
میں آسان آسان تہذیبی اور مذہبی کتابیں اور اخبار پڑھنا سیکھ گیا۔	۳۳٫۳	۹۳٫۶	۶
میں اس کی بدولت اپنا کام زیادہ مستعدی سے کرنے لگا	۳۳٫۳	۱۸٫۱	۰
اس سے میرے علم میں اضافہ ہو گیا۔ اب میں تازہ خبروں اور بین الاقوامی حالات کو سمجھنے لگا	۱۶٫۶	-	

جوابات کا خلاصہ بھی ملاحظہ کیجئے :

جانے کا مقصد	دہلی	نئی دہلی	دیہی علاقہ
خواندگی کی تعلیم کے لئے	۱۲٫۱	۹۷٫۵	۸۱٫۷
کتب خانہ اور ریڈنگ روم میں کتابیں اور اخبار پڑھنے کے لئے	۵٫۱۹	۷٫۴	۲٫۵
دستکاری سیکھنے کے لئے	۳۶٫۵	-	۳۱٫۲
بحث مباحثے اور لیکچر سننے کے لئے	۴٫۸	-	۱٫۷
ریڈیو سننے کے لئے	-	-	-
اخبار، دیواری اخبار وغیرہ پڑھنے کے لئے	۹٫۷	-	۰٫۸۶
فلم شو دیکھنے کے لئے	-	-	-
تفریحی اور تہذیبی پروگرام کے لئے	۱۸٫۷	-	۷٫۸
فرصت کا وقت گذارنے کے لئے	۲٫۴	-	-
علم حاصل کرنے اور بُری عادتوں سے نجات پانے کے لئے	۱۲٫۱۹	۴٫۷	۴٫۳

اس سلسلے میں یہ ذکر کردینا مناسب ہے کہ اُوپر کے نقشے میں جتنی سرگرمیوں کا ذکر ہے، وہ قریب قریب سب ان تمام سنٹروں میں چلائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جیسا کہ نقشے سے ظاہر ہوتا ہے، نئی دہلی کے سنٹروں میں ۸۱٫۷ فیصدی اور دیہی علاقوں میں ۹۷٫۵ فیصدی تعداد خواندگی کی تعلیم کی غرض سے آتی تھی جس کے مقابلے میں دوسری سرگرمیاں ہیں جن میں شریک ہونے کے لئے آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ صرف دہلی میونسپلٹی کے سنٹروں میں خواندگی اور مطالعے کے لئے آنے والوں کی تعداد کم یعنی کل ۳۱٫۶ فیصدی تھی جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شہر میں خواندہ لوگوں کا اوسط پہلے ہی سے اونچا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے لوگ دوسری نوعیت ہی کے پروگراموں سے دلچسپی لیں گے۔

بامقصد طریقے سے پڑھنا لکھنا سیکھنا بہرحال ایک مشکل عمل ہے، اور ان پڑھ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ وہ اس سے جھجکتے اور اعراض برتتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودغرض طبقوں کی

تذبذب اور شک و شبہے کی کیفیت پر چھا جائے نہ کہ یہ کیفیت ماحول کے اوپر حاوی ہو کر اس کی تاثیر کو زائل کر دے۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ تعمیر کے سلسلے میں ہم جتنی سرگرمیاں چلا رہے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی لوگوں کے لئے زیر کشش نہیں ہے۔ اگر پارٹیوں کے سیاست داں انتخابوں کے موقعوں پر نئے بیانات کا جادو نہ چلائیں اور چنا زبردست ماحول پیدا کر دیا کریں تو کوئی بھی ووٹر ووٹ دینے اپنے آپ چلا جائے گا۔ یا جیسا کہ آر۔ وی۔ صاحب نے بالعموم کہا ہے کہ "اگر بچے کے اوپر سماج کا دباؤ نہ رہے اور اسے یہ خیال نہ ہو کہ اگر وہ اسکول نہ گیا تو لوگ اسے بری نظروں سے دیکھیں گے، تو کوئی بچہ بھی خوشی سے اسکول جائے گا؟" یہی صورت حال کے بارے میں بھی ہے۔ اس کے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ پورا سماج ناخواندگی کو کلنک سمجھنے لگے۔

خواندگی پروگراموں کی کمی کا ایک بڑا سبب اور بھی ہے۔ "تعلیم بالغان" کے مفہوم کی جگہ اب "سوشل ایجوکیشن" کے مفہوم نے لے لی ہے۔ ہمارے بیشتر ایجوکیشن سنٹروں میں بالعموم لیکچر، فلم شو، ڈراما، بھجن، نوجوانوں اور بچوں اور خواندگی کے پروگرام منظم کئے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں، بھجن، فلم شو اور لیکچر کی تنظیم تو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو بھی آسان ہے اور ان میں لوگ بھی آسانی سے آ جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں پڑھنا لکھنا سیکھنا ہے جو ایک ہنر ہے اور مشقت کا متقاضی ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ آدمی ہمیشہ وہی راستہ اختیار کرتا ہے جس میں کم سے کم مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔ دراصل راز یہ ہے۔ اس بات کا کہ فلم شو، بھجن اور لیکچر وغیرہ کو "کامیاب" اور "خواندگی کو" ناکام" کا لقب دیا گیا۔ جب تک ایک ہمہ گیر مہم نہ اٹھائی جائے گی اور خواندگی کے حق میں نفسیات کا جادو نہ جگایا جائے گا، اس وقت امید لگانا کہ گھنٹی کا بٹن دبانے ہی لوگ جوق در جوق آپ کے تنگ و تاریک اور گھٹے ہوئے پڑھائی کے کمروں میں آئیں گے اور آپ کے خشک، بے ربط، بے قاعدہ اور مشکل زبان میں لکھی ہوئی مشقی کتابیں پڑھنے لگیں گے ۔۔۔ قائم کرنا قرین انصاف نہ ہوگا۔ آپ کسی ان پڑھ سے پوچھ دیکھئے۔ نہ وہ خواندگی کے فضائل سے انکار کرے گا اور نہ لئے آپ کے درجے میں آنے سے۔ مگر ہوگا کیا؟ ایک آدھ ہفتہ آ کر چپکے سے کھسک جائے گا۔ ایمان سے کہئے کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا ہے؟ میرا عقیدہ ہے کہ پڑھنا لکھنا سیکھنے میں ان پڑھوں کے لئے ڈیولپمنٹ کی دوسری سرگرمیوں کے مقابلے میں زیادہ کشش ہوتی ہے۔

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے جس جائزے کا اوپر ذکر کیا ہے، اس کے سوالنامے میں منجملہ دوسرے کے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آپ سوشل ایجوکیشن کے سنٹروں میں کس ارادے سے جاتے ہیں؟" اس سوال

ڈاکٹر صاحب۔ نے فرمایا " جناب یہ سیاست میں پڑنے کی بات نہیں ہے۔ اگر سوشل ایجوکیشن کے ذریعے لوگوں کے سماجی
ادات و اطوار اور طرز فکر میں تبدیلی نہیں آتی تو پھر مجھے بتایئے کہ سوشل ایجوکیشن کا اور کیا منصب ہے؟"

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر نے کہا " ڈاکٹر صاحب! جب ہم یہ سوچیں کہ گاؤں کے لوگ اس ایجنسی کے خلاف
یسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں تو ایجنسی کو بھی۔۔۔ اپنے دامن میں منہ ڈال کر سوچنا چاہئے کہ وہ گاؤں والوں سے کیسا سلوک
رتی ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایجنسی کے نمایندے گاؤں کے اوپر پولیس کو بلواتے ہیں اور اُن کا چالان تک کرا دیتے ہیں؟
و آپ تو تعلیم کے ماہر ہیں آپ خود جانتے ہیں کہ تعلیمی عمل کا اثر اتنا سست اور کمزور ہوتا ہے کہ اس قسم کے جارحانہ واقعات کے
ثر میں ڈوب کر بالکل زائل ہو جاتا ہے۔"

صحبت کی گرمی اس گفتگو کے بعد قریب قریب ٹھنڈی پڑگئی اور مونسول تبدیل ہوگیا۔

یہ واقعہ اگرچہ مقامی ہے اور ضروری نہیں کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کو ہر جگہ اسی قسم کے واقعات، وحادثات سے
دوچار ہونا پڑتا ہوگا لیکن اس واقعے میں ہمارے لئے دعوتِ فکر ضرور ہے اور ہمیں سوچنا چاہیئے کہ آیا لوگوں کے سماجی عادات
اطوار اور طرز فکر میں تبدیلی لانا جو واقعی سوشل ایجوکیشن کا نہایت اہم اور بنیادی منصب ہے، ایسے حالات میں کس طرح اور
ہاں تک ممکن ہے جب سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ پولیس کی جارحانہ سرگرمیاں مثلاً ڈرانا دھمکانا، چالان
رپیٹ اور محض شک و شبہے کی بنیاد پر قید و بند کے واقعات بھی جاری رہتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کا یہ مطلب تو نہیں کہ قانون کے تحفظ اور امن و امان قائم رکھنے کے انتظامات میں
خلل پڑے! اس مسئلے میں بالکل اسی طرح کی بات تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بھی کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ قانون کے تحفظ اور امن
و امان قائم رکھنے کے سلسلے میں جو اقدامات کئے جاتے ہیں وہ تعلیمی عمل کے اثرات اور ماحول کو ایک سرے سے زائل کر دیتے ہیں تو جب
س طرح سے بنی ہوئی بات بار بار بگڑتی رہے تو تعلیمی پروگراموں اور ان کے اوپر محنت اور سرمایہ لگانے سے کیا حاصل؟ جھگڑے
تو رکھئے دور، واقعہ یہ ہے کہ ضرورت دونوں کی ہے۔ قانون کے تحفظ اور امن و امان قائم رکھنے کے انتظامات کی بھی اور
ایجوکیشن کے پروگراموں اور سرگرمیوں کی بھی، اس لئے کہ دونوں کا آخری مقصد ایک ہی ہے۔ دونوں یہی چاہتے
کے اندر ذمے داری اور امن پسندی کا ایسا گہرا احساس پیدا ہو جائے کہ امن و امان کے محافظوں کو لوگوں
خل اندازی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ اس احساس کی کیفیت کس عمل سے پیدا ہوتی
ہے؟ قانون اور امن و امان کے محافظوں کا عمل بالعموم تشدد پر مبنی ہوتا ہے اور تشدد سے ذمے داری
ی کا احساس نہ پیدا ہوتا ہے اور نہ برقرار رہتا ہے بلکہ الٹی ضد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تعلیم براہ راست

قیام امن اور سوشل ایجوکیشن

برکت علی فراق

زیرِ نظر مضمون میں "قیامِ امن" سے مراد "امن عالم" نہیں ہے جسے انگریزی زبان میں بالعموم Peace یعنی "سلامتی" سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ اس سے مقصود وہ "امن و امان" ہے جسے عام طور پر "لا اینڈ آرڈر" کے لفظ سے جانا جاتا ہے اور جہاں عام طور پر پولیس اور عدالتیں منظر عام پر آتی ہیں۔

——— ایڈیٹر

ایک صحبت میں جہاں سوشل ایجوکیشن اور اُس کے پروگراموں کی کامیابی اور ناکامی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی، ایک دوست نے جو اصولِ تعلیم کے ڈاکٹر ہیں، ایک نہایت دلچسپ سوال اُٹھایا۔ فرمانے لگے "صاحب آپ کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکے پروگراموں سے گاؤں والوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ جس ایجنسی کے کاموں سے اُن کو یہ کچھ فائدے پہنچے ہوں، اُسی کے خلاف اسی گاؤں کے لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو قانون اور اخلاق دونوں کے نزدیک جرم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سوشل ایجوکیشن سے لوگوں کو مادی فائدے تو ممکن ہے ہوتے ہوں مگر ان کے اندر سماجی اور اخلاقی [illegible]"

گاؤں والوں کی [illegible] ڈاکٹر صاحب کا اشارہ تھا وہ اس میں [illegible] جیسے ایجنسی کی زیر [illegible] جانے کے لئے مخصوص راستہ بنانا، اس کا ناجائز استعمال، حد بندی کی توڑ پھوڑ، مویشیوں کے چراگاہ تک جانے کے لئے مخصوص را[illegible] کی دو[illegible] باوجود ان کا اپنے مویشیوں کو پرانے ہی راستے سے لے جانا جواب ایجنسی کے کسی پلان کے اندر آچکے [illegible] جو صاحب اپنے پروگراموں کی نوعیت اور ان کے اثرات و نتائج کی داستان سنا رہے تھے [illegible] والوں میں عام طور پر پارٹی بندی ہوتی ہے۔ ہم اور ہمارے ساتھی ان دونوں میں اپنا تعلیمی کام کرتے [illegible] میں بالکل نہیں پڑتے۔"

ہے، وہ ہے مسئلے کو حل کرنے کے لئے "جمہوری طریقۂ کار"۔ لوگوں کے اوپر خوف و ہراس کی کیفیت طاری کرنا، گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیس دینا اور قانون کا احترام سکھانے کے بجائے اُسے ہوّا کی شکل میں پیش کرنا پولیس کا شعار اُس وقت تھا جب ملک محکوم تھا اور حاکموں کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ ہر وقت اور ہر معاملے میں دبے دبے اور سہمے سہمے رہیں۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے، مگر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ اُس زمانے میں پولیس کی ٹریننگ پانے والوں کو نئی نئی گالیاں اور مار پیٹ کے ڈھنگ سکھائے جاتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں "لال پگڑی" خطرے اور اندیشے کی گھنٹی سمجھی جاتی تھی اور لوگ گاؤں میں مہاماری پھیلنے سے اتنے خوف زدہ نہیں ہوتے تھے جتنا پولیس کے دو چار سپاہیوں کے آنے سے ہراساں ہو جاتے تھے۔

مگر یہ سوراج اور جمہوریت کا دور ہے۔ اگر پولیس کا شیوہ اور پولیس میتوں کی ٹریننگ کا وہی پرانا ڈھنگ قائم رہا، وہ اسی طرح لوگوں کے لئے خوف و ہراس کا باعث بنے رہے اور اُن کے عمل سے گیہوں کے ساتھ گھن بدستور پستے رہے، اگر گاؤں میں اُن کا آنا خیر و برکت اور عدل و انصاف کا پیغام نہ بنا اور لوگ بدستور انھیں اپنے لئے ظلم و جبر اور مہاماری کی علامت سمجھتے رہے تو تعلیمی ماحول تو کم زور سی چیز ہے خود جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ امن و امان کے قیام کا انتظام بھی تعلیمی کام کرنے والوں کے سپرد کر دیا جائے، یہ تجویز کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان نہیں رکھ سکتا۔ مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ پولیس کے لوگوں کو کسی معاملے کی تحقیقات کرتے وقت گاؤں یا بستی میں کام کرنے والے تعلیمی کارکن سے استصواب ضرور کرنا چاہیے۔ اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے کسی عمل سے لوگوں کے اوپر تعلیم کا جو اثر ہے، وہ زائل نہ ہونے پائے۔ لوگوں کو یہ اطمینان رہے کہ پولیس کے لوگ انصاف کا خون کرنے نہیں، انصاف کا بول بالا کرنے آئے ہیں، وہ اس جرّاح کی طرح ہیں جس کا کام بدن کو تندرست رکھنے کے لئے بدن کے سڑے ہوئے حصّے کو کاٹ کر الگ کرنا ہوتا ہے۔

مگر نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اپنے آپ نہیں آ جائے گی۔ جس طرح محکومی کے زمانے میں پولیس کے لوگوں میں خوف و ہراس کی کیفیت ...اکرنے کی ٹریننگ دی جاتی تھی اُسی طرح اب انھیں یہ ٹریننگ دی جانی چاہیے کہ وہ جب کسی بستی میں جائیں تو ان کی آمد سے لوگوں کے اوپر خوف کی کیفیت کی بجائے خیر و برکت اور عدل و انصاف کی کیفیت پیدا ہو۔ ان کے اندر سوشل ایجوکیشن، اس کی اہمیت و افادیت اور ...س کی ضرورت کا یقین پیدا کیا جائے اور جب وہ ڈیوٹی پر ہوں تو انھیں تاکید کی جائے کہ بستی کے اندر تعلیم سے جو ماحول ...بن گیا ہے، اس میں ان کی کسی حرکت سے خلل واقع نہ ہونے پائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا اُس وقت تک لوگوں کے اطوار اور طرزِ فکر میں تبدیلی لانے کا سوشل ایجوکیشن کا منصب یقینی طور پر پورا نہیں ہوگا۔

دل اور دماغ کو متاثر کرتی ہے اور ایک بات جسے دل اور دماغ دونوں قبول کرلیں ایمان کا جزو بن جاتی ہے اور اس سے کسی کو ہٹانا تشدد تو کیا میر کے بس کی بھی بات نہیں ہوتی۔

اس موقعے پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے جسے یہاں دہرانا نامناسب نہ ہوگا۔ سفر ڈنمارک میں ایک بار ایک گاؤں کے پولیس مین سے ملاقات ہوئی۔ ترش روئی اور طبیعت کی سختی جس کا ملاقات سے پہلے مجھے گمان تھا، ان کے اندر دور دور نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے برعکس وہ نہایت متواضع اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے میں نے ان سے فرمائش کی کہ وہ مجھے بتائیں کہ پولیس مین ہونے کی حیثیت سے ان کے کیا فرائض ہیں۔ انھوں نے اپنے فرائض کی بڑی لمبی چوڑی فہرست بتائی، ایسی کہ کوئی دیانت داری سے کام کرے تو اُسے پلک جھپکانے کی بھی فرصت نہ ملے۔ میں نے حیرت سے پوچھا" اتنا کام ہے آپ کے اوپر کہ آپ کو آرام کرنے تک کی بھی فرصت نہیں ملنی چاہئے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ اپنے گھر اور فارم پر اُسی طرح کام کرتے ہیں جیسے دوسرے کسان۔ آپ کو تو ضلعے کے صدر مقام پر آنے ہی جانے سے فرصت نہیں ملنی چاہیئے۔"

میرے استعجاب پر وہ بڑے زور سے ہنسے اور کہنے لگے " ہمارے یہاں پولیس مینی صرف ضابطے کی خانہ پُری کے لئے ہوتی ہے۔ میرے کاموں کی فہرست واقعی بہت لمبی ہے مگر ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی واردات واقع ہوتی ہوگی۔ مجھے قاعدے سے رات کو پہرہ بھی دینا چاہئے مگر واقعہ یہ ہے کہ میں ٹانگ پھیلا کر آرام سے سوتا ہوں۔ ضلعے کے صدر مقام پر مجھے مہینے میں ایک بار علاقے کی کیفیت بتانے کے لئے جانا ہوتا ہے یا اُس وقت جب علاقے کا کوئی ایک یا دو چار نوجوان اٹھارہ سال کے ہو جائیں اور انہیں فوج میں بھرتی کرانا ہو۔ اس کے علاوہ میرا پورا وقت خالی رہتا ہے جسے میں اپنے گھر اور فارم کے کاموں پر لگاتا ہوں۔"

یہ صورت حال دنیا جانتی ہے، ڈنمارک میں پولیس اور امن وامان کے دوسرے محافظوں کے ہاتھوں نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس کی تعلیمی تحریکوں کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اور دوسرے نیم ترقی یافتہ ملکوں میں یہ صورت حالات نہیں ہے اور پولیس کے لوگ اس اطمینان کے ساتھ ٹانگ پھیلا کر آرام سے سو نہیں سکتے مگر اس کے ساتھ انہیں تنگ [illegible] نہیں کھونا چاہتے ورنہ وہ سکون و آرام جو ڈنمارک کے پولیس مین کو حاصل ہے قیامت تک حاصل نہ ہوگا۔

تو پھر ہونا کیا چاہیے؟ کیا تمام ان کا انتظام بھی سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے؟ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا، ہندوستان میں بحالتِ موجودہ دونوں کی ضرورت ہے۔ جو بات ہونی چاہیئے اور غالباً ہوا

گاؤں والوں کی زندگیوں پر حاوی ہیں۔ اس کے علاوہ پنچائتوں کے پاس سرمائے کی کمی کی وجہ سے اُن کی حیثیت محض گماشتوں کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ لٹریچر اور کتب خانوں میں معقول ساز و سامان کی کمی کی وجہ سے ۶۲ فیصدی نوسکھ بالغ اپنی تعلیم کو جاری نہیں رکھ سکے اور اپنی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت کو کھو کر پھر ناخواندگی کی حالت کو پہنچ گئے ہیں

ایک دوسری افسوس ناک حقیقت جو اس جائزے سے روشن ہوتی ہے یہ ہے۔ گاؤں میں یہ جذبہ نظر نہیں آتا کہ وہ اپنے زورِ بازو اور اپنے وسائل پر بھروسہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ مدت کے پروگراموں کو قبول کرنے سے کتراتے ہیں، جس میں سالہا سال تک مسلسل محنت اور جاں فشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ تشویش ناک بات جس کا اس جائزے سے پتہ چلا ہے یہ ہے کہ ان پروجیکٹوں اور بلاکوں میں بعض اوقات پروگرام چند افسروں کی پنک کی خاطر یا اس مقصد سے بنائے جاتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی یا عہدے دار بلاک کو دیکھنے آنے والا ہے۔ اور اُسے خوش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ باریکیوں پر نظر رکھنے والے مشاہدین کی طرف سے اکثر اور بجا طور پر یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ بلاکوں اور پروجیکٹوں میں جو اصلیت ہے اُسے چھپایا جاتا ہے اور دیکھنے والوں کو بہکانے کی غرض سے دکھاوے کے پروگرام عارضی طور پر چلا دئے جاتے ہیں۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی وزارت کو چاہئے کہ وہ اس صورتِ حال کو روکے

کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے پیچھے جو فلسفہ اور آدرش ہے وہ بالکل ظاہر ہے، ابھی تک اس کی انتظامی مشینری پر اثر انداز نہیں ہوا ہے۔ اور وہ اُسی پرانی دفتر شاہی کی ڈگر پر چل رہی ہے۔ شری بلونت رائے مہتا کی رہنمائی میں ان اسکیم کا مطالعہ کرنے کے لئے جو کمیٹی بنی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم تحقیق یہی تھی اور غالباً اسی کی روشنی میں اس کمیٹی نے اس اسکیم پر کام کرنے کی غرض سے انتظامی مشینری میں مرکزیت کے مقابلے میں لامرکزیت یعنی مقامی کنٹرول کے اصول کی سفارش تھی۔ ہمیں امید ہے کہ کمیونٹی پروجیکٹ کی انتظامی مشینری میں لامرکزیت کا آہستہ آہستہ نفاذ کیا جائے گا۔ تاکہ اسکیم کا انتظام چلانے والوں کا نقطۂ نظر بدلے اور لوگوں میں یقین و اعتماد کی کیفیت پیدا ہو۔

(سُنیل گوہا۔ اے آئی سی اکنامک ریویو)

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام میں دراڑیں

آگرہ یونیورسٹی کے سماجی علوم کے انسٹی ٹیوٹ نے یو.پی کے پورے ۱۱۴ ڈیولپمنٹ بلاکوں
لیا تھا جس سے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے مفہوم اور اس کے کاموں کے بارے میں بعض بنیادی نقائص
ہے. اس جائزے سے جس کا موضوع تحقیق ڈیولپمنٹ بلاک اور خاص طور پر اٹاوہ پائلٹ پروجیکٹ تھ
ہے کہ جن علاقوں کو ان پروجیکٹوں کے لئے منتخب کیا گیا تھا ان کا انتخاب سے پہلے عام سروے نہیں کیا گ
یہ ہے کہ ان علاقوں میں لوگ جن حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کے بارے میں کوئی معقول معلومات مو
جس سے یہ پتہ چلتا کہ پروجیکٹ شروع کرنے سے پہلے ان کی کیا حالت تھی اور پروجیکٹ کی مدت ختم ہونے
کیفیت ہے. اسی طرح کی ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ان پروجیکٹوں کے افسروں نے لوگوں کی ضرورتوں اور وس
سے کوئی علم حاصل نہیں کیا. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ ترقیاتی سرگرمیاں طے کی گئیں اور ان میں مقدم اور موخر کے
گئے، وہ سب غلط بنیادوں پر مبنی تھے.

ان پروجیکٹوں میں بیشتر مشین اور سائنس کے استعمال پر بے سوچے سمجھے زور دیا گیا. اس سے یہ ہوا ہے کہ
پروجیکٹ پروگرام کی صرف سرگرمیوں سے واقف ہیں. ان کے پیچھے جو مقصد ہے اس سے ان کو اتنی واقفیت نہیں
سرگرمیوں سے ایک ایسا ماحول بنا جس کے اثر سے لوگ پروگرام اور مقصد میں خلط ملط کرنے لگے. اس خلط مل
ہوا ہے کہ تبدیلی لانے کے بارے میں جیٹ منگنی پٹ بیاہ کے اصول کو ضرورت سے زیادہ غلبہ حاصل ہو گیا او
کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا کہ دباؤ کے اثر سے آئی ہوئی اس بناوٹی تبدیلی کے سماجی نتائج کیا ہوں گے.

اس طرح لوگوں کے سوچنے کے پرانے طریقے اور ان کے نئے ماحول کے درمیان کی کڑی غائب ہو گئی
نئے طرح کے سماجی رشتوں کی متقاضی ہوتی ہے اس بات کا دور دور بھی کہیں نشان نہیں ملتا. اس سلسلے میں ی
پچھلے انتخابوں کی کیفیت کا ذکر کرنا ضروری ہے. ان انتخابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ذات پات کے تعصبات او

بیمار کلب

ڈنمارک کے بیمار کلب (سِک کلب) دراصل باہمی فائدے کی سوسائیٹیاں ہیں جو ایک مناسب چندے (پریمیم) کے بدلے اپنے ممبروں کی صحت کا بیمہ کرتی ہیں، اور وقت ضرورت انھیں طبی امداد بہم پہنچاتی ہیں، ہسپتال میں اُن کے علاج کا انتظام کرتی ہیں، ولادت اور زچگی کے وقت خدمات بہم پہنچاتی ہیں اور کسی کسی وقت ایسے ممبروں کی جن کی آمدنی میں علالت کی وجہ سے کمی آجاتی ہے، نقدی سے بھی مدد کرتی ہیں۔ ان بیمار کلبوں کو ڈنمارک میں بہت مقبولیت حاصل ہے اور ان کے حلقے میں ملک کی تریب قریب پوری آبادی آجاتی ہے۔ یہ اسکیم یہاں یونہی نہیں مقبول ہوگئی ہے بلکہ اس کے پیچھے ڈنمارک کے لوگوں کی مِل جُل کر کام کرنے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی صدیوں کی روایات ہیں۔ اس کے علاوہ اسے سہارا اور تقویت دینے کی نیت سے ریاست نے بھی قانون بنائے ہیں۔

مختصر تاریخ

کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ ان باہمی فائدے کی سوسائیٹیوں کی بنیاد تیرھویں صدی ہی میں مسافروں کی برادریوں اور حفاظتی پنچایتوں کی شکل میں پڑ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سنتھائیں بھی ایک دوسرے کی مدد کے اصول ہی پر کام کرتی تھیں اور وہ جو فوائد اور خدمات بہم پہنچاتی تھیں وہ ممبروں ہی تک [illegible] ہتی تھیں مگر اس کی موجودہ شکل دراصل انیسویں صدی میں اُبھری۔ اِس زمانے میں جس طرح کے سماجی اور [illegible] حالات پیدا ہوگئے تھے ان کی روشنی میں محسوس کیا گیا کہ اگر "ایک دوسرے کی مدد کی تحریک" کو کا [illegible] تو اسے مزید تقویت پہنچانا لازمی ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ بیمار کلبوں کے دستور میں یہ فقرہ "ایک دوسرے کی مدد کی تحریک کی" ان کلبوں کے بنیادی اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ یہ بیمار کلب سب سے پہلے ۱۸۹۲ء میں قائم ہوئے تھے اور اس کے بعد سے اب تک بتدریج بڑھتے اور ترقی کرتے رہے یہاں تک کہ آج ڈنمارک کی پوری آبادی کسی نہ کسی شکل میں بیمار کلبوں سے وابستہ ہے۔

طریقۂ کار

ان بیمار کلبوں کی رُکنیت اختیاری ہوتی ہے اور اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سادی اور دوسری سرگرم

تجربے

ڈنمارک میں سماجی تحفظ

(۱)

شری ایس۔ راگھون
سوشل ایجوکیشن آفیسر کیرالا اسٹیٹ

جولائی ۱۹۵۶ء میں بین الاقوامی دفتر محنت (انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن) کے اہتمام میں ایشیائی ملکوں کا ایک وفد سماجی تحفظ کے ایک ٹریننگ کورس میں شرکت کرنے کی غرض سے ڈنمارک گیا تھا۔ شری راگھون نے اس وفد میں ہندوستان کی نمایندگی کی تھی۔

زیرنظر مضمون میں موصوف نے صحت کے بیمے سے متعلق ڈنمارک کی اسکیم کا تعارف دیا ہے جو وہاں کی "باہمی فائدے کی سوسائیٹیاں" (میوچول بینی فٹ سوسائٹیز) چلاتی ہیں اور آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کی اسکیموں پر عمل کرنے کے کہاں تک امکانات ہیں۔

ہم اس مضمون کا آزاد ترجمہ "کیرالا ایجوکیشن کوارٹرلی" کے شکریے کے ساتھ (دو قسطوں میں) ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ ـــــ ایڈیٹر

تمہید

باہمی فائدے کی سوسائیٹیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے حکومت ڈنمارک کے اشتراک میں بین الاقوامی دفتر محنت نے کوپن ہیگن میں ایک ٹریننگ کورس منعقد کیا تھا جس میں مختلف ملکوں کے ۲۵ نمایندے شریک تھے اس ٹریننگ کورس کے لئے ڈنمارک کا انتخاب ہر حیثیت سے صحیح انتخاب تھا اس لئے کہ باہمی فائدے کی سوسائیٹیاں جس حد تک اس ملک میں کامیاب ہوئی ہیں اتنی کسی اور ملک میں نہیں ہوئی ہیں۔ کورس کی تنظیم بڑی سائنٹفک تھی۔ اس میں موضوع سے متعلق مختلف مضمونوں پر لیکچروں کا سلسلہ تو تھا ہی، اس کے علاوہ اس اسکیم کے متعدد اداروں کی سیر بھی داخلِ نصاب تھی۔ اس طرح نمایندوں کو موضوع کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کا پورا پورا موقع ملا۔

ڈنمارک کی سرزمین میں بیمار کلبوں کی بڑی نشوونما ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں رسل و رسائل کی بڑی آسانی ہے، مقامات ایک دوسرے سے قریب پڑتے ہیں، آبادی گھنی ہے، باشندوں میں زبان، نسل، مذہب اور درجے اور حیثیت کے اعتبار سے بڑی یکسانیت ہے، لوگوں میں تعلیم عام اور معیار کے لحاظ سے خاصی اونچی ہے اور امداد باہمی اور اشتراک و تعاون کا شعور ان کی زندگی کا جزو لازم بن گیا ہے۔ ان کی افادیت کے پیشِ نظر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ آیا یہ نیچ ان ملکوں میں بھی جہاں حالات ایک سرے سے مختلف ہیں، بویا جاسکتا ہے اور اگر بویا جاسکتا ہے تو اس میں کہاں تک کامیابی ہوسکتی ہے۔

(باقی اگلے پرچے میں)

مضمون کی دوسری قسط میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ یہ اسکیم ہندوستان میں اس کے مخصوص حالات کو دیکھتے ہوئے کہاں تک اور کس شکل میں اختیار کی جاسکتی ہے۔

لوگ ان کے رکن بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنی مرضی سے بنتے ہیں اس لئے کہ پورے ملک میں بھی ایک ایسی سنستھا ہے جو صحت کا بیمہ کرتی ہے۔ مگر اس اختیار کے ساتھ ایک قانونی دباؤ بھی ہے جو محض اس غرض کے لئے ہے کہ لوگوں کو اس کی رکنیت کی طرف رغبت ہو۔ وہ یہ کہ جو لوگ ان بیمار کلبوں کے ممبر نہیں بنتے انھیں ۱۲ کرونر[1] جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ سادی رکنیت کا چندہ بھی قریب قریب اتنا ہی ہوتا ہے اس لئے لوگ جرمانہ دینے کے بجائے کلبوں کے سادے ممبر ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ابتدا میں لوگوں کو سادہ رکن ہی بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک منزل پر پہنچ کر لوگ سرگرم رکنیت کے لئے درخواست کرتے ہیں۔ سرگرم رکنیت کی شرطیں بڑی سخت ہوتی ہیں اور ممبری کا چندہ (پریمیم) بھی نسبتاً زیادہ ہوتا ہے مگر اسی اعتبار سے انھیں جو فائدے پہنچتے ہیں وہ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سادے ممبر صرف بڑھاپے کی پنشن کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں سرگرم ممبروں کو طبی امداد، ہسپتال کا علاج، روزانہ نقد الاؤنس، دوائیں اور ولادت اور زچگی کے زمانے کی خدمات مفت حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ممبر چاہیں (اور کچھ مزید خرچ کریں) تو خصوصی ماہروں کی خدمات، دانت کی بیماریوں کا علاج، شفایاب ہونے کے بعد بحالی صحت کے مرکزوں کا خرچ، مخصوص اور طاقت پہنچانے والی دوائیں، اپنے گھر پر رہ کر علاج معالجے کی سہولتیں وغیرہ بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی چندے (پریمیم) میں تھوڑا سا اضافہ منظور کرلے تو کام کے قابل نہ رہنے کی صورت میں نقد الاؤنس کا بھی حقدار ہو جاتا ہے۔

ان غیر معمولی فوائد کو دیکھتے ہوئے قدرتی بات ہے کہ ملک کی آبادی کا ۷۰ فیصدی حصہ ان کلبوں کے سرگرم ممبروں پر مشتمل ہے۔ سادے ممبروں کا اوسط صرف ۹ فیصدی ہے جس میں زیادہ تر وہ لوگ آتے ہیں جو سرگرم رکنیت کے قابل نہیں سمجھے گئے۔

ان بیمار کلبوں کی آمدنی کا ۲۵ فیصدی حصہ مرکزی حکومت اور کمیونوں (میونسپلٹیوں) سے امداد کی صورت میں آتا ہے۔ اس امداد کے علاوہ سرکاری ہسپتال ان کلبوں کی طرف سے آئے ہوئے مریضوں سے معاوضہ بھی نسبتاً کم لیتے ہیں۔ آمدنی کا باقی حصہ ممبروں کے پریمیم (چندوں) سے آتا ہے۔ ڈنمارک کے ان بیمار کلبوں کی خصوصیتیں یہ ہیں کہ وہ ارتباط باہمی کے اصول پر قائم ہوتے ہیں، ان کی حیثیت آزاد اور رضاکار اداروں کی ہوتی ہے، ان کا نظم و نسق اور انتظام ان کا اپنا ہوتا ہے اور ان کی غرض و غایت نفع کمانا نہیں ہوتی۔

---

[1] کرونر ڈنمارک کے سکّے کو کہتے ہیں جس کی قیمت ایک شلنگ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

تجویز کی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کے لئے فرقہ واریت کو ختم کرنے کے پروگرام چلانے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں ان موضوعوں پر سماجی علوم کے ماہرین کی رائے بھی حاصل ہو۔

سیمنار کی رائے تھی کہ ان موضوع پر ماہرین کی رائے حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۱) فرقہ واریت اور ذات پات کی سماجیاتی اور نفسیاتی بنیاد۔

(۲) آج کے ہندوستان میں ذات پات ــــــ کیسے اور کیوں بُری ہے۔

(۳) دیہی علاقوں میں فرقوں کی تقسیم اور کمیونٹی ڈیویلپ منٹ اور سوشل ایجوکیشن کے پروگرام پر ان کا اثر۔

(۴) سوشل ایجوکیشن اور فرقہ واریت ۔ ذات پات کی برائیوں کو روکنے کے لئے کون سے پروگرام مناسب ہوں گے۔

ان موقعوں پر جب کہ فرقہ واریت کے بندھن سوشل ایجوکیشن کے کاموں میں رکاوٹ بنیں، کارکنوں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

شری اے۔ آر۔ ڈیش پانڈے، ڈائرکٹر فنڈامنٹل ایجوکیشن سنیٹر نے سیمنار کی صدارت کی جس میں حکومت ہند کے مددگار مشیر تعلیم شری سوہن سنگھ، پلاننگ کمیشن کے شری ڈی۔ پی نائر اور فنڈامنٹل ایجوکیشن سنیٹر میں یونیسکو کے ٹیکنیکل ایکسپرٹ چارلس بیج نے بات چیت میں حصہ لیا۔

ایڈلٹ ایجوکیشن کی پیشہ ورانہ اور عام تعلیم

بالغوں کی عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کے موضوع پر اس سال ۶ر اکتوبر سے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۸ء تک ایک سیمنار جینیوا میں ہوگا۔

یہ سیمنار جسے مزدوروں کی تعلیم کے بین الاقوامی وفاق (انٹرنیشنل فیڈریشن آف ورکرس ایجوکیشن) نے منعقد کیا ہے بالغوں کی عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کے آپسی تعلقات، اور ان کی نوعیت اور بالغوں کی تعلیم کے پروگرام کے تحت کیا کیا تعلیم دی جانی چاہئے، وغیرہ باتوں پر غور کرے گا۔

یہ سیمنار خاص طور سے یوروپی ملکوں کے لئے ہو رہا ہے جس میں دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی شریک ہو سکتے ہیں

گاؤں میں بجلی پیدا کرنے کا نیا طریقہ

دہلی کے پاس خانپور گاؤں میں بجلی تیار کرنے کا ایک نیا تجربہ شروع کیا گیا ہے۔ اس میں گاؤں کے ایک کنوئیں پر ایک

کراچی میں یونیسکو کے ایک علاقائی مرکز کا قیام

جنوب مشرقی ایشیا کے لئے بالغوں کے لکھنے پڑھنے کے سامان کی تیاری کے لئے یونیسکو نے حکومت پاکستان کے تعاون سے ایک علاقائی مرکز قائم کیا ہے۔

یہ سینٹر جس کے تحت برما ہندوستان، پاکستان اور ہو سکتا ہے ایران کا علاقہ آتا ہے۔ اردو، ہندی تامل سنہالی، برمی اور بنگالی زبانوں میں نوخواندہ بالغوں کے لئے کتابوں وغیرہ کی تیاری کے لئے ایک اطلاعاتی مرکز کا کام کرے گا۔ سینٹر اپنی طرف سے کتابوں کی تیاری کا کام تو نہیں کرے گا بلکہ کم داموں پر سیدھی سادی زبان میں لکھی ہوئی اچھی کتابوں کی تیاری میں تکنیکی امداد بہم پہونچائے گا۔

اس علاقائی سینٹر کے ڈائرکٹر، پاکستان وزارت تعلیم کے سابق نائب مشیر ڈاکٹر اختر علی ہوں گے۔

(یونیسکو)

دہلی کے علاقے میں سوشل ایجوکیشن کا مسئلہ

سوشل ایجوکیشن کی کوآرڈینیٹنگ کونسل کا ایک جلسہ مر اگست کو وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شریمالی کے زیر صدارت نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس جلسے میں دہلی میں کتب خانوں کی خدمات میں اصلاح کے لئے ضروری اقدامات، میونسپل کارپوریشن کے سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے کام اور ملی پور جنتا کالج کے کاموں کا اندازہ کرنے والی کمیٹی کی سفارشات پر غور کیا گیا۔

ایک پریس نوٹ میں بعد میں بتایا گیا کہ اس جلسے نے دہلی میں سوشل ایجوکیشن کے کاموں کو ایک انتظام کے تحت لانے کے امکانات پر کافی غور و خوض کیا اور طے کیا کہ اس سلسلے میں آئندہ دہلی ایڈمنسٹریشن، دہلی میونسپل کارپوریشن اور وزارت تعلیمات کے بیچ بات چیت کی جائے گی۔

ذات پات اور سوشل ایجوکیشن

نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سینٹر میں ٹریننگ حاصل کرنے آئے ہوئے ڈسٹرکٹ سوشل ایجوکیشن افسروں نے ایک سیمینار میں یہ

خاص طرح کی مشین لگائی گئی ہے جسے بیل چلاتے ہیں۔ اس مشین کے چلنے سے اتنی بجلی تیار ہو جاتی ہے کہ اُس سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا کارخانہ چل سکے اور گھروں اور گلیوں میں بجلی کی بتی جلائی جا سکے۔ یہ اپنے ڈھنگ کا ایک نیا تجربہ ہے جو امریکی سائینسداں کی امداد سے کامیاب ہو سکا ہے۔

بیلوں کی طاقت سے آبپاشی کے لئے کنویں پر ایک خاص طرح کا پمپ بھی چلایا جا سکتا ہے، جو ایک منٹ میں ۲۰۰ گیلن یعنی پرشین وہیل سے کئی گنا زائد پانی نکال سکتا ہے۔ یہ پمپ اور بجلی کی مشین بٹھانے پر ۱۵ ہزار سے ۲۰ ہزار تک خرچ پڑتا ہے۔

پردھان منتری شری نہرو نے، جو اس نئے تجربے کا معائنہ کرنے گئے تھے، اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کے اور گاؤں میں بھی اس طرح کا تجربہ شروع کیا جائے گا۔

(بقیہ صفحہ ۱۷)

طرف سے اس کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ ان مرحلوں کو پار کر لیجئے، کلاس کی اچھے اور باقاعدہ طریقے پر تنظیم کیجئے، سائنٹفک طریقے پر تعلیم دیجئے، اور اس کام کو ان لوگوں کے سپرد کیجئے جن کا اس کی افادیت پر ایمان ہے اور جو محنت سے کام کر سکتے ہیں۔ اور پھر دیکھیئے کہ آپ کے لئے مایوسی کی کال کوٹھری کھلتی ہے یا کامیابی کی پر فضا جنت!

(مسلسل)

تعلیم و ترقی



The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

nter and Publisher : BARKAT ALI Firaq : Printed at Rama Krishna Printing Press Delhi.

ادارۂ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم وترقی (دہلی)

جلد ستمبر ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر ۹

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم وترقی جامعہ ملیہ جامعہ نگر (نئی دہلی)

ٹیلی فون نمبر ۴۶۴۶۱

قیمت سالانہ:- چار روپے

اِشارات

نویں نیشنل سیمینار کا ورکنگ پیپر

جیسا کہ ناظرین کو خبروں اور اطلاعات سے معلوم ہو گیا ہوگا، اس سال انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے نیشنل سیمینار کا اجلاس وسط دسمبر میں (ریڈیسی ہاؤس) لکھنؤ میں ہونے والا ہے۔ سیمینار کے لئے غور و بحث کا موضوع "سوشل ایجوکیشن کی تنظیم قصباتی علاقوں میں" رکھا گیا ہے، اس کے عنوانات بحث کا خاکہ بھی مشتہر کر دیا گیا ہے، اور دعوت دی گئی ہے کہ اگر کوئی صاحب اس خاکے میں کوئی ردّ و بدل یا ترمیم و اضافہ مناسب سمجھتے ہوں تو اپنی تجویز پہلی اکتوبر تک ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری کے پاس بھیج دیں۔

ورکنگ پیپر کی نوعیت

ورکنگ پیپر کا مجوزہ خاکہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترتیب دینے والا (جو بالعموم سیمینار کا ہونے والا ڈائرکٹر ہوتا ہے) موضوعِ بحث سے متعلق سب کچھ خود کہنا چاہتا ہے اور نمائندوں سے صرف ہر بات میں "ہاں" کرا کے اُسے آخری مستند شکل دینا چاہتا ہے۔ یہی غالباً سبب ہے کہ یہ اس قدر طویل ہے اور اتنا مفصل کہ اس میں بظاہر کسی کے کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہے۔

اِدھر کچھ عرصے سے ایسا نظر آتا ہے کہ سیمینار والوں کے ورکنگ پیپر اس غرض سے ترتیب نہیں دیئے جاتے کہ اُن سے سیمینار میں حصہ لینے والوں کو سوچ بچار کی تحریک ہوگی بلکہ اس نیت سے مرتب کئے جاتے ہیں کہ ورکنگ پیپر میں کہی ہوئی باتوں کو سرکاری ریزولیوشنوں کی طرح سیمینار میں پیش کر کے اس کی سند حاصل کر لی جائے مگر یہ قاعدہ کانفرنسوں اور برسرِ اقتدار پارٹیوں کا ہوتا ہے۔ سیمینار کانفرنسوں سے بالکل مختلف ایک طریقہ کار ہے جہاں مختلف نمائندوں کے خیالات اور تجربات کی روشنی میں مقررہ موضوع سے متعلق پہلے مسائل کی تشخیص کی جاتی ہے اور پھر ان مسائل کے حل کے لئے نسخے تجویز کئے جاتے ہیں، اسی بنیاد پر سیمینار کی سفارشات اور فیصلے کثرتِ رائے کے

ترتیب مضامین

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

اس بیان میں یہ بات صاف نہیں ہے کہ ابتدائی قدروں کا یہ فقدان شہری علاقوں کے صرف چند مخصوص طبقوں میں ہے یا پوری آبادی میں۔ اگر پوری آبادی کہتے ہیں — اور جیسا کہ سوشل ایجوکیشن کے حلقۂ عمل کی وضاحت کے سلسلے میں اکثر کہا گیا ہے کہ تعلیم کی ضرورت صرف ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ لوگوں کو نہیں ہے، بلکہ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بھی ہے، سوشل ایجوکیشن کے حلقۂ عمل میں شہروں کی پوری آبادی ہی آتی ہے — تو سوشل ایجوکیشن کی، ذمے داریاں جتنی اب ہیں، ان سے کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ اس ہمہ گیر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پھر بہت بڑے پیمانے پر پلاننگ کرنی پڑے گی اور ان تمام اداروں کا احاطہ کرنا پڑے گا جو کلب گھروں، تمدنی، تفریحی اور تعلیمی مرکزوں اور تجارتی ڈھنگ کی تفریح گاہوں کی شکل میں اونچے طبقوں کے لوگوں کے لئے قائم ہیں۔

اور اگر موخر الذکر بات کا دعویٰ کر کے یہ کہا جائے کہ مجوزہ کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل (مختلف اداروں کے کاموں میں باہم تال میل پیدا کرنے والی انجمن) ان سب اداروں کا احاطہ کرے گی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کونسل میں یہ سب جماعتیں شریک ہی ہوں گی یا انڈین ادلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن بھی اسی طرح کی ایک انجمن ہے مگر پورے ملک کو الگ رکھئے کیا دلی ہی کے تمام کلب، سینما ہال، رقص و موسیقی کے مراکز — اور ان کو تو چھوڑیے، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے راٹری کلب وغیرہ جو براہ راست ادلٹ ایجوکیشن ہی کے ادارے ہیں، اس انجمن کے ممبر ہیں؟ یا آئندہ بننا چاہتے ہیں؟

۴۔ تمہیدی باتوں کے بعد بحث کے خاکے میں کام کی نوعیت کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ باتیں بھی کچھ نئی نہیں ہیں، انھی معروف اور جانی پہچانی باتوں کا ذکر ہے جو اب تک بمبئی، میسور، دلی جیسے بڑے بڑے شہروں میں ہوتی آئی ہیں، مثلاً سماجی زندگی کی بنیادی اقدار کے احیاء کے لئے ایسے چھوٹے چھوٹے گروپ بنانا جن میں لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں۔ لوگوں میں شہریت کا شعور بیدار کرنا یہاں تک کہ لوگوں کو اپنے شہر یا قصبے کی خوبیوں پر فخر کا اور خامیوں اور برائیوں پر ندامت کا احساس ہونے لگے، اس مقصد نوجوان کلب، کمیونٹی سنٹر، صحت و صفائی کی مہمیں، شہر کو خوبصورت بنانے کے منصوبے، حکومت سے کتب خانے اور شہریت کے احساس کو ابھارنے والے دوسرے ادارے قائم کرانے کے لئے مظاہرے اور مہمیں منظم کرنا، یونیورسٹیوں اور کالجوں سے لکچروں کے سلسلے منظم کروانا اونچی تعلیم کے لئے شبینہ کالج چلوانا۔ وغیرہ۔

ایک جگہ برطانیہ کی مثال دیتے ہوئے سیمینار سے فرمائش کی گئی ہے کہ "وہ اس بات کی تحقیق کرے کہ آیا یونیورسٹیوں اور دوسرے اداروں کی مشترک کمیٹیوں کا قیام کس حد تک کامیاب رہے گا"

سوال یہ ہے — اور اسی سوال کو نظر انداز کر دیا گیا ہے — کہ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور مختلف

بجائے اتفاقِ کامل کی بنیاد پر کئے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔

ورکنگ پیپر کے طویل اور مفصل ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ موضوع بحث سے متعلق ایک آدھ جگہ کے علاوہ کوئی بحث ہی نہیں اٹھائی گئی ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قطعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ زیر بحث مسئلہ کچھ نیا نہیں ہے۔ اس کی صرف زبان اور ترتیب نئی ہے۔ جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ سب کہیں نہ کہیں سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مختلف طریقے پر کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں، ضرورت البتہ اس کی ہے کہ ان مختلف کاموں میں باہم ربط قائم کرنے کا کوئی طریقہ نکلے جو قول کی زبان سے تو اکثر سننے میں آتا ہے مگر عمل کی زبان سے کہیں سننے میں نہیں آتا۔

غرض سیمینار کا موضوع ہمارے خیال میں وقت کا اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے جتنا اور بہت سے مسائل ہیں۔ مثلاً: کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم میں سوشل ایجوکیشن کے مستقبل کا مسئلہ۔

ورکنگ پیپر کے موضوعات بحث پر ایک نظر

مگر اب جبکہ بحث کے لئے یہ موضوع طے ہی ہو چکا ہے آیئے اس کے اوپر ایک نظر ڈال لی جائے اور جہاں جہاں کچھ تشنگی محسوس ہوتی ہے، اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ بحث کے خاکے کی تمہیدی سطور میں شروع ہی میں کہا گیا ہے کہ "دیہی علاقوں میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم کے تحت سوشل ایجوکیشن کا کام سرکاری اہتمام میں ہو رہا ہے۔ اس کے پروگرام میں جو خامیاں ہیں ان کے باوجود اتنا ہر حال طے ہے کہ کام ہو رہا ہے اور منظم طور پر ہو رہا ہے۔"

کام کی تنظیم تو اس میں شک نہیں باضابطہ ہے مگر ہمیں تعجب ہے کہ ورکنگ پیپر کے مصنف (یا مصنفین) کیسے یہ بھول گئے کہ اس اسکیم کے ہاتھوں سوشل ایجوکیشن کی درگت بھی ہو رہی ہے اور اس کا خود وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔

ہماری پُر زور رائے ہے کہ اصل موضوع پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اگر اس مسئلے پر بھی ایک آدھ دن بحث کر لی جائے اور اس بارے میں سیمینار اپنا فیصلہ دے دے۔

۲۔ اسی باب میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "شہروں میں سماجی زندگی کی جو ابتدائی اور بنیادی قدریں ہوتی ہیں وہ یکسر مٹ گئی ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شہری زندگی کی بہت سی لعنتیں اسی نقدان کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان قدروں کو پھر سے قائم کرنے کے لئے ایک تعلیمی کوشش کی بڑی ضرورت ہے۔"

سیمینار کو چاہئے کہ اب جبکہ وہ شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی نئی تنظیم کے باب میں غور و خوض کرنے کے لئے جمع ہو رہا ہے، شہروں میں جنتا کالج کے قیام پر پوری سنجیدگی اور بے تعصبی کے ساتھ غور کرے۔

آخر میں حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں کو اس سلسلے میں مشورے دیئے گئے ہیں۔ ان مشوروں سے جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے، اس نے نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر قائم کر کے ان کاموں کا آغاز کر دیا ہے۔ جہاں تک حکومت کی جانب سے تعمیر کی جانے والی بستیوں میں کمیونٹی سنٹر اور کتب خانے کے لئے عمارتیں بنوانے کا سوال ہے۔ حکومت ہند نے قانون تو نہیں بنایا ہے مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے، وہ عملاً اس مشورے پر عمل کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے کم سے کم ان امور میں حکومتِ ہند کو مشورہ دینے کے بجائے مبارکباد دینی چاہیے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر خاکہ بحث میں جو اپنی جگہ بہت مکمل اور جامع ہے، اگر مذکورہ بالا سوالات کی روشنی میں مناسب ردوبدل کر لیا جائے تو سیمینار کو غور و خوض کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوگی۔

مقامات پر ہوتا رہتا ہے اور ہو بھی رہا ہے، اگر یہ سب کچھ جس طریقے پر ہو رہا ہے ـــ جس کا ابھی تک کسی جگہ ٹھوس شکل میں کوئی نتیجہ نہیں نکلا ـــ یہ اُسی پرانے طریقے پر ہونا چاہئے یا نتیجہ حاصل کرنے کے لئے اس طریقے میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے؟ اس باب میں نہ تو خاکۂ بحث ہی میں کچھ کہا گیا ہے اور نہ سیمینار سے اس سلسلے میں کچھ سوچنے کی فرمائش ہی کی گئی ہے۔

یہ سوال بہت اہم ہے اور اسی ضمن میں ایک سوال یہ بھی اُٹھتا ہے کہ یہ سب کچھ کرے گا کون؟ ہماری مراد اُس شخص سے ہے جو کمیونٹی سنٹر آرگنائزر کے روپ میں لوگوں کا اصل معلم ہوتا ہے۔ خاکۂ بحث میں جہاں اسٹاف کی تفصیل دی گئی ہے، وہاں افسر ٹائپ کے لوگوں کی صلاحیت، تعلیمی معیار اور عام سوجھ بوجھ کا تو مختصراً ذکر کیا گیا ہے مگر جو اصل شخص ہے اور جو اصل محاذ پر کام کرے گا، اس کے بارے میں بالکل خاموشی برتی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں شہروں میں سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کے ناکام ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ کمیونٹی سنٹروں کے آرگنائزر مزدور سمجھ کر مقرر کئے جاتے رہے ہیں۔ سیمینار کو اس باب میں بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ معمولی تعلیم اور سوجھ بوجھ کے آرگنائزر گاؤں میں تو چل جائیں مگر شہروں میں جہاں لوگوں کا تعلیمی معیار بالعموم اونچا ہوتا ہے، نہ معمولی شخصیت کے آدمی سے کام چل سکتا ہے، نہ معمولی تعلیم پائے ہوئے آدمی سے۔

۴۔ آگے چل کر یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ کام کون کون سے موجودہ ادارے کریں گے اور کس طرح کے نئے ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں نام صرف تین اداروں کا لیا گیا ہے اور آخر میں لفظ "وغیرہ" بڑھا دیا گیا ہے۔ وہ تین نام یونیورسٹیاں، کالج اور لیبر یونینیں ہیں۔ ان میں سے لطف کی بات یہ ہے کہ ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اڈلٹ ایجوکیشن کے میدان میں کام کیا ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تین نام سوشل ایجوکیشن کی نئی ایجنسیوں کے طور پر لئے گئے ہیں۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے تو شہری علاقوں کے لئے جنتا کالج کی تجویز کرنے میں کیا برائی تھی؟

اگرچہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے جنتا کالج کا نام سوشل ایجوکیشن کے حلقوں میں بہت بدنام ہے اور جس فراخ دلی سے سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والی دوسری ایجنسیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جنتا کالجوں کا ذکر نہیں آتا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح مستقل اڈلٹ اسکولوں کی اسکیم محض اس وجہ سے بنی ہے کہ خواندگی کا کام کہیں اور کبھی جم کر نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح یہ بھی سمجھ رکھنا چاہئے کہ خواندگی کے علاوہ سوشل ایجوکیشن کے دوسرے کام مستقل اور باضابطہ کرنے کے بجائے جب تک بھٹکل طریقے پر کئے جائیں گے، ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، اور باضابطہ اور مستقل اسکول قائم کر کے یہ کام کرنے کا واحد طریقہ وہی ہے جو ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کی تحریک ہمیں بتاتی ہے۔

کیا یہاں بھی حکومت ہی کو پیش قدمی کرنی چاہئے ؟

شہری علاقوں میں سماجی تعلیم کی تنظیم میں حکومت کا براہ راست حصہ لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں یہ ہیں :-

(۱) شہروں میں سماجی قوتیں مجموعی اعتبار سے سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کے حق میں ہیں، اور حکومت کو اس میں خواہ مخواہ اپنی طاقت نہیں لگانی چاہئے۔

(۲) گاؤں کے مقابلے میں شہروں میں ایسے بہت سے آدمی مل سکتے ہیں، جو ان کاموں میں پیش قدمی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکیں۔ سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کی تنظیم ایسے ہی لوگوں کے اوپر چھوڑ دینی چاہئے۔

(۳) گاؤں کے مقابلے میں شہر زیادہ مالدار ہیں، اور سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں میں پیش قدمی کرنے والے حضرات کے سامنے صرف حکومت کی امداد کا ہی سہارا نہیں رہ جائے گا اور وہ اس کام کے لئے مقامی لوگوں سے بھی کچھ سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا دلائل میں بہت وزن ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان سہولتوں کے باوجود شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی حالت تشویش ناک حد تک ابتر ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس کی یہ حالت دن بدن گرتی جا رہی ہے ایسی حالت میں ضروری ہے کہ حکومت بھی اس طرف توجہ کرے اور اس سلسلے میں کچھ ٹھوس کام کرائے۔

کہا جا سکتا ہے کہ شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کی باقاعدہ تنظیم کی آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ؟ کیوں نہ اسے اس وقت کے لئے چھوڑ رکھا جائے۔ جب لوگوں کی اوسط آمدنی میں اضافہ ہو جائے اور حکومت کے پاس بھی اتنی افراط ہو جائے کہ وہ تعلیم کے اوپر مزید اخراجات برداشت کر سکے۔ آج حکومت اور عوام دونوں کے وسائل بہت محدود ہیں اور ان سے ابھی بہت سی بنیادی ضرورتیں بھی نہیں پوری ہو پا رہی ہیں۔

شہروں میں سوشل ایجوکیشن پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں انتشار اور بے چینی کی کیفیت بڑھ گئی ہے اور لوگوں کو اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں

الف۔ آج شہری علاقوں میں خاص طور سے تعلیم کے فوری انتظام کی ضرورت ہے۔ مثال کے لئے خواندگی کو ہی لیا جائے۔ گاؤں کے مقابلے میں شہری اور قصباتی زندگی میں اس کی ضرورت زیادہ شدید ہے اور آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ خواندگی کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

ب۔ شہروں میں سماجی زندگی کی جو تبدیلی اور بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ کم مرتب گئی ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ

شہری علاقوں میں سماجی تعلیم
نویں نیشنل سیمینار کا ورکنگ پیپر!
(۱)

تمہید

دیہی علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کے لئے اب ایک نظام بن چکا ہے۔ اپنی خامیوں کے باوجود بہرحال اتنا ہے کہ یہ کام ہو رہا ہے اور باقاعدہ ہو رہا ہے اور اس نے گاؤوں کی ترقی کے پروگراموں میں سوشل ایجوکیشن کی اہم کو جتلا دیا ہے اور لوگوں میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ ترقیاتی پروگراموں میں سوشل ایجوکیشن یا عام تعلیم ایک ایسا ہے، جس میں ہمیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا چاہئے۔

مگر شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ابتک کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے گاؤوں کی ترقی کے لئے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم شروع ہوئی ہے، شہروں کی طرف سے توجہ بہت کچھ ہٹ گ ہے اور ان اسکیموں کے شروع ہونے سے پہلے شہروں میں سوشل ایجوکیشن کا جو کچھ بھی برا بھلا کام (مثال کے لئے خواندگی کو لیا جا سکتا ہے) ہو رہا تھا۔ اب یا تو بالکل ٹھپ ہو چکا ہے یا اس کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔

مگر کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ شہروں میں بھی سوشل ایجوکیشن کا کام اُسی طرح منظم طریقے پر شروع کیا جائے جس طرح دیہی علاقوں میں ہو رہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ کوئی تعلیمی پروگرام ہو، اُسے منظم طریقے پر انجام دینا اس سے اچھا ہوتا ہے کہ اُسے سماجی محرکات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے کہ موقع آنے پر سماج کی قوتوں کے ابھارنے سے وہ خود پورا ہو جائے گا۔

اصل سوال جو پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ شہروں میں منظم طریقے پر سوشل ایجوکیشن کا پروگرام شروع کرنے میں پہل

سماجی تعلیم کا ایک فطری عمل ہے ۔ دینی ہوگی، یہاں تعصب اور تنگ نظری اور یہاں تک کہ سماج دشمن رجحانات کی بنا پر لوگوں کے مفاد مختلف ہوتے ہیں ۔ ان کا غلبہ آج شہری زندگی میں بہت زیادہ ہے ۔

شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کا خاص کام نوجوانوں اور شہریوں کے کلب اور کمیونٹی سینٹروں کی تنظیم کرنا ہوگا ۔ شہر میں رہنے والوں کو اپنے پڑوسیوں اور ہمسایوں سے ملنے جلنے کے مواقع حاصل نہیں ہوتے ہیں ۔ یہ سماجی سرگرمیاں اور کلب ان کے لئے اس طرح کے مواقع فراہم کردیں گے جو موجودہ شہری زندگی میں ایک بہت نمایاں کام ہوگا ۔

نوجوان کلبوں کا خاص کام جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، لوگوں میں شہریت کا شعور بیدار کرنا ہے ۔ یہ شعور یوں ہی خلا میں پیدا نہیں ہو جائے گا ، اس کے لئے ان کے بیچ کچھ سرگرمیاں منظم کرنی ہوں گی ۔ تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں کے علاوہ ان کلبوں کو شہری زندگی سے براہ راست تعلق رکھنے والے پروگرام بھی چلانے ہوں گے جیسے :-

کھلی جگہوں اور کھلے میدانوں کا انتظام کرنا اور انھیں صاف ستھرا رکھنا ۔

شہر میں صفائی کا انتظام کرانا ، خاص طور پر وہ مقامات جو عام استعمال کے ہوتے ہیں ، انھیں صاف ستھرا رکھنا ۔

لوگوں میں اچھی عادتیں پیدا کرنا ، جیسے قطار بنا کر کھڑے ہونا

صفائی کی مہیں چلانا

عوامی تحفظ کے کام

لوگوں کے لئے کتب خانوں وغیرہ کا انتظام کرنا ۔

ب ۔ شہر والوں کی تعلیم کے لئے جو بھی انتظام کیا جائے گا ، وہ گاؤں سے مختلف ہوگا ۔ گاؤں میں جس طرح خواندگی کی مہیں چلا کر کام نکال لیا جاتا ہے ، جس میں لوگوں کو ایک بار صرف شناسن بنا کر ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ یہ صورت حال ہونے کو تو گاؤں کے لئے بھی قابل اطمینان نہیں ہے مگر شہروں کے لئے تو یہ بالکل بیکار ہے ۔

خواندگی کا تعلق بہت کچھ تعلق ، صحیح معنوں میں ذریعہ معاشس سے ہوتا ہے ۔ اس لئے شہروں میں اس بات کی ضرورت ہے کہ یہاں بالغوں کے مستقل اور باقاعدہ اسکول قائم کئے جائیں جہاں لوگوں کو پہلی جماعت سے لے کر ثانوی جماعتوں تک کی تعلیم مل سکے ۔ ان اسکولوں سے فارغ ہونے کے بعد طالب علموں کو یونیورسٹیوں میں داخلے لینے کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں ۔

اسی طرح کم سے کم بڑے بڑے شہروں میں شام کے کالج قائم ہونے چاہئیں ۔ جہاں لوگ اگر چاہیں تو دفتروں اور دوسری جگہوں میں کام کرتے ہوئے اپنی پڑھائی جاری رکھ سکیں ۔

شہری زندگی کی بہت سی لعنتیں اسی کمی کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان قدروں کو پھر سے قائم کرنے کے لئے ایک تعلیمی کوشش کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو یہ تخریبی رجحانات ہمارے مسائل میں اسی طرح رخنے ڈالتے رہیں گے۔ اور اصل مسئلہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ ابھی ریاستوں کی نئی تنظیم کے موقع پر کیا ہوا تھا۔ اس موقع پر جو ہنگامے برپا ہوئے تھے، وہ کہاں ہوئے تھے؟ وہ بڑے بڑے شہروں تک ہی تو محدود تھے۔

کام کی نوعیت

یہ مان لیا جائے کہ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ایک الگ اور مخصوص انتظام کی ضرورت ہے، تو پھر سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ کام کس ڈھرّے پر ہو؟ جس ڈھرّے پر یہ کام گاؤں میں ہو رہا ہے وہی یہاں کے لئے بھی مناسب ہے یا اسے اُس سے کچھ مختلف ہونا چاہئے۔

جہاں تک سوشل ایجوکیشن کے بنیادی تصور کا تعلق ہے وہ ہر جگہ یکساں ہے مگر اُسکے عملی پروگرام مختلف جگہوں پر وہاں کے حالات اور ضروریات کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔

دیہی علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کا، جو کام ہو رہا ہے، اُس میں تین پہلوؤں پر خاص توجہ دی جاتی ہے (۱) بستی کی تنظیم (۲) تعلیم اور تہذیب، اور (۳) پنج سالہ منصوبوں کے مطابق کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگراموں کے لئے لوگوں کے ذہنوں کو ہموار کرنا۔ شہروں میں چونکہ آبادی بہت زیادہ ہوتی اور گاؤں کے مقابلے میں یہاں مختلف پیشوں اور مختلف استعداد کے لوگ رہتے ہیں اس لئے سوشل ایجوکیشن کی رفتار یہاں اُس قدر تیز ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثال کے لئے پنج سالہ منصوبے کے لئے لوگوں کے ذہن کو ہموار کرنے کے کام کی یہاں گاؤں کے مقابلے میں ضرورت کم ہوگی۔ شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کا کام اس ڈھرّے پر ہو سکتا ہے۔

۱۔ شہری اور قصباتی زندگی میں ان قدروں کا فقدان ہوتا ہے جو چھوٹی چھوٹی بستیوں کی خصوصیت ہوتی ہیں، جہاں لوگ ایک دوسرے کو قریب سے جانتے پہچانتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہوں۔ اس کمی کی وجہ سے لوگوں میں سماج دشمن رجحانات بڑھتے ہیں۔ شہروں میں ضرورت اس بات کی ہے کہ چھوٹے چھوٹے گروپ بنائے جائیں جہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے مواقع نصیب ہوں۔ یہ احساس ہمیں خاص طور پر نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں میں پیدا کرنا ہے۔ پھر لوگوں میں شہریت کا شعور بیدار کرنا یہاں تک کہ لوگوں کو اپنے شہر یا قصبے کی خوبیوں پر فخر کا احساس ہونے لگے اور خامیوں اور برائیوں پر ندامت۔ شہری زندگی میں جو مسائل اُٹھتے ہیں ان کو باہمی تعاون سے حل کرنے کی تعلیم جو

اُصول اور طریقے

خواندگی کی حمایت میں

(۳)

شری مشتاق احمد

مضمون کی دوسری قسط میں جو اگست ۱۹۵۵ء کے پرچہ میں چھپی تھی مضمون نگار نے خواندگی کے خلاف عام طور سے پیش کی جانے والی چار دلیلوں میں سے تین کا جواب دیا تھا۔

زیرِ نظر قسط میں باقی ماندہ چوتھی دلیل کا جواب دیا گیا ہے اور زیرِ بحث موضوع سے متعلق مثبت دلائل پیش کئے گئے ہیں ——— ایڈیٹر

چوتھی دلیل

داخلہ لینے کے بعد بہت بڑی تعداد میں لوگ کلاسوں کو چھوڑ دیتے ہیں، لہٰذا خواندگی سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ غالباً دوسرا سب سے اہم خیالی درد سر ہے جس کا دُکھڑا رویا جاتا ہے۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ لوگ کلاسوں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر آیئے دیکھیں یہ واقعہ کس حد تک اور کن اسباب کی بناء پر ہوتا ہے۔

کلاس شروع کرنے سے پہلے بیشتر اوقات خواندگی کے لئے تحریک اور شوق دلانے والی سرگرمیاں منظم کی جاتی ہیں مثلاً سینما شو یا سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی تقریر وغیرہ۔ اب سمجھ کر کہ لوگ آمادہ ہو گئے ہیں، ان سب لوگوں کے نام جو کلاس میں حاضر ہوتے ہیں، لکھ لئے جاتے ہیں۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ان میں سے سب کو یکایک خواندگی کا شوق نہیں پیدا ہو گیا ہو گا۔ کچھ ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جو محض تماشے اور تفریح کی غرض سے شامل ہو جاتے ہیں اور چند دن کے بعد کلاس میں آنا بند کر دیتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پڑھنا لکھنا اپنے بس کا روگ نہیں، چنانچہ دو چار دن کے بعد بھاگ لیتے ہیں۔ پھر استاد جس انداز سے پڑھاتا ہے، اُسے دیکھ کر رونا آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پڑھانے کی نہیں طالب علموں کو بھگانے کی تدبیریں کر رہا ہے اور چند کے معاملے میں اس کی ترکیبیں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ پھر کچھ لوگ اس لئے غیر حاضری کرتے ہیں کہ غیر حاضری کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کی بناء پر لوگ کلاس چھوڑتے،

ان باقاعدہ اسکولوں کے علاوہ جن کا ملکی نظام تعلیم سے براہ راست تعلق ہوگا، شہروں میں لیکچروں کے مخصوص کورس بھی چلائے جاسکتے ہیں۔ یہ کورس مختلف موضوع پر ہوسکتے ہیں جیسے عام آدمیوں کے لئے گھر کی آرائش، عوامی تحفظ جس میں سڑکوں کے قاعدے قانون بھی شامل ہوں، اور حفظان صحت کے کورس مختلف موضوع پر ہوسکتے ہیں جیسے عام آدمیوں کے لئے گھر کی آرائش، عوامی تحفظ جس میں سڑکوں کے قاعدے قانون بھی شامل ہوں اور حفظان صحت کے کورس، نوجوان کلب کے ممبروں اور خاص طور پر ان کے لیڈروں کے لئے عوامی استعمال کے مقامات کو ٹھیک رکھنے، جلسے جلوس میں مجمعوں پر قابو پانے، اور فرسٹ ایڈ پر تقریری سلسلے منعقد کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح نوجوان کلبوں کے لیڈروں کے لئے جلسے جلوس اور دوسری تقریبوں پر پروگراموں کو خوش اسلوبی سے چلانے اور نوجوان کلبوں کی تنظیم اور پروگرام اور جلسے جلوس اور دوسری تقریبوں میں پروگراموں کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانے کے مخصوص کورس بھی چلائے جاسکتے ہیں، اس سے ہمارے عوامی اداروں کو اپنا کام چلانے میں بڑی مدد ملے گی۔

شہروں میں افادیت کے لحاظ سے سب سے بڑا تہذیبی ادارہ کتب خانہ ہوتا ہے۔ اب تقریباً ہر شہر میں کتبخانے قائم کرنے کا پروگرام بن چکا ہے۔ اس سلسلے میں جو سب سے بڑا کام کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ متعلقہ افسروں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ کتب خانوں کو قائم کرنے کا جلد از جلد انتظام کریں اور جہاں یہ کتب خانے پہلے سے قائم ہیں، وہاں لوگوں کو ان کے صحیح استعمال کی تعلیم دی جائے۔ اسی کے ساتھ ہر شہر میں "ودیا دان سبھائیں" قائم کی جاسکتی ہیں جو باقاعدہ تقریروں کا انتظام کریں۔ یہ سبھائیں کتب خانوں کے تحت بھی قائم ہوسکتی ہیں اور ان سے الگ ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔ جہاں ممکن ہو یونیورسٹیاں بھی اسی طرح کے پروگرام چلا سکتی ہیں۔ اس طرح کی ایک اسکیم گذشتہ سال دہلی یونیورسٹی نے شروع کی ہے۔ اس کے علاوہ کم سے کم بڑے شہروں میں یونیورسٹیوں اور دوسری نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ کمیٹی کے قیام پر بھی غور کیا جاسکتا ہے، انگلینڈ میں اس طرح کی کمیٹیاں بہت کامیابی سے کام کر رہی ہیں۔

شہروں میں ایک دوسرا تہذیبی ادارہ ڈرامہ کلب ہے۔ جن کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ڈراموں کی تعلیم اور خاص طور سے سماجی معاملات کی تعلیم کے ذریعے حیثیت سے بہت کم قدر کی گئی ہے۔ گو ان کی اہمیت اسی لحاظ سے سب سے زیادہ ہے۔ نوجوان کلبوں کے پروگراموں میں تہذیبی ڈرامے اسٹیج کرنا ایک اچھا پروگرام ہوسکتا ہے (مگر یہ ڈرامے صرف پروپیگنڈا کرنے والے نہیں ہونے چاہئیں) اس سے لوگوں کے لئے گھر بیٹھے ایک ستھرے مذاق کا سامان فراہم ہو جائے گا اور لوگوں میں ایک تہذیبی شعور پیدا ہوسکے گا۔

شہروں میں ریڈیو سننے والوں کے حلقے قائم کرکے بھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے، کہیں کہیں (باقی صفحہ ۲ پر)

منے ہی پھانسی لگالی اور مرگیا۔ اُن دو آدمیوں کو ڈر پیدا ہوا کہ پھانسی لگانے والے کا بھوت اسکول کا چکر لگائے گا، نچہ انہوں نے کلاس میں آنا بند کر دیا۔ اُستاد نے اُنھیں کلاس میں لانے کی بہتری کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

لٹریسی ہاؤس لکھنؤ کی خواندگی کی کلاسوں کا نقشۂ اعداد

گاؤں	سال	چھ مہینے کی مدت میں کلاسوں میں داخلے کی حیثیت: پہلا مہینہ	دوسرا مہینہ	تیسرا مہینہ	چوتھا مہینہ	پانچواں مہینہ	چھٹا مہینہ	چھوڑنے والوں کا اوسط فیصدی	
ـامدا	۱۹۵۶ء	۳۶	۳۶	۳۳	۳۷	۳۷		+	۲٫۹
ـاورا	۵۶-۵۷ء	۲۹	۲۸	۲۷	۲۱	۲۱	۲۱	−	۲۷٫۵
ـدرونا	"	۲۳	۱۹	۱۸	۲۰	۱۸	۱۸	−	۱۸٫۱
"	۱۹۵۷ء	۲۱	۲۱	۲۳	۲۵	۲۶		+	۲۳٫۹
"	۱۹۵۸ء	۱۶	۱۷	۲۳	۲۱	۲۰		+	۲۵٫۰
ـکھیر (عورتوں کیلئے)	۵۷-۵۸ء	۶	۱۴	۱۵	۱۵	۱۶	۱۶	+	۱۵۸٫۳
ـولی	۱۹۵۷ء	۲۰	۲۱	۲۱	۲۳	۲۳	۰	+	۱۵٫۰
ـسیا	۵۶-۵۷ء	۳۲	۳۳	۳۱	۳۲	۳۱	۲۷	−	۱۵٫۶
ـرورا	۵۷-۵۸ء	۱۱	۱۹	۱۹	۲۳	۲۵	۲۵	+	۱۲۷٫۰
ـوسی	۱۹۵۷ء	۳۶	۲۳	۲۵	۳۹	۳۹	۳۷	+	۲٫۹
"	۵۷-۵۸ء	۲۵	۲۶	۲۶	۲۸	۲۸	۲۵		۰٫۰
"	۱۹۵۸ء	۲۵	۲۵	۱۹	۲۰	۲۰	۰	−	۲۰٫۰
ـولی	۱۹۵۷ء	۱۹	۲۱	۲۱	۲۲	۲۰	۳۳	−	۱۲۱٫۰
ـنام پور	۱۹۵۷ء	۲۲	۱۹	۱۹	۲۲	۱۶	۱۶	−	۲۷٫۳

یہ اعداد و شمار لٹریسی ہاؤس کے حاضری کے تمام رجسٹروں کو سامنے رکھ کر جمع کئے ہیں، ان میں سے میں نے ایسے رجسٹروں خارج کر دیا تھا جو غیر معتبر تھے۔

کہا جاتا ہے کہ کمیونٹی پروجکٹوں اور دوسرے نیم سرکاری اداروں کی طرف سے جو کلاسیں چلائی جاتی ہیں، ان میں کلاس چھوڑنے والوں کا اوسط ۵۰ سے ۶۰ فیصدی تک ہوتا ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ کل ہند پیمانے پر کوئی باضابطہ جائزہ لیا گیا ہے جس سے خواندگی کی کلاس چھوڑنے والوں کی تعداد کا اوسط فیصدی معلوم ہوسکے، اگر ذیل میں میں کچھ اعداد و شمار پیش کررہا ہوں اور ان اعداد و شمار کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ کلاسیں چھوڑنے والوں کا اوسط کچھ بہت زیادہ تشویش ناک نہیں ہے بس چند ہی مثالیں ایسی ہیں جن کے حصے میں یہ "اعزاز" آتا ہے۔

ذیل کا نقشہ اعداد خواندگی کی اُن تین کلاسوں سے متعلق ہے جو یونسکو کے زیر اہتمام فنڈامنٹل ایجوکیشن کے کارکنوں کی ٹریننگ کے سنٹر کی طرف سے میسور میں چلائی گئی تھیں!

گاؤں	سال	کل مدت	تعداد داخلہ ابتدا میں	تعداد داخلہ آخر میں	چھوڑنے والوں کا اوسط فیصدی
گرگابالی (عورتوں کے لئے)	۱۹۵۵	۵ ماہ	۱۳	۶	۵۳٫۸ فیصدی
کامنا کوپل	۱۹۵۵	"	۱۸	۱۶	۱۱٫۰ "
یلول	۱۹۵۵	"	۱۱	۱۱	۰٫۰ "

اوپر کے دو گاؤں میں جو غیر حاضریاں ہوئیں، ان کے اسباب بہت دلچسپ ہیں۔ سات خواتین میں سے جو گرگابالی گاؤں کی کلاس سے غیر حاضر رہیں، ایک کی ماں کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد اس کے بچے کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہ گیا۔ دو خواتین ایک کثیر الافراد خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اس لئے چلی گئیں۔ کہ جب برسات شروع ہوئی تو انھیں بھی، کھیتوں پر کام کرنا پڑا۔ ایک نے اس لئے کلاس چھوڑ دی کہ اس کی بھاوج نے اس کے کلاس میں جاکر پڑھنے کی انتہا سے زیادہ مخالفت کی۔ ایک نے اس لئے آنا بند کردیا کہ وہ ایک گاوڈا خاندان کی تین بہوؤں میں سے ایک تھی۔ اس کا کلاس میں جانا دیکھ کر ایک بہو نے مخالفت شروع کی اور کہہ دیا "اچھا" وہ پڑھنے جاتی ہے تو جائے، ہم دروازہ بند کرکے سورہیں گے"۔ خاندان کے بزرگ نے دیکھا کہ اس راڑ سے کہیں بھائیوں میں ان بن نہ ہوجائے، اس کا کلاس میں جانا موقوف کرادیا۔ ایک اپنے بھائی کی تیمارداری کرنے کے لئے اپنے میکے چلی گئی اور ایک کی اسی زمانے میں شادی ہوگئی اور وہ اُس گاؤں ہی سے چلی گئی۔

کامنا کوپل گاؤں کی کلاس سے جو دو آدمی چلے گئے اس کا سبب یہ ہوا کہ گاؤں کے ایک آدمی نے اسکول کی عمارت کے

ہوئے کارکن جنھیں دن رات مسائل سے جو جھنا پڑتا ہے، وہ غریب تو لگے رہتے ہیں اور امید کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں "امیرانِ قافلہ" جو مسائل سے دور بیٹھے تماشا دیکھتے رہتے ہیں، ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا ہے، وہ حقیقی ہو یا خیالی وہ آناً فاناً ہمت چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اب آیئے اُن باتوں پر غور کریں جو واقعی اہمیت رکھتی ہیں اور خواندگی کی مہم کو سو فیصدی کامیاب بنانے میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ ہماری خواندگی کی تحریک کی ایک کمزوری یہ ہے کہ اسے ایک "مہم" سمجھا جاتا ہے۔ اُسے صحیح معنوں میں تحریک" کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ مہم ایک عارضی چیز ہوتی ہے۔ ایک اضطراری کوشش جس کے ذریعہ رات کی رات کامیابی حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان مہموں میں ہائی اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کو لگایا گیا ہے جن میں ہو سکتا ہے وقتی طور پر کام کا کچھ جوش ہوتا ہو۔ خواندگی کا مقصود خواندگی کے طالب علموں کو صرف حروف سے روشناس کرانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے وسیلے سے انھیں اصلاحِ نفس کا آرٹ سکھانا ہوتا ہے۔ جب مقصد یہ ہو تو ظاہر ہے استاد اور شاگرد دونوں کو صبر او شفقت سے کام لینا چاہئے۔ . . . . بلکہ یوں کہئے کہ استاد کو طالب علم سے کہیں زیادہ محنت اور صبر سے کام کرنا ہو گا مگر . . . . اس کے برعکس شاید ہوتا یہ ہے کہ مہموں میں کام کرنے والی طالب علموں کی یہ فوج خواندگی کے طالب علموں سے پہلے ہی دل چھوڑ بیٹھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مہم مہم نہیں رہ جاتی، ایک شاندار پکنک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ گر میں طالب علموں کو الزام نہیں دیتا۔ ان کی کیا خطا! انھیں تو اس کام کے لئے ان کی تعطیلات کے زمانے میں بھرتی کیا گیا تھا۔

۲۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کو چھوڑیئے، اس مستقل دستے پر نظر ڈالئے تو اس مورچے کو سر کرنے کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ میری مراد خواندگی کے مستقل استادوں سے ہے۔ ان میں بیشتر مڈل پاس ہوتے ہیں، خیر یہ بھی غنیمت ہے۔ مگر ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جو ناخواندگی کے جمائے ہوئے محاصرے کو توڑنے کے لئے صحیح معنی میں ٹریننگ پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک بھی تو نہیں۔ پھر ان میں کتنوں کو مقررہ وقت پر ان کی تنخواہیں ملتی ہیں؟ اور آگے چلئے۔ اس مورچے کو سر کرنے کے لئے گولی بارود کی ضرورت ہے۔ وہ کس حیثیت کی ہوتی ہے اور اس کی فراہمی کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ ہتھیار اور گولی بارود سے میری مراد وہ ساز و سامان ہے جو ناخواندگی کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے — پڑھنے لکھنے کا سامان، کتابیں، سلیٹ، پنسل، بلیک بورڈ اور چاک، بیٹھنے کی جگہ اور روشنی کا انتظام! کیا ہم ایسے پرائمروں کا استعمال کرتے ہیں جو بالغوں کی نفسیات کی بنیاد پر لکھے گئے ہوں، اور کامیابی کی ضمانت

اس سلسلے میں مذکورہ بالا دونوں نقشے جو کہانی پیش کرتے ہیں وہ اس کہانی سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر سنائی جاتی ہے۔ لٹریسی ہاؤس کی مذکورہ بالا ۱۴ کلاسوں میں سے صرف چھ ایسی نظر آتی ہیں جن میں اوسطاً ۲۱ء۶ فی صدی تعداد کلاس چھوڑنے والوں کی ملتی ہے۔ باقی کلاسوں میں ہمیں کمی کے بجائے اضافہ نظر آتا ہے جو اوسطاً ۵۰ء۲ فیصدی کے بقدر ہے۔

اگر کلاس چھوڑنے والوں کا اوسط ۵۰ فیصدی تک بھی ہو تو بھی تشویش کی بات نہیں ہے۔ کلاس میں اگر دس آدمی بھی آخر تک رہ جائیں تب بھی غنیمت ہے اور ہمیں چاہیے کہ انھیں کام کا خواندہ بنائیں۔ تمام ترقیاتی سرگرمیوں میں صرف خواندگی ایسی سرگرمی ہے جس کے سلسلے میں نوجوانوں کی ایک جماعت مستقل چھ مہینے تک دو گھنٹے روزانہ استاد کے ساتھ رہتی ہے۔ ترقیاتی منصوبے میں کام کرنے والے عملے کے لئے اس سے بڑھ کر سنہری موقع اور نہیں ہو سکتا۔ کہ اس مدت میں انھیں سمجھائیں بجھائیں، ان کو اپنا رازدار اور معتمد بنائیں اور اس طرح ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کو ایسا ڈھال دیں کہ وہ نئے ہندوستان کے سانچے میں بخوبی فٹ ہو سکیں۔

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ بہت بڑا مجمع اکٹھا کر کے اسے فلم دکھانے اور یہ سمجھ لینے سے کہ فلم کا بڑا حیرت ناک اثر ہوا ہے، یہ کہیں زیادہ اچھا ہے کہ چند افراد کو لے لیا جائے اور ان کے اوپر پوری توجہ صرف کی جائے۔ خواندگی کی کلاسوں کی غیر حاضریوں سے ترقیاتی کارکنوں کو پست حوصلہ اور مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ترقیاتی منصوبوں کی آخر کون سی سرگرمی ہے جس میں غیر حاضری نہیں ہوتی؟ مظاہروں کو دیکھنے بہت سے لوگ آتے ہیں، تو کیا وہ سب کے سب جاپانی طرز پر دھان کی کاشت کرنے لگتے ہیں یا سب کے سب اچھی نسل کی مرغیاں پالنے لگتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ان دیکھنے والوں میں سے معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو ان طریقوں کو سیکھ پاتے ہیں، اور ان سے بھی کم وہ لوگ ہوتے ہیں، جو ان طریقوں کو اختیار کرتے ہیں۔ کوئی سڑک بنانی ہوتی ہے، یا کوئی تالاب تعمیر کرنا ہوتا ہے یا صفائی کی مہم چلانی ہوتی ہے تو ہم لوگوں کا جلسہ بلاتے ہیں۔ جلسے میں ان کاموں میں ہاتھ بٹانے کی نہ جانے کتنے لوگ پیش کش کرتے ہیں مگر ان پیش کش کرنے والوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو دراصل ان مہموں میں شرکت کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں؟ یہ بات بہت عام ہے۔ ترقیاتی پروگراموں کے لئے ہمارے عوام میں ابھی تک کوئی جوش یا کشش نہیں ہے۔ لیکن ہم نے ان پروگراموں کو چھوڑا نہیں، انھیں برابر چلائے جا رہے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جس وقت پڑھنا لکھنا سیکھنے کے معاملے میں یہ رجحان نظر آتا ہے تو ہم حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔

بالغوں کی خواندگی کے باب میں ایک دوسری دلچسپ بات یہ نظر آتی ہے کہ اس میدان میں کام کرنے والے

ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادارے کلاسوں میں طالب علموں کی ایک خاص تعداد رکھنے پر زور دیتے ہیں بعض اس غرض سے کہ کلاس کی ابتدا کرنے کیلئے ایک خاص تعداد ضروری ہے اور بعض اس نیت سے کہ اتنے ہی طالب علم لئے جائیں جو امتحان میں پاس ہوجائیں تاکہ کلاس قائم رہے۔ اس سے نتیجہ یہ ہے کہ خواندگی کی تحریک کے بڑھنے اور پھیلنے میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ بہت سے کارکن یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "اگر ایک شخص بھی کا آدمی پڑھنا لکھنا سیکھ لے تو دوسرے اس کی اہمیت اور افادیت کو بہت جلد سمجھ لیں گے اور دل میں کہیں گے کہ اگر یہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں تو ہم بھی یقیناً یہ ہنر سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح یہ خبر ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچ جائے گی اور لوگوں کو پڑھنا لکھنا سیکھنے کی طرف مائل کرنے اور اُن کے ابتدائی پس و پیش کو دور کرنے میں وہ کام کرے گی جو لاتعداد فلم شو بھی نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم کریں کیا۔ ہمارے اوپر تو یہ پابندی ہے کہ چار پانچ اشخاص کلاس منعقد نہ کی جائے چاہے ان میں پڑھنا لکھنا سیکھنے کا کتنا ہی شوق نہ پیدا ہوگیا ہو۔ کم سے کم پندرہ بیس طالب علم ضرور ہوں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ پیسے کا جائز استعمال جو چار پانچ آدمیوں پر ہوسکتا ہے نہ کرو، چاہے وہ رقم جو بیس آدمیوں پر خرچ ہوگی، ضائع ہی ہوجائے"۔ مگر اس طرح کی پابندی ہم اپنے ترقیاتی پروگرام کی کسی اور سرگرمی پر نہیں لگاتے، بلکہ اگر ایک شخص بھی اچھی نسل کی مرغیاں پالنے لگے، بے دھوئیں کا چولہا بنانے پر آمادہ ہوجائے، زمین میں گہرائی تک سوراخ کرکے سوراخ دار پاخانہ بنانے پر راضی ہوجائے، کوڑا کرکٹ کی کھاد بنانے کے لئے گڑھا کھودنا چاہے یا جاپانی طرز پر دھان کی کاشت کرنے کی خواہش کرے، تو ہم اُسے نہ صرف اِن باتوں کی ٹریننگ دیں گے بلکہ پیسے سے اس کی مدد بھی کریں گے لیکن پڑھنے لکھنے کا ہنر سیکھنے کے لئے کلاس میں بیس آدمیوں کا ہونا شرط ہے !!

۵۔ تنظیمی نقطۂ نظر سے ایک زبردست رکاوٹ اور ہے۔ بیشتر ریاستوں میں خواندگی کی کلاس چار سے چھ مہینے تک چلائی جاتی ہیں۔ ان کلاسوں کے چلانے والوں میں سے قریب قریب سب نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اس قلیل مدت میں بس چند ہی طالب علم کارگر طریقے پر خواندہ بنتے ہیں۔ صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگ حرف پہچان لیتے ہیں، اور مختلف آوازوں کو ملا کر لفظوں کا تلفظ کرسکتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے فن کی اتنی استعداد سے ان کا کچھ بھلا نہیں ہوتا۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کے بقول یہ قلیل استعداد مفید ثابت ہونے کے بجائے مہلک ثابت ہوسکتی ہے ان کا کہنا ہے کہ "اگر لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ لیتے ہیں مگر ان میں ادبی ذوق اور قوت فیصلہ نہیں پیدا ہوتی، اگر ان میں اخبار پڑھنے اور تقریریں سننے کی عادت پیدا ہوجاتی ہے مگر اسی کے ساتھ یہ عادت نہیں پیدا ہوتی کہ وہ پڑھی ہوئی عبارت یا سنی ہوئی تقریر پر رائے زنی کرسکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہر پروپگنڈا باز لیڈر کے ہتھے چڑھ جایا کریں گے، وہ چاہے مذہبی لبادہ میں ہو، یا سیاسی یا تجارتی۔"

کرتے ہوں؟ لکھائی کا فن سکھانے پر زور دیا جاتا ہے؟ اس لئے نوسکھ بالغ کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا خط پتر اپنے آپ لکھ لیا کرے۔ ہمارے پاس کافی مقدار میں مشقی ادب موجود ہوتا ہے؟ جو دلچسپ اور آسان زبان میں ہو اور بھروسے کے ساتھ خواندگی کے بعد کی منزل میں پڑھنے کے لئے دیا جا سکے؟ کلاسوں میں جو درسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کے اسباق میں درجہ بندی ہوئی ہوتی ہے جو ذرا مشکل کام ہے؟ جس کمرے میں کلاس منعقد ہوتی ہے، وہ اتنا صاف ستھرا اور آرام دہ ہوتا ہے کہ دو گھنٹے مسلسل اس میں بیٹھا جا سکے؟ روشنی کا معقول انتظام ہوتا ہے؟ لالٹینوں کا جو انتظام ہوتا ہے ان کا اوسط نکالئے تو ۲۰ آدمیوں پر ۲ لالٹینیں آتی ہیں۔ اتنی کم روشنی میں پڑھنا لکھنا سیکھنا ممکن نہیں پھر کیا کلاسوں کو مٹی کا تیل، کتابیں اور دوسرا سامان وقت پر مل جاتا ہے؟ جواب ہے "نہیں"۔

۳۔ اب آیئے ان مہموں کے جرنیلوں اور سرداروں سے آپ کا تعارف کرائیں۔ منصوبے بنانے والے اوپر کے لوگ مثلاً بلاک ڈولیپ منٹ افسران کو لیجئے جو جرنیلوں کی صف میں سب سے اہم جرنیل ہوتے ہیں ان میں سے کسی کو بالغوں کی خواندگی کے اوپر ذرہ برابر بھی ایمان نہیں ہے۔ یہ لوگ خواندگی ضرورت بس مارے باندھے تسلیم کرتے ہیں۔ یہ تو خیر یہ ہیں، خود سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کو لیجئے۔ یہ لوگ تو محاذ جنگ کے جرنیل ہوتے ہیں، مگر ان میں بھی زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو خواندگی کا ذکر سن کر منہ بنا لیتے ہیں، ہو سکتا ہے یہ کیفیت سب جگہ نہ ہو مگر بعض ریاستوں میں تو یہ واقعہ ہے۔ ان جرنیلوں نے خواندگی کو ناکام ثابت کرنے کے لئے اپنے آپ دلیلیں گھڑ لی ہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ لوگ ناکامی کے اسباب کی کھوج لگانے کے لئے بے لاگ جائزے لیتے۔ مگر کیا کیجئے، یہ ایک دیر طلب اور مشکل کام ہے۔ قدرتی بات ہے کہ یہ لوگ سب سے آسان جو راستہ ہے وہ اختیار کرتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ "اجی جناب، لوگوں کو اس سے دلچسپی ہی نہیں ہے، آپ لاکھ جتن کر لیجئے مگر نہ وہ آتے ہیں اور نہ جم کر پڑھتے لکھتے ہیں" اور یہ اعلان کر کے اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور زبان حال سے کہتے ہیں "چلو، بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا" ملاحظہ فرمایا آپ نے، ہم ناخواندگی کے خلاف مہم تو چلاتے ہیں مگر اس مہم کی شان یہ ہے کہ مہم کے جرنیل اس کی طرف سے بدعقیدہ ہیں، جو سپاہی بھرتی ہوتے ہیں، ان کی ٹریننگ نہیں ہوئی ہوتی، تنخواہ تھوڑی ملتی ہے اور وہ وقت پر نہیں، سامان جنگ ناکافی ہوتا ہے اور وہ بھی ضرورت کے وقت محاذ پر نہیں پہنچ پاتا۔ نتیجہ ظاہر ہے، "دشمن" کی آدھی طاقت ٹوٹنے سے رہ جاتی ہے اور فوج کو تنگ کرتی رہتی ہے۔

۴۔ پھر خواندگی کی مہموں کی تنظیم کا معاملہ ہے جو جگہ جگہ سے ڈھیلا ہے خواندگی کی مہمیں دیہاتوں میں بیشتر ڈیولپ منٹ بلاکوں کے زیر اہتمام اور شہروں میں میونسپل کمیٹیوں اور رضاکار جماعتوں کی طرف سے چلائی جاتی

تجربے

شری ایس۔ رانگھون
سوشل ایجوکیشن آفیسر کیرالا اسٹیٹ

ڈنمارک میں سماجی تحفظ

(۲)

ہندوستان میں باہمی امداد کی سوسائٹیوں کے امکانات

مضمون کی پہلی قسط میں مضمون نگار نے سماجی تحفظ سے متعلق ڈنمارک کی اسکیم اور اسکے طریق کار کا تعارف پیش کیا تھا ——— زیرنظر قسط میں موصوف نے یہ بتایا ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کی اسکیموں پر عمل کرنے کے کہاں تک امکانات ہیں۔ (ایڈیٹر)

تمہید

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے اور نہایت زرّین روایات کا حامل ہے۔ گذشتہ زمانے میں ہندوستان کی دیہی برادریاں بخوبی منظم تھیں اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کی عادت ان کی زندگی کا جزو تھا۔ خاندانوں اور اشخاص کا مفاد اور ضرورتیں پورے گاؤں کا مفاد اور ضرورتیں سمجھی جاتی تھیں، اور لوگ شادی غمی، غرض ہر موقعے پر ایک دوسرے کی نقدی سے، سامان سے اور کام کرکے مدد کیا کرتے تھے۔ لیکن تاریخ کے انقلابات کے ہاتھوں اب ان برادریوں کی تنظیم ٹوٹ گئی ہے، اگرچہ دور افتادہ گاؤوں میں کہیں کہیں اب بھی اُن کے آثار دکھائی دے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آزادی اور جمہوریت کے قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنی بنیادی ضرورتوں مثلاً سماجی تحفظ کی تکمیل کے لئے بھی حکومت کا مُنہ تکتے ہیں۔ حکومت کو بھی اپنی ذمے داریوں کا پورا پورا احساس ہو چلا ہے اور اس نے ملک کے نازک اور سنجیدہ مسائل کو حل کرنے کی غرض سے بڑے بڑے پیمانے پر مختلف اسکیمیں چلا رکھی ہیں، جیسے مزدوروں کی تلافی کا قانون (ورکمین کمپن سیشن ایکٹ) ہے جس کے ذریعے ملوں اور کارخانوں کے مالک اپنے مزدوروں کو ایک خاص حد تک فائدے بہم پہنچاتے ہیں، یا جیسے ۱۹۴۸ء کا مزدوروں کے سرکاری بیمے کا قانون (ایمپلائیز اسٹیٹ انشورنس ایکٹ) ہے جس کی رو سے ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت اور حادثے کا بیمہ کیا جاتا ہے۔ یہ قانون ابھی صرف چند ریاستوں میں نافذ ہے مگر امید ہے کہ اس کا اطلاق دوسری

مگر اس کے برعکس ہم اسی مدت کے اختتام پر امتحان لیتے ہیں، طالب علموں کی ایک تعداد کے پاس ہونے کا اعلان کرتے
ہیں اور اسکے بعد نئی کلاسیں منظم کرتے ہیں. پاس ہونے والوں میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنھیں اپنی
پر اطمینان نہیں ہوتا، شوق انھیں پیدا ہو چکا ہوتا ہے اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ پھر سے نئی کلاس میں داخلہ لے کر
کو جاری رکھیں. مگر انھیں نئی کلاس میں نہیں لیا جاتا اور نہ استاد ان کی طرف کوئی توجہ دیتا ہے. اس لئے کہ وہ
یہ نئی کلاس کی تعداد میں شمار نہیں کئے جائیں گے. نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور غیر حاضری کر
یہ بھی خواندگی کے سلسلے کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ بات ہے. اگر بے دھوئیں کا چولہا بنانے کا مظاہرہ ہو
اور اس میں کوئی ایسا شخص ہو جو ایک بار یہ مظاہرہ دیکھ چکا ہو تو اس سے تو ہم نہیں کہتے کہ "دیکھو بھئی" تم یہ
یہ مظاہرہ دیکھ چکے ہو اور تمہارے گھر میں بے دھوئیں کا چولہا موجود بھی ہے اس لئے میں پھر سے تمہیں کچھ نہیں

مذکورہ بالا باتوں کے پیش نظر میں اُن حضرات سے جو ایک "نیا ہندوستان" تعمیر کرنے سے دلچسپی رکھتے ہیں
کروں گا کہ "براہ کرم ایسے بیانات کی رو میں بہہ نہ جایا کیجئے جن میں کوئی سچائی نہیں ہوتی. ہمارے ترقیاتی پروگرام
میں خواندگی کا جو مقام ہونا چاہئے اس پر پھر سے غور کیجئے، اور اس کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ ان پروگراموں کی کا
اور ناکامی کی روشنی میں کیجئے جو عوام سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور جن کا فائدہ صاف نظر نہیں آتا. آپ سے میر
ہے کہ جو کوشش آپ بزدلی کے ساتھ کرتے ہیں، اُسے ایک طاقتور تحریک کی شکل دے دیجئے، اور ایسی ٹکنیک
طریقے استعمال کیجئے جو اب پردۂ راز میں نہیں رہ گئے ہیں. ہمارے "جرنیلوں" کو چاہئے کہ وہ جو مہم چلانے کے
بھیجے جاتے ہیں، اس پر ایمان اور عقیدہ رکھیں، سپاہیوں کو اچھی تنخواہیں دیں اور انھیں وقت پر اور معقول
ہتھیار اور سامان جنگ سپلائی کریں تاکہ محاذ جنگ پر وہ بروقت کام میں لائے جاسکیں. جب یہ سب کچھ ہو جائے
مجھے قوی امید ہے کہ ہم جنگ جیت لیں گے."

(بقیہ صلا) شہر والوں کے لئے عجائب گھر اور چڑیا گھر وغیرہ دیکھنے کے لئے تعلیمی سفر کے پروگرام بھی بنائے جا

— o —

(ورکنگ پیپر میں اس کے بعد ان پروگراموں کی تنظیم پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی بنیاد پر حکومت کے سامنے کچھ
تجاویز رکھی گئی ہیں) .

جس کی رو سے سب کے لئے اپنا بیمہ کرانا ضروری قرار پائے تو اس صورت میں باہمی امداد کی سوسائٹیوں کا قیام اور عمل ممکن نہیں رہ جائے گا۔

قصباتی علاقوں میں اونچی آمدنی والے طبقوں کے لئے الگ سے اس قسم کی سوسائٹیاں بنانا مفید ہوگا۔ اس لئے کہ قصباتی آبادی کے لوگ زیادہ پریمیم بھی دے سکیں گے اور اس کے نتیجے کے طور پر انھیں فائدے بھی نسبتاً زیادہ حاصل ہوں گے۔ البتہ قلیل آمدنی والے طبقوں میں اور دیہاتی علاقوں میں پریمیم کی ایک بنیادی رقم جو کم سے کم ہو، اور اسی نسبت سے جو کم سے کم فائدہ پہنچایا جائے، اس کی مقدار مقرر کر دینا چاہیے، اگر فائدے کی اس کم سے کم مقدار میں علالت اور ایام زچگی کے فوائد ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ بڑھاپے کی پنشن صرف اُنھی مزدوروں اور اجرت پر کام کرنے والوں کے لئے محدود کی جاسکتی ہے۔ جو واقعی محنت کرتے رہے تھے، اور اب کام چھوڑ دینے کی وجہ سے ان کی آمدنی بند ہو گئی ہے۔

بیماری کی روک تھام ریاست کی ذمہ داری ہونی چاہئے۔ اور ملوں اور کارخانوں میں ان کے مالکوں کی طرف سے ایسے احتیاطی انتظامات ہونے چاہیں کہ ملوں اور کارخانوں کے ماحول سے جو بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، ان کی روک تھام ہو سکے۔ ہندوستانی مزدوروں کی آمدنی قلیل ہوتی ہے۔ اس لئے شاید یہ ممکن نہ ہو کہ وہ طبی اخراجات پیشگی ادا کریں اور اس کے بدلے میں فائدہ بعد کو اٹھائیں۔ لہٰذا یہ طریقہ زیادہ اچھا اور آسان ہوگا کہ انھیں فائدہ علاج معالجے اور دواؤں کی فراہمی کی شکل میں بہم پہنچایا جائے اور اس غرض کے لئے معقول اور منتظم شکل میں صنعتی مرکز چلائے جائیں۔ نقد رقم کی شکل میں ادائیگی صرف اسی حالت میں کی جائے جب آمدنی گھٹ جائے یا بالکل بند ہو جائے۔ ممبروں کو یا ان کے وارثوں کو بڑھاپے کی پنشن دینا سوسائٹیوں کا کام نہیں ہونا چاہئے۔ کفن دفن کے اخراجات کی کفالت ہندوستان کے لئے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے لئے بیمے کی ضرورت ہو، اس سے بہتر یہ ہوگا کہ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں موت واقع ہونے پر ایک مقررہ رقم اس مقصد کے لئے وارثوں کو ادا کر دیا کریں۔

وسائل

اس بات کو ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہئے کہ چونکہ ہندوستان کے لوگوں کی آمدنی کی سطح نیچی ہوتی ہے اس لئے چندے کی پوری پوری رقم یا اس کا ایک حصہ بھی ادا کرنا بہت مشکل ہوگا، اتنا مشکل کہ کوئی باہمی امداد کی سوسائٹی مستعدی کے ساتھ کام نہیں کر سکتی مگر اس مشکل کی وجہ سے اس تحریک کو چھوڑ نہیں دینا چاہئے بلکہ آپس میں مل کر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے اصول کی لوگوں کو تعلیم دینا چاہئے۔ اور اس درمیان میں باہمی امداد کی سوسائٹیوں کو

ریاستوں پر بھی جلد ہی ہو جائے گا۔ اس قانون میں ایسی دفعات بھی ہیں جن کی رو سے یہ فوائد مزدوروں کے دوسرے طبقات کو بھی حاصل ہو سکیں گے جو ابھی تک انھیں حاصل نہیں ہیں۔ حکومت نے اپنے پہلے پنج سالہ پلان کامیابی سے پورا کر لیا ہے اور دوسرا پنج سالہ پروگرام جاری ہے۔ اس پلان میں منصوبہ بنایا گیا ہے کہ پورے ملک میں ہسپتال، دوا خانے، اور صحتی مراکز بہت بڑی تعداد میں قائم کئے جائیں تاکہ دوائیں، علاج اور ہسپتال میں علاج کی سہولتیں عوام زیادہ سے زیادہ تعداد میں مفت مل سکیں۔

مشکلات اور ان کا حل

ہندوستان ایک بہت بڑا براعظم نما ہے جس میں بسنے والوں کی تعداد ۴۰ کروڑ ہے، لوگوں کی معاشی سطح بہت نیچی ہے جس کی وجہ سے عوام میں پیسہ خرچ کرنے کی صلاحیت محدود ہے۔ اسی طرح حکومت کے مالی ذرائع بھی ایسے نہیں ہیں جن کی تھاہ نہ ہو۔ جو کچھ ہے اُسے چھوٹی بڑی بہت سی اسکیموں پر اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ کون سا کام پہلے ہونا ہے، تقسیم کرنا ہے۔ ان حالات میں حکومت کے لئے بھی مشکل ہے کہ وہ تمام آبادی کے لئے صحتی بیمے کا انتظام کرے اور دوسرے اداروں کے لئے بھی کہ وہ صرف پریمیم سے آئی ہوئی رقم ہی کو کام میں لا کر سب لوگوں کے لئے یہ کام کر سکیں۔ مگر ایک دوسرے کی مدد کی تحریک کو مدد دینے کا اصول جسے ڈنمارک میں اتنے ہمہ گیر طریقے پر تسلیم کیا گیا ہے، اُسے ہندوستان میں بھی اختیار کیا جانا چاہیئے۔ اس اصول کی بناء پر ہندوستان میں باہمی امداد کی سوسائٹیاں بنائی جا سکتی ہیں شرط صرف یہ ہے کہ ریاست معقول طور پر ان کی امداد کرے۔ ہندوستان کی معاشی سطح بہت نیچی ہے اور آمدنی کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بہت زیادہ ناہمواری ہے، اس لئے ان سوسائٹیوں کی طرف سے پریمیم کی شکل میں جو چندہ لگایا جائے وہ ڈھلواں ہونا چاہئے یعنی جیسی آمدنی ہو اُسی کی مناسبت سے پریمیم ہو۔ ڈنمارک میں تو بیمہ افراد کا ہوتا ہے مگر ہمارے یہاں چونکہ عام طور پر خاندان کا ایک ہی آدمی کمانے والا ہوتا ہے، اس لئے بیمہ پورے خاندان کا ہونا چاہئے۔ اسکیم پہلے پہلے منتخب علاقوں میں اور آبادی کے منتخب طبقات میں چلائی جانی چاہئے اور اس کے بعد اس کا رواج بتدریج ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے عام ہونا چاہئے۔ مزدوروں کے طبقے میں جن کے لئے پہلے سے قانون بنے ہوئے ہیں، باہمی امداد کی سوسائٹیاں قائم کرنا نہ ضروری ہوگا اور نہ آسان ہی ہوگا چاہے وہ انھیں دوسرے قسم کے فائدے پہنچانے کی غرض سے ہوں یا پورے خاندان کا بیمہ کرنے کی غرض سے، البتہ جن قوانین کے ذریعے انھیں فائدے بہم پہنچتے ہیں، انھی میں مناسب ردوبدل کرنا ہوگا تاکہ اس ردوبدل سے مزدوروں کے دوسرے طبقات بھی مستفید ہو سکیں اور فوائد کی نوعیت میں بھی وسعت پیدا ہو جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی اسکیم ایسی نافذ ہو جائے

گرفت زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی رکھنا چاہئے کہ ایک دوسرے کی مدمقابل، یونینوں کے درمیان جو اس میدان میں کام کر رہی ہیں؛ باہمی امداد کی سوسائٹیاں چلانے کے معاملے میں رقابت اور نقصان دہ مقابلے کے جذبے کی کارفرمائی نہ ہو۔

دیہی علاقوں میں این۔ای۔ایس بلاکوں کے زیرِ اہتمام کسانوں اور دستکاروں کے کلب منظم کئے جا رہے ہیں اور امید ہے کہ اگلے پانچ سال میں ایسے کلب پورے ملک میں پھیل جائیں گے۔ یہ کلب کسانوں اور دستکاروں کے لئے باہمی امداد کی سوسائٹیاں شروع کرنے کے لئے بہت موزوں ثابت ہوں گے۔

حکومت ہند کی ماتحتی میں ایک سوشل ویلفیر بورڈ قائم کیا گیا ہے جس کے مالی وسائل بہت معقول ہیں اور اس کی شاخیں بھی پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک خصوصی مقصد عورتوں کی فلاح و بہبود کے وسائل فراہم کرنا ہے۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے اس لئے یہ بہت آسانی سے عورتوں کی صحت کا تحفظ کرنے کی غرض سے باہمی امداد کی سوسائٹیاں منظم کر سکتا ہے۔

موجودہ سنستھاؤں میں بہت سی مذہبی اور فرقہ وارانہ سنستھائیں بھی ملک میں قائم ہیں اور کام کر رہی ہیں لیکن انھیں باہمی امداد کی سوسائٹیاں چلانے کا مشورہ دینے میں مجھے تامل ہے، اس لئے کہ اس سے فرقہ وارانہ اختلافات میں اضافہ ہونے کا اندیشہ ہے جو قومی اتحاد کے لئے مہلک ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی قانون ایسا ہے جو کسی ادارے کو باہمی امداد کی سوسائٹیاں چلانے سے روکتا ہو۔ ایسی سوسائٹیاں الگ سے بھی بن سکتی ہیں اور ان کی رجسٹری ہو سکتی ہے اور دوسرے ادارے بھی جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اپنے ضمنی ضابطوں میں مناسب ردّ و بدل کر کے اپنی سرگرمیوں میں باہمی امداد کی سوسائٹیوں کی تنظیم شامل کر سکتے ہیں۔

متعدد سوسائٹیوں کا وفاق

باہمی امداد کی سوسائٹیاں ایسی جیسی ڈنمارک میں قائم ہیں، ہمارے ملک میں موجود نہیں ہیں۔ جب مختلف سنستھاؤں کے اہتمام میں ایسی سوسائٹیاں پورے ملک میں چلنے لگیں تو اس وقت ان کا وفاق بنانے کی بات سوچنی چاہئے۔ اس لئے کہ وفاق مختلف سوسائٹیوں کی سرگرمیوں میں باہم تال میل قائم کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔

چند دشواریاں۔ یہ ہوئے باہمی امداد کی سوسائٹیاں قائم کرنے کے امکانات۔ مگر ہندوستان جیسے طویل و عریض

چندے کی رقوم اور اس سے زیادہ دوسرے وسائل کے بل پر چلانا چاہئے۔ دوسرے وسائل کی نوعیت اور مقدار کیا ہوگی، اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ باہمی امداد کی سوسائٹی کس طبقے کے لوگوں کے لئے قائم ہوگی۔ مزدوروں اور اجرت پر کام کرنے والے لوگوں کے لئے جو سوسائٹی بنے اُسے چلانے کے لئے خود مزدوروں اور کارخانوں کے مالک اور ریاست وسائل بہم پہنچائیں، البتہ دوں اور کارخانوں میں جو حادثات پیش آئیں، ان کی تلافی خالصتہً مالکوں کی ذمہ داری ہو۔ اپنے ہاتھ سے کام کرکے کمائی کرنے والے دستکاروں، کسانوں اور دوسرے آزاد پیشہ مزدوروں کے لئے باہمی امداد کی جو سوسائٹی بنے، اس کے لئے بہت بڑی حد تک وسائل سرکار کی طرف سے آنے چاہئیں جہاں کہیں کوآپریٹو سوسائٹیوں نے یہ اسکیم چلا رکھی ہو، وہاں اس کے لئے انھیں کوآپریٹو بنکوں سے آسانی سے قرضہ مل سکتا ہے۔ چندے جمع کرنے کے لئے گھر گھر جانا ضروری ہوگا۔ اس مقصد سے مقامی ایجنٹ اور کمیٹیاں قائم کی جاسکتی ہیں جو چاہے کمیشن لے کر کام کریں یا کار ثواب سمجھ کر مفت اپنی خدمات پیش کریں۔ جس طبقے کے لئے سوسائٹی بنے اس کی نوعیت کے لحاظ سے چندے کی رقم چھوٹی چھوٹی قسطوں میں وصول کی جانی چاہئے۔ اگر ممبر ہفتہ وار یا ماہوار تنخواہ پر ملازم ہو تو جس دن تنخواہ ملے اسی دن اُس سے چندہ لے لیا جائے۔ اگر وہ کسان ہے تو فصل کٹنے پر اس سے تقاضا کیا جائے اسلئے کہ اسوقت اسکے لئے چندہ ادا کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوگا۔ چندے کی رقم مال کی شکل میں لینے کے بجائے نقدی کی صورت میں لی جائے تو زیادہ اچھا ہوگا اور سہولت بھی اسی میں رہے گی اس لئے کہ چیزوں کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوسکتا ہے اور اُسکا رہونے کی شکل میں سوسائٹی کے مالی توازن کے بگڑنے کا اندیشہ رہے گا۔

سوسائٹیاں کون چلائے؟

باہمی امداد کی یہ سوسائٹیاں اگر موجودہ منتخفائ یونین کے اہتمام میں منظم کی اور چلائی جائیں تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ اس سلسلے میں موجودہ کوآپریٹو سوسائٹیاں بہت موزوں ہوں گی، اس لئے کہ ان کا دستور پہلے ہی سے باہمت اور ایک دوسرے کی امداد کے اصول پر بنا ہوتا ہے۔ یلٹی پرپز کوآپریٹو سوسائٹیاں تو بڑی آسانی سے اپنے ضمنی ضابطوں میں تبدیلی کرکے اپنی سرگرمیوں میں صحت کے بیمے کی اسکیم کو شامل کرسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ الگ سے صحت کو اپریٹو سوسائٹیاں بنائی جاسکتی ہیں جو صرف صحت کے بیمے کا کام کریں۔

دوسرا مناسب ادارہ اس مقصد کے لئے ٹریڈ یونینیں ہیں جو اب تک تحریکیں منظم کرنے ہڑتالیں کرانے اور جھگڑے چکانے کا کام کرتی رہی ہیں۔ یہ ادارے اگر اپنے اہتمام میں باہمی امداد کی سوسائٹیاں چلائیں تو ممبروں کے اوپر انکی

سوشل ایجوکیشن کی تحریکات

آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس

جلسۂ مقالات

اس سال آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے موقعے پر جلسۂ مقالات (سمپوزیم) کے لئے عنوان رکھا گیا ہے "ذات پات کی تفریق مٹانے میں سوشل ایجوکیشن کا منصب"۔ سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں سے فرمائش کی گئی ہے کہ اگر کوئی صاحب اس عنوان پر مقالہ لکھنا چاہیں تو وہ اپنا مقالہ انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری کے پاس ۱۵ر نومبر ۱۹۵۸ء تک بھیج دیں۔

جو سنستھائیں ایسوسی ایشن کی ممبر ہیں اُن سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ کانفرنس کے لئے اپنے نمائندوں کے نام ۲۰ر نومبر تک ایسوسی ایشن کے دفتر میں بھیج دیں۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب کانفرنس میں کوئی پرستاؤ پیش کرنا چاہیں تو وہ اپنا پرستاؤ ایسوسی ایشن کے دفتر میں ۱۰ر نومبر تک بھیج دیں۔　　　　(سوشل ایجوکیشن نیوز بلیٹن)

مزدوروں کی تعلیم کے لئے کمیٹی

حکومت ہند کی فرمائش پر مزدوروں کی تعلیم کے لئے ایک آزاد کمیٹی بنی ہے۔ اس کمیٹی نے اپنی تیسری میٹنگ میں جو نئی دہلی میں ۱۱ر اگست کو ہوئی، اپنے لئے ایک دستور منظور کیا۔

اس میٹنگ میں جس کی صدارت وزیر محنت شری گلزاری لال نندا نے کی، اُس کورس پر بھی غور کیا جو مزدوروں کی تعلیم کا انتظام کرنے والے استادوں کی ٹریننگ کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ کورس بمبئی میں چل رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان استادوں میں کوئی جوش نہیں ہے اور وہ اپنے مستقبل کی طرف سے بہت فکرمند ہیں۔ میٹنگ میں بہر حال یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ مزدوروں کی تعلیم کی اسکیم میں اس وجہ سے خلل نہ پڑنا چاہیے کہ ٹریننگ پانے والے استادوں میں جوش کی کمی ہے اس کے لئے مناسب تدبیریں کی جانی چاہئیں۔

ملک میں اس طرح کی سوسائٹیوں کے قیام میں رکاوٹیں اور دشواریاں بھی بہت ہیں۔ بہت بڑی آبادی دونی رات چوگنی بڑھوتری بھی ہوتی رہتی ہے، بے روزگاری اور نیم روزگاری، مالی اعتبار سے عوام کی زبوں فرقہ وارانہ اور سیاسی اختلافات کی وجہ سے سماجی اتحاد و یک جہتی کی کمی، مخصوص طور پر دیہی علاقوں میں جہالت اور توہمات کا غلبہ، اور سب سے زیادہ خود حکومت کے محدود مالی وسائل۔ ان دشواریوں کو کامیابی کیا جاسکتا ہے اگر پورے ملک کی ترقی و تعلیم کے لئے ہمہ گیر پیمانے پر منصوبہ بندی کی جائے اور یہ کام ہمارے پنج سا کے تحت حکومت ہند کی تحریک پر ہو بھی رہا ہے۔

سوسائٹیوں کی آزادی

سوسائٹیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایسی سوسائٹیاں خود مختار اداروں کی شکل میں پروان ہیں اور ایسے وقت میں اُن کا آغاز ہوا ہے جب عوام کے سامنے اپنی شدید ضرورتوں کی تسکین کے لئے اپنے منظم ہونے کے سوا دوسرا چارۂ کار نہیں تھا۔ آگے چل کر جب سوسائٹی کا کام بڑھا اور پھیلا اور اس کے مسائل مختلف اور زیادہ اہم ہوگئے تو باہمی امداد کی تحریک کو آپ اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ناممکن ہوگیا، اور ریاست کی سہارا لینا ضروری ہوگیا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ دنیا میں ہر جگہ یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ عوام کے سماجی تحفظ کے انتظام کرنا ریاست کا ایک اہم فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں اس مقصد کے لئے بنتے ہیں اور ان کے مطابق عمل ہوتا ہے۔ ترقی کی رفتار بہرحال مختلف ملکوں میں مختلف ہوتی ہے اور یہ اختلاف مخصوص مسائل اور مالی وسائل کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ رضاکاری، باہمیت اور خود کے اصول اتنے قیمتی ہیں کہ انھیں قربان نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ اُن کی نگہداشت کی جائے پروان چڑھنے دیا جائے۔ اس لئے ایسا ناممکن نہیں ہے کہ باہمی امداد کی سوسائٹیاں موجودہ حالات میں بھی (جبکہ فلا کی اسکیمیں حکومتیں اپنے اہتمام میں چلانے کی طرف مائل ہیں) اس طرح کام کرسکتی ہیں کہ سرکاری امدادوں کے لئے بن جائیں اس لئے کہ اس طرح کے رضاکارادارے اگر ملک میں قائم ہوں اور کام کر رہے ہوں تو سرکاری اسکیم سہارا لے کر کامیاب اور پورے ملک میں پھیل سکتی ہیں۔

(کیرالہ ایجوکیشن کوارٹرلی)

مشتبہ ہوتی ہوں مگر کشش کے لحاظ سے وہ بہت کامیاب رہتی ہیں۔ تعلیمی فلموں کو اگر اپنا منصب پورا کرنا ہے تو انھیں ہر حیثیت سے اونچے معیار پر ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شریمالی نے سیمینار کا افتتاح کیا تھا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ دکھا کر تعلیم دینے والے ذرائع کے ماہرین کا کام یہی نہیں ہے کہ وہ عوام کی قومی تہذیبی میراث کا تحفظ ہی اپنے سامنے رکھیں بلکہ اس میراث میں اضافہ کرنا اور اسے تقویت پہنچانا بھی ان کا منصب ہونا چاہیے۔ لوک گیت، لوک کلا اور لوک ناچ ہمارے عوام کے ذوقِ جمال کے زندہ ثبوت ہیں اور اگر ماہرین نے ان کے تحفظ اور استحکام کی کوشش نہ کی تو اُن سے فائدہ کے بجائے قوم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

حکومت ہند کے جوائنٹ سکریٹری تعلیمات شری پریم کرپال نے اپنی تقریر میں کہا کہ "دکھا کر معلومات بہم پہنچانے والے ذریعوں میں بڑا زبردست اثر ہوتا ہے۔ اگر ان ذریعوں کا استعمال تعلیم میں سوجھ بوجھ اور پوری پرکھ کے ساتھ نہ کیا گیا تو اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ ان سے مذاق میں گراوٹ پیدا ہو جائے اور تہذیبی معیار پست ہو جائے۔"

(اسٹیٹسمین ۹ر ستمبر ۵۸ء)

دہلی ایڈمنسٹریشن کا سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ

دہلی کے محکمہ تعلیمات میں ایک سیکشن سوشل ایجوکیشن کا بھی ہے جو ۱۹۴۹ء سے دلی کے دیہی علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اُسے محکمہ تعلیم سے الگ کر لیا جائے گا اور دہلی کارپوریشن سے منسلک کر دیا جائے گا۔

حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کے ماتحت ایک "کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل" بنی ہے۔ مذکورہ بالا تجویز اسی کاؤنسل کی طرف سے وزارتِ داخلہ کو بھیجی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اس انتظام سے کام میں بہتری پیدا ہوگی۔ اخراجات میں کفایت ہوگی اور کاموں میں ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ سابقہ دہلی میونسپل کمیٹی کے ماتحت بھی سوشل ایجوکیشن کا ایک محکمہ قائم تھا جو کارپوریشن کو ترکے میں ملا ہے۔

مذکورہ بالا "کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل" میں دہلی ایڈمنسٹریشن، دہلی کارپوریشن، نیو دہلی میونسپل کمیٹی کے نمائندے شامل ہیں۔ اور حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شریمالی اس کے چیرمین ہیں۔

(اسٹیٹسمین ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۸ء)

میٹنگ میں ایک سفارش یہ بھی کی گئی کہ مزدوروں کی تعلیم پر ضروری لٹریچر تیار کرنے کی غرض سے مزدوروں کی تعلیم کا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے

(سوشل ایجوکیشن نیوز بلیٹن)

تعلیم کا انتظام رضاکار جماعتوں کے اہتمام میں

کلکتے میں ایک مذہبی اور تہذیبی انجمن بھارت سیوا سرم سنگھ ہے۔ اس انجمن کی ایک کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے حکومت ہند کے وزیر تعلیم ڈاکٹر کے ایل شریمالی نے اس بات پر زور دیا کہ رضاکار جماعتوں کو تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی دکھانی چاہیے۔

ڈاکٹر شریمالی نے فرمایا "شخصیت کی تعمیر اور نشو و نما میں خاندان، استاد، برادری اور جماعت کا بڑا اہم پارٹ ہوتا ہے اور ریاست ان سے اس منصب کو چھین نہیں سکتی ہے

ڈاکٹر شریمالی نے مزید فرمایا کہ ایک خیر اندیش ریاست (ویلفر اسٹیٹ) تعلیم کے میدان میں کتنی ہی ذمے داریاں اپنے اوپر کیوں نہ لیلے، وہ صحیح تعلیم نہیں دے سکتی اسلئے کہ ان اثرات کا جو شخصیتیں ایک دوسرے کو قبول کرتی ہیں، مگر ریاست کی، کوئی شخصیت نہیں ہوتی، اور جب شخصیت ہی نہیں تو افراد اثر کس چیز کا قبول کریں گے یہی راز ہے اس بات کا کہ تعلیم کا کام درحقیقت افراد کو اور عوام کو اپنے طور پر کرنا چاہیے۔

وزیر موصوف نے فرمایا کہ "شخصیت کی تعمیر و تشکیل ریاست کے حکم سے نہیں ہو سکتی۔ ریاست کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ جذباتی اور مثالی قسم کی تعلیم دے سکے۔ یہ ذمہ داری صرف والدین، استاد اور جماعت ہی اٹھا سکتی ہے"

(اسٹیٹسمین مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۵۸ء)

تعلیم کے لیئے اچھی فلموں کی ضرورت

دکھا سنا کر تعلیم دینے والے ذرائع کے موضوع پر یونیسکو کی طرف سے نئی دہلی میں ۸ ستمبر سے ایک سمینار ہو رہا ہے جس میں ایشیا کی اٹھارہ قوموں کے نمائندے شرکت کر رہے ہیں۔

اس سمینار کے افتتاح کے موقعے پر یونیسکو کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایچ۔ لوپر نے تعلیمی فلموں پر سخت تنقید کی۔ اور کہا کہ "تعلیمی فلموں میں عام طور پر کچا پن ہوتا ہے۔ ان کے مقابلے میں عام سماجی فلمیں ہیں جن کی اخلاقی قدریں تو مشتبہ

تعلیم یافتہ مغرب کا انصاف :- دو واقعات

گولی مار کر کالی عورت کو ہلاک کر دینے کی سزا جرمانہ
چند پیسوں کی چوری کرنے کی سزا پھانسی

(۱)

آرینج فری اسٹیٹ افریقہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک جبشن ایک گوری عورت کے گھر ملازم تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ گستاخ اور کام چور اور بے پروا تھی۔ ایک دفعہ اس نے اپنی مالکہ کا ایک پیٹی کوٹ جلا دیا تھا۔ مالکہ نے اسے کئی بار تنبیہہ کی اور مہینے پر اُسے تنخواہ دینے لگی تو ایک تہائی تنخواہ پیٹی کوٹ کے تاوان کے طور پر رکھ لی اور کہا " تم کل بھی آنا۔"

دوسرے دن جب جبشن اس کے گھر گئی تو مالکہ نے باورچی خانے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس سے کہا "میں تم کو گولی مار دوں گی۔" اور گولی چلا دی۔ گولی جبشن کے پیٹ میں لگی۔ وہ زمین پر گر پڑی اور تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی ہو گئی۔ گوری عورت کے اوپر مقدمہ چلا۔ جج نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا مقصد جان لینا نہیں تھا، بندوق محض بے پروائی میں چل گئی تھی۔ اس نے اس کو ۵۰ پونڈ جرمانہ یا ۶ مہینے کی قید کی سزا دی۔ اور یہ بھی کہا کہ " آپ کی صحت جیل میں جانے کے قابل نہیں ہے۔ جرمانہ ادا کر دیجئے۔"

(۲)

امریکہ کی ریاست الباما کے ایک مقام مانٹگومری کا ایک واقعہ ہے کہ ایک نیگرو نے ایک گوری عورت سے ایک ڈالر ۹۵ سینٹ چھین لئے۔ نیگرو کے اوپر مقدمہ چلایا گیا اور اُسے اِس جرم میں جج نے پھانسی کی سزا تجویز کی۔

اس مقدمے کی اپیل الباما کے سپریم کورٹ میں کی گئی مگر سپریم کورٹ کے فاضل جج نے سزا بحال رکھی۔

اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ الباما کے گورنر سے رحم کی بھیک مانگی جائے جسے پھانسی کی سزا کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔

(اسٹیٹسمین ۱۵ ستمبر ۵۸ء)

The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI. Registered No. D. 454.

rinter and Publisher : BARKAT ALI Firaq :Printed at Rama Krishna Printing Press Delhi.

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی (دہلی)

جلد (۹) اکتوبر ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر (۱۰)

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب، ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ جامعہ نگر (نئی دہلی)

ٹیلی فون نمبر ۴۲۴۶۱

قیمت:- سالانہ چار روپے

اشارات

گاؤں پنچایتیں اور سیاسی پارٹیاں

شری شریمن نارائن نے جو پلاننگ کمیشن کے ایک ممبر ہیں، اپنی ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ پنچایتیں، امداد باہمی کی سبھائیں اور دوسری دیہی سنستھائیں "پارٹی بازی کی لعنت" سے محفوظ رہیں۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ سے متعلق تحقیق و مطالعہ کا ایک مرکز انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے جس کی رہنمائی میں وزارت کے اونچے عہدے داروں کی تربیت کے کورس منظم کئے جاتے ہیں۔ شری شریمن نارائن اسی طرح کے ایک کورس کا افتتاح کر رہے تھے اور اسی دوران میں انہوں نے یہ تقریر کی تھی۔

دوران تقریر میں موصوف نے مزید فرمایا کہ "گرام دان تحریک، کمیونٹی پروجیکٹوں کے ماتحت جو کچھ کام ہوتا ہے اور ہوا ہے، وہ سب کا سب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اس وجہ سے کہ پنچایتوں کا چناؤ سیاسی پارٹیوں کی پارٹی بازی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ پارٹی بازی ہمارے گاؤں تک سرایت کر گئی ہے اور گاؤں کی ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے سہنے اور کام کرنے کی روح کو گھن لگا رہی ہے۔"

"ہمیں اس بات پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ آیا پارلیمانی جمہوریت میں سیاسی پارٹیوں کا جو موجودہ نظام ہے وہ واقعی ہندوستان جیسے نیم ترقی یافتہ ملکوں کو سماجی اور اقتصادی ترقی کے راستے پر لے جا سکتا ہے۔ میں کسی طرح کی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی بات نہیں سوچ رہا ہوں مگر میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمیں کوئی نہ کوئی قانون ایسا ضرور بنانا ہوگا ـــــ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر ضرورت ہو تو اس مقصد کے لئے دستور میں بھی ترمیم یا اضافہ کرنا چاہئے ـــــ جس کے اثر سے پنچایتیں، امداد باہمی کی سبھائیں اور دوسری دیہی سنستھائیں پارٹی بازی کی

ترتیبِ مضامین

اشارات

اصول اور طریقے

تعارف

چنانچہ چھوٹی بستیاں اگرچہ ترقی یافتہ، غیر ترقی یافتہ اور نیم ترقی یافتہ سب ملکوں میں ہیں مگر ان کی زندگی میں ان ملکوں کی رفتار ترقی کے لحاظ سے نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جن لوگوں نے ترقی یافتہ ملکوں میں چھوٹی بستیوں کی زندگی اور طرزِ فکر کو دیکھا اور پرکھا ہے ان کی شہادت ہے کہ ان بستیوں کا چولا تو یقیناً بدل گیا ہے مگر روح وہی ہے جو ان کو ہزاروں سال کی روایات سے ورثے میں ملتی آئی ہے۔ وہی یکجہتی، وہی اتحادِ خیال، وہی ہمسایہ پرستی، اپنی بستی کے معاملے میں اپنایت کا وہی احساس، غرض وہی سب کچھ۔ سیاسی پارٹیاں اور ان سے لگاؤ، مختلف مذہبی عقائد اور ان عقائد سے وابستگی، یہ سب باتیں، جو ابتدائی دور کی بستیوں کی زندگیوں میں نظر نہیں آتیں، موجودہ زمانے کی بستیوں میں موجود ہیں۔ مگر جہاں سماجی پہلو کا معاملہ آتا ہے، وہاں ان بستیوں کے باسی اسی طرح ایک ہیں جس طرح ابتدائی بستیوں کے لوگ ہوتے تھے۔

حالات کے اس تجزیئے کو سامنے رکھئے تو جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ چھوٹی بستیوں یا انسانوں کو کسی بستی سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ تاریخ کے محرکات کا اثر نہ قبول کرے گی، اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا ہے۔ ہندوستان کی دیہی پنچایتوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ انھیں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے نمونے پر اپنا کاروبار یا پارٹی بازی کی بنیاد پر نہ چلانا چاہیے، تاریخ کی حقیقت سے انکار کرنے کے برابر ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملک کے رہنما اور اہلِ فکر اپنے عمل سے ایک نمونہ قائم کریں اور دیہی بستیوں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے لئے اس نمونے کی تقلید نقصان دہ ہوگی۔ ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ ہو رہا ہے اور اس دعوے کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے یہی نہیں، بلکہ جیسا کہ وزیرِ اعظم نے ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے، ہمارے ملک میں پارلیمانی جمہوریت کی روایات ایک عرصے سے قائم ہیں۔ غرض پارلیمانی جمہوریت ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس کا عکس ہماری چھوٹی بستیوں کی زندگی میں نظر آنا قدرتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ ظاہر میں نظر آتا ہے، پارلیمانی جمہوریت کی مشق سے ہماری دیہی بستیوں کی اقدار و روایات کو نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ نقصان اتنا بھیانک نظر آتا ہے کہ ہمارے دلوں میں پارلیمانی جمہوریت کے بارے میں شکوک پیدا ہونے لگے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ نہ پارلیمانی جمہوریت بُری چیز ہے نہ ہماری دیہی

لعنت سے محفوظ رہیں۔ صرف پنچایتیں اور امداد باہمی کی سبھائیں اور دوسری دیہی سنستھائیں ہی نہیں خیال ہے کہ تحصیل اور ضلعے کی سطح پر جو مقامی حکومتیں ہیں، مثلاً میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ، انھیں بھی بازی کے اثرات سے پاک رہنا چاہئے۔"

شری شریمن نارائن نے اس میں شک نہیں، بڑا اہم سوال اٹھایا ہے، اور اس پر واقعی سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ مگر موصوف نے صرف سوال ہی اُٹھایا ہے، اس کے حل کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ صرف ایک شبہے کی طرف انگلی اٹھائی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہی اس اندیشہ ناک صورت حال کا ذمہ دار ہے اور وہ ہے ہندوستان جیسے نیم ترقی یافتہ ملکوں میں پارلیمانی جمہوریت کا چلن۔

دیہی بستیوں یا جدید اصلاح میں چھوٹی چھوٹی کمیونیٹیوں (اسمال کمیونی ٹیز) کی زندگی اور اس کی خ (باہمی تعاون، سماجی، اقتصادی حتیٰ کہ سیاسی مسائل میں یک جہتی اور اتحاد خیال وغیرہ) کی تاریخ پر نظ تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی یہ خصوصیتیں اُس دور کی پیداوار ہیں جب سیاسی جمہوریت کا خیال ابھی تشکیل نہیں آیا تھا، سائنس کا جنم نہیں ہوا تھا، اور دنیا انسان کے نزدیک اتنی بڑی اور وسیع تھی کہ ان بستیہ باسیوں کو اپنے آس پاس دس بیس کوس کے پرے کا بھی حال نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ریاست کے نام میں بادشاہ ہوتا تھا جس کا منصب لے دے کر ملک گیری اور بہت زیادہ ہوا تو ملک کو اندرونی فتنہ و فس بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ اُسے رعایا کی روزمرہ کی زندگی اور اس کی تنظیم سے کوئی سروکار نہ اور نہ اُس دور کے حالات اسے اس کی اجازت ہی دیتے تھے۔ اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کو خوش وخرمی سے گزارنے کے لئے لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے تھے اور زندگی کا یہ قرینہ مصلحت اندیشی سے بڑھ کر مذہب واخلاق کا جزو بن گیا تھا۔ چھوٹی بستیوں کی زندگی کا یہ ڈھرہ کسی ایک ملک نہیں تھا بلکہ مقامی حالات کے زیر اثر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہر جگہ یکساں تھا۔

مگر تاریخ کی رفتار کے ساتھ ساتھ چھوٹی بستیوں کی زندگی کے اس ڈھرے میں آہستہ آہستہ تبدیلی آ

قائم رہنی چاہیے جس کے تمام منکرین قائل ہیں، مگر اس کے لئے موصوف جو حل پیش کرتے ہیں —— پارلیمانی جمہوریت کی موزونیت میں شبہ، قانون کا سہارا یا دستور میں تبدیلی —— ہمارے خیال میں وہ درست نہیں ہے۔ شری شریمن نارائن کی بات میں وزن ہے۔ اگر وہ اس سے کام لے کر برسر اقتدار اور مخالف پارٹیوں کے لیڈروں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے دستور العمل میں چھوٹی بستیوں اور دیہی پنچایتوں کے ارکان کی سیاسی تربیت بھی شامل کریں تو پارلیمانی جمہوریت کی بدولت ان بستیوں کی زندگی کی خصوصی روایات واقدار کو جو خطرہ لاحق ہو رہا ہے، وہ دور ہو جائے گا۔ عبوری دور کا یہ بحران اور خلجان جلد ختم ہو جائے گا اور ہماری چھوٹی بستیاں اور پنچائتیں پارلیمانی جمہوریت کے سانچے میں ڈھل جانے کے باوجود اپنی زندگی کی صحت مند روایات واقدار سے محروم نہ ہوں گی۔

ضروری اطلاع

دسمبر ۱۹۵۸ء کا پرچہ اسپیشل نمبر ہوگا اس لئے نومبر ۱۹۵۸ء کا شمارہ شائع نہیں ہوگا۔

بستیوں کی اقدار و روایات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ دراصل عبوری دور کی بحرانی کیفیت ہے جو بلاشبہ بہت مخلص طبیعتوں کو پریشان کر دیتی ہے۔ اس کیفیت کو اُس مریض کی جسے ایک عرصے سے کھانے کو کچھ نہ ملا ہو اس وقت کی مثال سے سمجھنا چاہئے جب اس کا مرض جاتا رہتا ہے اور اُسے زور کی بھوک لگتی ہے۔ اس بھوک کی شدت میں وہ حلوا پوری اور دوسرے مرغن کھانے تو دور رہے، روٹی کے سوکھے ٹکڑے پر بھی بُری طرح گرتا ہے اور بغیر چبائے انہیں پیٹ میں رکھ لینا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت ایک عرصے تک رہتی ہے اور جب اسے آہستہ آہستہ کر کے پوری غذا ملنے لگتی ہے اور اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ گھر میں جو کچھ ہے، وہ اُسے بھر پیٹ ملے گا تو وہ اعتدال پر آ جاتا ہے اور کھانے پینے کی چیزوں میں اُس کے لئے ایسی کشش نہیں رہتی کہ ان کے پیچھے وہ اپنی صحت کو خطرے میں ڈال دے۔

بالکل یہی مثال موجودہ دور کے ہندوستانیوں کے اوپر صادق آتی ہے۔ وہ چاہے دیہات کی چھوٹی بستیوں سے تعلق رکھتے ہوں یا شہروں کے باشندے ہوں، پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ ہوں یا ان پڑھ اور گنوار ہوں۔ یہ لوگ ایک طویل مدت سے اقتدار کے بھوکے ہیں اور اب جبکہ پارلیمانی جمہوریت کے ماتحت یہ اقتدار حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی طرف اُن کا حریصانہ انداز میں لپکنا قدرتی بات ہے۔ اس سے ہراساں اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اتنا یقیناً ضروری ہے کہ ملک میں جن بزرگوں اور اہلِ فکر حضرات کو بیماری سے اُٹھے ہوئے اس ملک کے معالج کی حیثیت حاصل ہے وہ اس بات پر نظر رکھیں کہ اس شدت کی بھوک میں یہ اپنی صحت کو پھر سے خطرے میں نہ ڈال دے۔ پارلیمانی جمہوریت کی موزونیت اور صحت مندی پر صرف ان لوگوں کو ایمان نہیں ہے جو اس وقت اقتدار میں ہیں بلکہ اس کے اوپر ان لوگوں کو بھی ایمان ہے جو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں حزب مخالف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان مخالف پارٹیوں کے رہنما بھی ملک کو بیماری سے اُٹھا ہوا ایک صحت طلب مریض سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا بھی فرض ہے کہ چھوٹی بستیوں اور دیہی پنچایتوں کے ارکان کی سیاسی تربیت کریں، انھیں مخالفت ہی کا گُر نہ سکھائیں بلکہ یہ بھی بتائیں کہ حزب مخالف کی مخالفت میں دراصل موافقت کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ مخالفت محض مخالفت کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ برسر اقتدار پارٹی اقتدار کے اندھے پن میں ملک کو نقصان پہنچانے والی حرکتیں نہ کرنے لگے۔

شری شریمن نارائن کی تشویش بلاشبہ حق بجانب ہے اور پنچایتوں اور چھوٹی بستیوں کی زندگی کی

ان مختلف شکلوں میں کیا کیا خوبیاں یا خامیاں ہیں سیمینار کو اس مسئلے پر بحث کرنا ہے۔ یہ بحث اگر بمبئی، دہلی اور دوسرے شہروں کے تجربوں کی روشنی میں ہو تو اچھا ہوگا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان تینوں میں تیسری شکل سب سے اچھی رہے گی، اس کی موافقت میں پہلی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ شہروں اور خاص کر بڑے شہروں میں اتنے وسائل موجود ہوتے ہیں اور اتنی مختلف النوع صلاحیتوں کے لوگ رہتے ہیں کہ ان سے اچھی طرح کام لینا ایک غیر سرکاری جماعت ہی کے لئے ممکن ہے بشرطیکہ وہ جماعت مناسب اور ضروری حد تک با اختیار ہو۔ دوسرے، ہو سکتا ہے کہ شہر میں سوشل ایجوکیشن کی دوسری بہت سی سنستھائیں کام کر رہی ہوں ایسی صورت میں ضرورت صرف اس بات کی ہوگی کہ نجی سمجھوتوں کی بنیاد پر ان کے کاموں میں ربط اور تال میل پیدا کیا جائے جو اس سے اچھا ہے کہ حکومت اپنے حکم سے یہ کام انجام دے۔ تیسرے لوگوں کو شہری ذمہ داریوں کی تربیت دینے کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے معاملات کا انتظام و انصرام خود انہیں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ حکومت کے محکمے قدرتاً حکم احکام کی روایات کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور یہ طریقہ کام کی روح کو کچل دیتا ہے جو سوشل ایجوکیشن کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہئے۔

ان باتوں کی روشنی میں بہترین طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والی سنستھائیں ایک "ربط قائم رکھنے والی کاؤنسل" (کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل) سے منسلک ہوں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا یہ کاؤنسل ریاستی حکومت بنائے یا متعلقہ میونسپل کمیٹی یا کارپوریشن بنائے؟

شہری ذمہ داریوں کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے بہتر یہ ہوگا کہ کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل میونسپل کمیٹی یا کارپوریشن ہی بنائے۔ ریاستی حکومت اگر کاؤنسل بنائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ چونکہ حکومت کو کام کے خرچ کا ایک حصہ برداشت کرنا پڑے گا اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اسے کاؤنسل میں اپنی طرف سے اتنے نمائندے بھیجنے کا حق دیا جائے کہ ان کی اکثریت رہے (یہ حصہ کچھ غیر واضح سا ہے۔ ممکن ہے انگریزی کے مسودے میں کچھ غلط چھپ گیا ہو۔ ایڈیٹر) بہر حال اگر میونسپل کمیٹی ہی کو کاؤنسل بنانے کا اختیار دیا جائے تو اس کاؤنسل کی حیثیت میونسپل کمیٹی کی ایک ماتحت مجلس

نویں نیشنل سیمینار کا ورکنگ پیپر

(۲)

نویں نیشنل سیمینار کے ورکنگ پیپر کی پہلی قسط ستمبر ۱۹۵۵ء کے پرچے میں شائع ہو چکی ہے۔ قسط میں تمہید کے طور پر پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کیوں ضروری ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آیا حکومت کو یہ کام میں لینا چاہئے یا رضاکار جماعتوں کے سپرد کر انھیں سہارا دینا چاہئے۔ اس کے بعد اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن پروگرام کی کیا نوعیت ہونی چاہئے، اور کس طرح کے ادارے یہ کام انجام دیں گے۔

زیر نظر قسط میں اس پروگرام کی تنظیم، عملے کی تشریح اور مالی وسائل سے متعلق تجویزیں پیش کی گئی ہیں اور آخر میں حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں کو کچھ مشورے دئے گئے ہیں ——— ایڈ

تنظیم

شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کا کیا ڈھچر ہونا چاہئے؟

اس کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں:-

ا۔ ریاستی حکومتیں شہروں میں سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کے لئے بالکل اسی نوعیت کا ایک نظ دیہی علاقوں میں قائم ہے۔

ب۔ شہروں کی میونسپل کمیٹیاں اور کارپوریشن سوشل ایجوکیشن کے کام کی ذمہ داری لیں اور اس مق کمیٹیاں مقرر کریں۔

ج۔ ریاستی حکومتیں اس مقصد کے لئے خود مختار کاونسلیں بنائیں۔

کیسی ہے۔ کسی مقام پر خوش قسمتی سے یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں رضا کار یا تھوڑے وقت کام کرنے والے کارکن میسر آجائیں مگر نگرانوں کا جہاں تک تعلق ہے، یہ بہر حال ضروری ہے کہ کمیونٹی سنٹروں اور نوجوانوں میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے ایک ایک نگراں رہے۔

عملے کی اس فہرست میں ہم نے کتب خانوں کے ہتمموں، اڈلٹ اسکولوں کے استادوں، لیکچراروں اور دوسرے کارکنوں کو شمار نہیں کیا ہے جو سوشل ایجوکیشن کے ایک ہمہ گیر پروگرام کے لئے درکار ہوں گے اور جس کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر آئے ہیں۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ان میدانوں میں کام کرنے والی مخصوص سنستھائیں ہوں گی اور کوآرڈی نیٹنگ کاونسل کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ ان کے کاموں میں باہم ربط پیدا کر دے۔

کون سے ادارے کام کریں گے

وہ کون سے ادارے ہیں جنھیں شہروں میں سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے کے لئے اُبھارا جاسکتا ہے؟ اس باب میں سیمینار کو غور کرنا ہے کہ آیا ایسی جماعتیں جیسے یونیورسٹیاں، کالج اور ٹریڈ یونینس وغیرہ ہیں، ان سے سوشل ایجوکیشن کے کام میں کہاں تک مدد لی جاسکتی ہے۔ بعض قصبوں اور شہروں میں ہو سکتا ہے، یہ جماعتیں نہ ہوں۔ اس صورت میں کوآرڈی نیٹنگ کاونسل چاہے تو یہ خدمات خود بہم پہنچائے یا اس مقصد کے لئے کچھ مناسب سنستھاؤں کو امداد دے اور ان سے کام لے۔ ان دونوں میں کون سا طریقہ زیادہ اچھا ہوگا؟ اس کا انحصار غالباً ہر مقام کے اپنے اپنے حالات پر ہوگا۔ ایک حل شاید یہ بھی ہو کہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں یہ خدمات کوآرڈی نیٹنگ کاونسل خود بہم پہنچائے اور بڑے بڑے شہروں میں دوسری سنستھاؤں سے انھیں امداد دے کر کام لے۔

اب تو بیشتر قریب ہر ریاست نے اپنے محکمۂ تعلیمات میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ایک نائب یا مددگار ڈائرکٹر کے تقرر کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے اور بیشتر ریاستوں میں یہ افسر مقرر بھی ہو گئے ہیں۔ کوآرڈی نیٹنگ کاونسلیں اپنے کاموں کے لئے ان افسروں کے سامنے جواب دہ ہوں گی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کاونسلوں کو بالخصوص بڑے شہروں کی کاونسلوں کو

ہی کی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اسے ایک آزاد اور خود مختار جماعت ہونا چاہئے۔ یہ کیوں ؟

کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل کے کام حسب ذیل ہوسکتے ہیں :۔

(۱) مختلف ادارے جو سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں کام کرتے ہوں، ان کی سرگرمیوں میں باہم ربط پیدا کرنا آپس میں مل کر ایک عملی منصوبے اور نتیجہ خیز پروگرام کی شکل اختیار کرلیں۔

(۲) ایسے افراد و اشخاص جو اپنے شہر میں ہونے والے سوشل ایجوکیشن کے کام میں مدد دینے کے مشتاق ہوں، امداد اور بڑھاوا دینا۔

(۳) سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والے اداروں اور افراد کی لٹریچر اور ماہرانہ مشورے سے مدد کرنا۔

(۴) شہر میں سوشل ایجوکیشن کے جو پروگرام چل رہے ہوں، اگر ان میں کسی پہلو کی کمی ہو تو اس کمی کو پورا کرنے کے انتظام کرنا۔ مثلاً خواندگی کا پہلو ہے۔ اگر کسی شہر میں اس پر کام نہ ہو رہا ہو تو اسے خود چلانا۔

(۵) جن جن وسائل سے ممکن ہو، کاؤنسل کا کام چلانے کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنا۔

(۶) دوسرے شہروں میں کام کرنے والی اس طرح کی کاؤنسلوں سے ربط ضبط اور تعلقات قائم کرنا۔

کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل کا عملہ

ہر کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل کے پاس یہ عملہ ہونا چاہئے :۔

۱۔ ایک سوشل ایجوکیشن آفسر۔ یہی افسر کاؤنسل کا سکریٹری ہوگا، وہی انتظامی امور کا حاکم اعلیٰ ہوگا اور قصبے میں سوشل ایجوکیشن کا جو کچھ کام ہو رہا ہوگا اس کا ٹکنیکل ہیڈ ہوگا۔ یعنے سوشل ایجوکیشن کے فن کے بار اس کی بات مستند مانی جائے گی۔

۲۔ سوشل ایجوکیشن کے نگرانوں کی ایک معقول تعداد امکاناً ۳۰ کارکنوں پر اک نگراں۔

۳۔ نوجوان دستوں کے ٹرینڈ لیڈروں اور کمیونٹی سنٹر کے آرگنائزروں کی ایک جمیعت۔

اس فہرست کے آخر میں جس عملے کا ذکر ہے، اس کی کیا تعداد ہوگی، اس کا انحصار اس پر ہے کہ کاؤنسل کی ملا

بارے میں قانون بنانا اس لئے بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ خود حکومت اس سلسلے میں کوتاہی برتتی رہی ہے۔

موجودہ رہائشی علاقوں میں کمیونٹی سنٹر کے لئے عمارت فراہم کرنا میونسپل کمیٹیوں کی ذمّے داری ہونی چاہئے۔ البتہ ہ سنٹر کو ضروری ساز و سامان سے آراستہ کرنے پر جو خرچ آئے اُسے میونسپلٹیوں اور علاقے کے باشندوں کو مل کر نا چاہئے۔ سنٹر کو چلانے پر جو خرچ آئے، اُسے برداشت کرنے کے معاملے میں لچک رکھنی چاہئے۔ بہت زیادہ ب علاقوں کے سنٹروں کا خرچ میونسپلٹی اُٹھائے۔ مالدار اور ترقی یافتہ علاقوں کے سنٹروں کی ذمّے داری باشندوں اور اگر صورتِ حال درمیانی ہو تو اُسی اعتبار سے اس طریقۂ کار میں بھی تبدیلی کر لی جائے۔

ج۔ کمیونٹی سنٹروں کے آرگنائزروں اور نوجوانوں میں کام کرنے والے کارکنوں کی ٹریننگ کا خرچ ریاستی دں اور حکومت ہند کو مل کر اُٹھانا چاہئے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ان کارکنوں کی ٹریننگ کے لئے مستقل طور پر ایک ادارہ ہو جائے۔ ان اراکین عملہ (کمیونٹی سنٹر آرگنائزر اور نوجوانوں میں کام کرنے والے کارکن) کی تنخواہوں وغیرہ کا خرچ کم سے کم حد تک ریاستی حکومتیں اُٹھائیں اور اس حد سے آگے کا خرچ جو رہ جائے اسے پورا کرنے کے لئے سرمایہ ڈی نیٹنگ کا ونسلیں چندوں اور دوسرے وسائل سے خود حاصل کریں۔ اُس کم سے کم حد میں جس کے خرچ کی ہ داری ریاستی حکومت لے گی، کمیونٹی سنٹر آرگنائزر اور نوجوانوں میں کام کرنے والے کارکن پچاس ہزار کی آبادی سے ایک کے حساب سے ضرور ہونے چاہئیں۔

د۔ اڈلٹ اسکولوں کا خرچ اُٹھانا ریاست کے محکمۂ تعلیمات کا منصب ہونا چاہئے۔ البتہ ان اسکولوں کے ب علموں سے تھوڑی سی فیس وصول کی جا سکتی ہے۔ ان اسکولوں کے لئے جب تک وہ وقت نہ آئے کہ جب ان کی عمارتیں ہو جائیں گی، موجودہ اسکولوں کی عمارتیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ یہی طریقۂ کار شبینہ کالجوں کے لئے بھی اختیار جا سکتا ہے۔

ک۔ بے ضابطہ نصابوں کی تعلیم کمیونٹی سنٹروں میں ہونی چاہئے اور اس کا خرچ بڑی حد تک اُن لوگوں کو اٹھانا

بڑی حد تک آزادی حاصل ہونی چاہئے، اور ہم جو کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسلوں کا غیر سرکاری ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اس کی ایک وجہ دراصل یہ بھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسے معاملوں میں جیسے کام کی رپورٹ، ریاستی حکومت سے گرانٹ ملے اس کا حساب کتاب، روپے پیسے کے لین دین اور انتظامی معاملات میں باقاعدگی اور عام باضابطگی ——— ان امور میں کاؤنسلوں کو لازماً ریاست کے محکمۂ سوشل ایجوکیشن کے افسر اعلیٰ کا پابند ہونا چاہئے۔

سرمایہ

شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی ذمے داری بالکل اسی طرح حکومت کے اوپر ہونی چاہئے جیسے دیہی علاقوں میں ہے۔ لہٰذا شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کے لئے سرمائے سے متعلق الگ سے کسی اسکیم یا انتظام کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیہی علاقہ ہو یا شہری علاقہ، لوگوں سے امید یہی ہوتی ہے کہ وہ یہی نہیں کہ سوشل ایجوکیشن کی سرگرمیوں میں آگے بڑھ بڑھ کے حصہ لیں گے، بلکہ روپے پیسے سے کچھ مدد بھی کریں گے۔ خیال ہے کہ دیہاتوں کی نسبت شہروں میں چندوں سے زیادہ مقدار میں سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے۔

آیئے بہرحال یہ بھی دیکھ لیں کہ اس خاکے میں سوشل ایجوکیشن کے جن پروگراموں کا ذکر کیا گیا ہے، انھیں چلانے کے لئے سرمائے کا انتظام کس کس طرح ممکن ہے:-

ا۔ <u>کوآرڈی نیٹنگ کاؤنسل</u> چھوٹے شہروں کی کاؤنسلوں کا جملہ خرچ ریاستی حکومت کو برداشت کرنا چاہئے، البتہ ایسے شہروں میں جن کی آبادی تین لاکھ سے اوپر ہو، ان کاؤنسلوں کا خرچ شہروں کی میونسپل کمیٹیوں یا کارپوریشنوں کو اٹھانا چاہئے۔

سیمینار کو اس سلسلے میں اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا سب شہروں کے لئے ایک ہی طریقہ کار مناسب ہے یا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، مختلف شہروں کے لئے مختلف طریقہ کار ہوگا۔ اگر ہر جگہ کے لئے یکساں طریقہ کار مناسب سمجھا جائے تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ کاؤنسلوں کا خرچ ریاستی حکومتوں کو برداشت کرنا چاہئے یا میونسپل کمیٹیوں

ب۔ کمیونٹی سنٹر۔ اگر کوئی ایجنسی کوئی نیا شہر یا ہاؤسنگ کوارٹر تعمیر کرنے والی ہو تو اس کے اوپر قانوناً یہ پابندی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے نقشے میں کمیونٹی سنٹر اور کتب خانے کے لئے بھی ایک ایک عمارت کی تعمیر شامل کرے

سوشل ایجوکیشن کا نصب العین

"کمیونٹی ڈیولیپ منٹ میں سوشل ایجوکیشن" کے عنوان سے رسالہ تعلیم و ترقی میں جو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے اور شری بہرام اے۔ مہتا کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے کمیونٹی ڈیولیپ منٹ کی اسکیم میں سوشل ایجوکیشن سے متعلق جو بخشا بخشی ہے، اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کی تھی۔

زیر نظر مضمون جو ایک ڈسٹرکٹ سوشل ایجوکیشن آفیسر کا لکھا ہوا ہے، براہ راست تو اس مسئلے سے بحث۔ نہیں کرتا مگر کمیونٹی ڈیولیپ منٹ میں سوشل ایجوکیشن کا جو تصور قائم کرکے کام ہو رہا ہے، اس سے جا بجا اور واضح طور پر اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا صحیح مقام کیا ہے۔ ——— ایڈیٹر

اڈلٹ ایجوکیشن کے بطن سے سوشل ایجوکیشن نے جس وقت جنم لیا، اس وقت ہمارا ملک ایک نازک دور سے گذر رہا تھا۔ ہمارے سامنے طرح طرح کے مسائل تھے۔ نہ صرف یہ کہ جہالت ہمیں دعوت نبرد دے رہی تھی بلکہ پہلے پنجسالہ منصوبے کے تحت جو بہت تھوڑی سی کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ بھی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ قومی تعمیر کے پروگراموں میں ہمارے ملک کے رہنے والے بہت کم دلچسپی لے رہے ہیں۔ آزادی کے جھٹپٹے میں ہم نے قومی تعمیر کے لئے جو قدم اٹھایا وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ ہمارا ہر قدم تیزی سے اُٹھے۔ مگر ہم اپنے مختلف بندھنوں میں جکڑے ہوئے آہستہ ہی آہستہ چل رہے تھے۔

جہالت کی زنجیروں کو توڑنے کی آسان ترکیب ہمیشہ سے یہ سمجھی جاتی رہی ہے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ رواج

چاہئے جو ان نصابوں میں شریک ہوں۔

و۔ کتب خانے اور عجائب خانے کا قیام ریاستی حکومت کی ذمہ داری ہونی چاہئے۔

ز۔ ایسے پروگراموں کے لئے جیسے ڈراما گروپ کا قیام یا ریڈیو سننے والوں کا کلب ہے کو آرڈی نیٹنگ ک
کو چاہئے کہ وہ عطیات اور چندوں کے ذریعے سرمایہ فراہم کریں۔ البتہ ان کے لئے ساز و سامان کی فراہمی
سے سرکار سے بھی کچھ مدد لی جا سکتی ہے۔

(ح) اسی طرح "ودّیا دان سبھائیں" (علمی خیرات کی انجمنیں) قائم کرنے کے لئے ابتدا میں سرکار سے کچھ مدد لینی چا
اس سرکاری امداد سے قطع نظر ان انجمنوں کا دار و مدار در اصل عطیات اور چندوں پر ہونا چاہئے یا یوں
کہ انھیں کسی کا منہ نہ تکنا چاہئے بلکہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا چاہئے۔

حکومتِ ہند اور ریاستی حکومتوں کے لئے تجویزیں

الف

۱۔ حکومت ہند سے سفارش ہے کہ وہ ریاستی حکومتوں سے فرمائش کرے کہ وہ (ریاستی حکومتیں) اس سیمینار کی ر
کی بنیاد پر تیسرے پنج سالہ پروگرام میں شہری علاقوں کے لئے سوشل ایجوکیشن کی ایک اسکیم کو شامل کریں۔

۲۔ حکومت ہند کو چاہئے کہ وہ دوسرے پنج سالہ پروگرام کے اواخر میں شہروں میں سوشل ایجوکیشن کا کام کر
معلّموں، نوجوانوں میں کام کرنے والے کارکنوں اور کمیونٹی سنٹروں کے آرگنائزروں کی ٹریننگ کا بندوبست کر

۳۔ حکومت ہند کو نئی بستیوں میں جو اس کے انتظام میں تعمیر کی جائیں، کمیونٹی سنٹر اور کتب خانے کے لئے
ایک عمارت بنوانا چاہئے۔ اس سلسلے میں ہونا یہ چاہئے کہ ریاستی حکومتوں کے مشورے سے بھی حکومت ہند ایک
بنا دے جس کی رو سے ہر اس ایجنسی کے لئے حتیٰ کہ حکومت کے لئے بھی جو کوئی نئی بستی تعمیر کرنا چاہے، یہ فرض ہو
وہ اس بستی کے نقشے میں ۲۵ ہزار کی آبادی پر ایک ایک کے حساب سے کمیونٹی سنٹر اور کتب خانے کے لئے
ایک عمارت لازماً تعمیر کرائے گی۔

ب:۔ ۱۔ ریاستی حکومتوں کو چاہئے کہ:۔ باقی ص ۳۲ پر

ایک دوسرے مفکر ہیں ڈاکٹر رنگا ناتھن، انھیں یہ بات کچھ زیادہ نہیں جنچی۔ انہوں نے فرمایا سوشل ایجوکیشن، ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے عمل اور اس کی زندگی کے ہر پہلو کو بامقصد بنا دے گا۔

اس کی تائید سردار پانیکر نے بھی کی مگر ان کا پیرایۂ بیان ذرا مختلف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوشل ایجوکیشن کا منشا اوپر سے لے کر نیچے تک ہر سطح کے لوگوں کو ان کی ذہنی نشوونما میں مدد دینے کے علاوہ انھیں اپنے بدلے ہوئے سماجی اور اقتصادی حالات سے ہم آہنگ کرنا اور انھیں ان تمام مسائل سے باخبر کرنا ہے جو سماج کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ اس حیثیت سے سوشل ایجوکیشن کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے زندگی سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ اس کا تعلق براہ راست انسانی زندگی اور انسان کی سرگرمیوں سے ہونا چاہئے۔

سردار پانیکر کی اسی بات کو مولانا آزاد نے سارے بنی نوع انسان حتیٰ کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعلیم کہہ کر بہت ہی مختصر شکل میں پیش کیا۔

سوشل ایجوکیشن ماہرین نفسیات کی نظر میں

پھر نفسیات کے ماہرین نے اس پر اپنے نقطۂ نظر سے بحث کی۔ انہوں نے حکم لگایا کہ سوشل ایجوکیشن ایک تغیر پذیر جمہوری سماج کا مقتضا ہے۔ نہ صرف یہ کہ بدلا ہوا سماج بلکہ اس کی تغیر پذیر فطرت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ لوگوں کے ذہن کو بدلتے ہوئے سماجی ڈھانچوں سے ہم آہنگ ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس لئے ایک جمہوری سماج میں اس بات کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ اُس کے حقیقی حکمرانوں (جمہور) کو آئے دن کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ذہنی اعتبار سے برابر ہوشیار رکھا جائے۔ یہی سوشل ایجوکیشن کا خاص منصب ہے۔

اس جھگڑے کا نپٹارا کرنے کی غرض سے ہندوستان کی شاندار روایات کے عاشق ایک بزرگ نے اپنے مخصوص سنجیدہ لہجہ میں کہا کہ "ہندوستان کی روایات بہت شاندار رہی ہیں، اس کا ماضی بہت روشن تھا، اس کو کھو کر آج ہم نیچے جا گرے ہیں، مگر اپنی اس شان کو ہم خود ہی واپس بھی لا سکتے ہیں۔ سماجی تعلیم کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں

دیا جائے مگر ہماری تعلیم بجائے خود ایک مسئلہ بنی رہی ہے۔ اس نے ملک کے مسائل کو ہلکا کرنے میں اگر کچھ مد تو دوسری طرف زندگی سے دور ہونے کی وجہ سے قوم کے اوپر ایک بوجھ بھی بنی رہی ہے۔

جب صورتحال یہ ہو تو ملک آگے بڑھے کیسے؟ اور جمہوریت کے تحفظ کی ذمہ داری کون لے؟ ان سوالا آسان نہ تھا۔

سوشل ایجوکیشن ماہرین تعلیم کی نظر میں

اِنہی حالات میں قوم کے رہناؤں کی نظریں اچانک اڈلٹ ایجوکیشن کی بڑھیا کی گود میں پڑے ہوئے ؟ پر پڑیں۔ جس کی کلکاریوں میں ایک معنی اور مسکراہٹوں میں ملک کے مستقبل کی تابانی پوشیدہ تھی۔

ان ماہرین تعلیم نے اس بچے کے اقبال کو بھانپ لیا۔ انہوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق، اپنی اپنی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا۔ اُس کے نام کو لے کر تو کوئی طویل بحث نہیں چلی، مگر اُس کی زندگی کا کیا مقصد اسے کس راستے پر لگایا جائے، اِس بات کو لے کر جتنے منہ اتنی باتیں سننے میں آئیں۔

اُس کی ذہنی قوتوں کا اندازہ کرتے ہوئے ایک دانائے راز نے کہا کہ اس کی زندگی کا مقصد اس وقت ہوگا جب وہ بالغوں کی ذہنی سطح کو بلند کرنے میں کامیاب ہو۔

اُسی وقت ایک دوسرے شناسائے حقیقت نے رائے دی:-

جو چیز اُسے عدم سے وجود میں لائی ہے، اس کا پرتو بھی اس کے وجود میں منعکس ہونا چاہیئے۔ اس استفار یہ تھا کہ یہ توضیح ہے کہ سماجی تعلیم گاؤں کے لوگوں اور بستیوں کو اونچا اٹھانے اور انہیں ترقی دینے کے لئے۔ گاؤں کو اونچا اٹھانے کے لئے جب ہم نے اس کے تحت بالغوں کی تعلیم کا پروگرام شروع کیا ہے تو کیا بچوں کی تعلیم بھی اس میں شامل کر لی جائے۔

عمل ہے۔ یہ عمل مادی عناصر کو بدل کر انھیں دوسرا روپ دینے کے بجائے تجربوں کی ٹھوس بنیاد پر انسانوں کی اصلاح کرکے گاؤں کے ترقیاتی پروگراموں کے حق میں ہمیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بیان کا لب لباب یہ ہے کہ سماجی تعلیم ہمارے ترقیاتی پروگراموں کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ خیال چونکہ وقت کے تقاضوں کے حسب حال تھا اس لئے اس کو بہت تقویت اور شہرت حاصل ہوئی۔ یہ بات تو نہیں کہی جاسکتی کہ سماجی تعلیم کے باب میں یہی تعریف متفقہ اور آخری طور پر تسلیم کرلی گئی ہے مگر ہر روشن خیال نے اس کی تائید ضرور کی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو مندرجہ بالا سب تعریفیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ انھیں ایک ترتیب میں رکھ کر دیکھا جائے تو سماجی تعلیم کا نصب العین بالکل واضح ہوجائے گا۔ مگر اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ سماج میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے جو انقلابی قدم ہم نے اٹھائے ہیں، وہ اس نصب العین تک پہونچنے میں کہاں تک مدد گار ثابت ہوئے ہیں۔

سوشل ایجوکیشن عمل کی کسوٹی پر

اپنے وسیع معنوں میں سوشل ایجوکیشن خواہ کچھ ہو مگر محدود معنوں میں وہ ملک کی موجودہ ترقیاتی تحریک کے لئے زمین کو ہموار کرنے کا ایک ذریعہ ہے، جس کا استعمال ہمارے ملک میں ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت کیا جارہا ہے۔ ان پروگراموں کے ذریعہ ہم اپنے نصب العین کو کہاں تک حاصل کرسکتے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے، جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک ہمارے پروگرام اور اس کی سرگرمیوں کا تعلق ہے، ہمارا کام تعلیم و تفریح کے اور دوسرے مختلف ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان وافر مسائل کی موجودگی کے باوجود ہم زندگی کے اس مقام کو جہاں سے عمل کے چشمے پھوٹتے ہیں نہیں چھو سکے ہیں جو ہمارا اصل مقصد ہے۔

ہو سکتا کہ وہ ہمارے اخلاقی معیار کو پھر بلند کرے، لوگوں کو زندگی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرے اور ا
اور بربادی کو فروغ دینے والے عناصر کی بیخ کنی کرنے میں مدد کرے۔

اس طرح شاستروں کی دہائی دے کر سماجی تعلیم کا رشتہ ماضی سے جوڑنے کی بات ڈاکٹر تارا
ذرا کچھ دور معلوم ہوئی۔ اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سماجی تعلیم ہمارے مطالعہ کا ایک
جس کا مقصد لوگوں میں شہریت اور سماجی تنظیم کا شعور پیدا کرنا ہے، اس کے لئے انھیں سماجی حالات
ضروری ہے۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر بالغوں کی تعلیم سے ہے جس کے تین خاص پہلو ہیں۔

(۱) ان پڑھوں کو خواندہ بنانا۔

(۲) لکھنا پڑھنا سکھائے بغیر بھی غیر رسمی طریقہ تعلیم کے ذریعے ان کے اندر سماجی شعور اور بیدار

(۳) انفرادی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے شہری حقوق اور فرائض کی تعلیم کا مکمل انتظام ا

سوشل ایجوکیشن ماہرین عمرانیات کی نظر میں

علوم عمرانی کے ماہرین بھی اس کے بارے میں سوچنے اور رائے دیئے بغیر نہ رہے۔ ان کے
ترقی کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک مشینی اور مادی ترقی اور دوسرے سماجی ترقی۔ ہوتا یہ ہے کہ کبھی
ترقی بہت زیادہ ہو جاتی ہے، مگر سماجی اعتبار سے سماج کی معقول نشو و نما نہیں ہو پاتی۔ اس فرق سے
پیدا ہوتی ہے اور اخلاق میں گراوٹ آجاتی ہے۔ دراصل ایک صحت مند سماج کی تعمیر اسی وقت ممکن ہے
پہلوؤں میں ہم آہنگی ہو۔ اس نظریے کے حامیوں کے نزدیک اس غیر ہم آہنگ ترقی سے سماج میں جو
اسی کو پر کرنا سماجی تعلیم کا مقصد ہے۔

حالات کا تنقیدی جائزہ لینے والوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے پس منظر میں سماجی تعلیم کو
سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک سوشل ایجوکیشن سماجی کوششوں کے ذریعے سماج کو فروغ د

اُن کو کامل ایمان ہوتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں تہذیبی، اقتصادی، سیاسی یا سماجی غرض جو تحریک بھی اُٹھی اس میں جان اُسی وقت تک رہی ہے جب تک اُس کے پیرو ان عقیدوں پر قائم رہے۔

ہم لوگ بھی جو سوشل ایجوکیشن کے کارکن ہیں، ایک عقیدے کی بنیاد پر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر اس عقیدے کا ہمارے کارکنوں کو کتنا پاس ہونا چاہیئے۔ اس کا علم بیشتر ان کو نہیں ہوتا۔ یہاں جو لوگ صرف ملازمت کی غرض سے کام کرنے آتے ہیں وہ اس مہم کے اچھے سپاہی ہرگز ثابت نہیں ہوسکتے۔

اس بحث میں ہم اپنے ٹریننگ سنٹروں کا جائزہ لیں، جو کارکنوں کو تیار کرنے کا کام کرتے ہیں تو دماغ میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ٹریننگ سنٹر کیا فولاد بنانے والے کارخانوں سے کچھ بھی مختلف ہیں؟ جہاں ہر چیز کے لئے ایک سانچہ ہوتا ہے، پگھلا ہوا لوہا سانچے میں انڈیلا اور چیز تیار ہوگئی۔ اگر آپ فرمائیں کہ ایسا نہیں ہے تو میں کہوں گا وہاں سے علم و فن کی روشنی لے کر نکلنے والوں کا جائزہ لیجئے اور جس معیار پر پرکھ کر ان کا انتخاب کیا جاتا ہے اس پر غور کیجئے، دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے! جمہور میں جس ذہنی بیداری کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارا یہ سارا پروگرام چل رہا ہے، اُس کے بارے میں جب کبھی میں نے سوچنے کی کوشش کی ہے بیشتر یہی دیکھا ہے کہ عملاً صرف ذرو بیداری کی تبدیلی کو خیالات کی تبدیلی کا ذریعہ مان لیا گیا ہے۔ میں اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نوکری کی نیت سے کام کرنے والے کارکنوں کے وسیلے سے یہ تحریک آسانی سے عوام کی اپنی تحریک اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کارکنوں کے دل سے افسری اور ماتحتی کے امتیازات و احساسات ختم نہ ہو جائیں گے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ افسری کی خو پڑ جانے کے بعد افسری ماتحتی کے احساسات کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہ پروگرام جمہور کو بس اسی قدر چھو سکتے ہیں، جتنی ایک رحم دل بادشاہ کی عوام کو خوشحال رکھنے کی خواہش چھو پاتی ہے۔

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ جو ادارے یہ کام کرتے ہیں، ان کی طرف سے اس رویہ پر سخت نکتہ چینی ہوتی رہی ہے اور ہر بڑا افسر اپنے اور اپنے ماتحتوں کے درمیان مساوات اور بھائی چارے کا نعرہ بلند کرتا رہا ہے مگر عملی اعتبار سے شاید ہی یہ باتیں کبھی اس معیار پر پوری اترتی ہوں۔

اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو اس ناکامی کے دو خاص اسباب سمجھ میں آتے ہیں - یا تو یہ سبب ہے کہ ہم جمہور کی ضرورتوں کے مطابق نہ خود اپنے آپ کو ڈھال سکے ہیں اور نہ اپنے پروگراموں کو ان سے ہم آہنگ کر سکے ہیں۔ یا پھر یہ بات ہے کہ جمہور ہی میں اتنی اہلیت نہیں ہے کہ وہ ہمارے پروگراموں کے سانچے میں ڈھل جائیں -

میرا اصرار پہلی بات پر ہے - ہمارے خیال میں سماجی تعلیم ہمارے ملک کے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں ہے۔ ہندوستان نے معلموں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور بسا اوقات ان کے فیض سے جمہور کی زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں آئی ہیں - گوتم بدھ اور شنکر آچاریہ نے زندگی کے دھارے کو جس سمت میں موڑنا چاہا تھا وہ آج کے بدلے ہوئے زمانے میں من و عن ویسا ہی نظر نہ آتا ہو، مگر اُس کی رُوح آج بھی زندہ ہے زندگی کی وہ سمت صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی راہ سے بھٹکے ہوؤں کے لئے مشعلِ راہ کا کام کر رہی ہے -

موجودہ دور کو سب سے زیادہ گاندھی جی نے متاثر کیا ہے - گاندھی جی کے سیاسی نظریے کو رہنما بنا کر ہم نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی ہے، مگر ان کے خیالات کے تہذیبی پہلو سے تعمیر و ترقی کے راستوں کو روشن کرنے کی ضرورت آج بھی جوں کی توں باقی ہے - ہمارے ترقیاتی پروگراموں کا مقصد ہم مانتے ہیں ایک خوش حال سماج کی تشکیل کرنا ہے - مگر جمہور کو اس منزل تک پہنچانے والے جو رہنما ہیں ان کی اپنی زندگی میں گاؤں کی طرف بڑھنے کا رجحان ابھی بہت کم پایا جاتا ہے شاید نہیں کے برابر -

اپنے افکار و خیالات کے سحر سے جمہور کی زندگی کو مسحور و متاثر کرنے والے جتنے بھی اہلِ فکر و نظر رہنما ہوئے ہیں ان کا سہارا ہمیشہ ان کا اپنا عقیدہ اور ایمان رہا ہے، وہ اپنے عقیدوں پر پورا پورا بھروسہ رکھتے تھے، اور اپنے مشن کے علاوہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اور بے دریغ قربانیاں دے دے کر اپنے خیال کی تبلیغ کرتے تھے - اسی کی بدولت وہ نئی تہذیب اور نئے سماج کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوئے - اس راستے میں اگر رکاوٹیں حائل ہوتی تھیں تو ا　　کے اوپر وہ فسر لگاتے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو کوئی ان کے قریب آتا وہ اس کی رُوح میں اُتر جاتے اور اسے حرارت اور جوش سے مالا مال ایک نئی زندگی عطا کر دیتے تھے - اِس کام میں جو چیز ان کا ساتھ دیتی وہ ان کا اپنا عقیدہ تھا جس پر

اوپر اثر پڑتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی ناکامی کو تسلیم کرے تو روزی سے جائے ، اس خوف کی وجہ سے وہ کاغذ پر جھوٹی لکیریں کھینچنے اور فرضی اعداد درج کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غلامانہ ذہنیت اور خوف بھی ملازمت کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں تو ہماری تحریک کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے، اس کی کامیابی کا امکان تو بہت دور کی بات ہے!

وسائل کی کمی

اس کے علاوہ وسائل کی کمی بھی سماجی تعلیم کے اپنے نصب العین تک پہونچنے میں رکاوٹ بنتی آئی ہے۔ سماجی تعلیم کے پروگراموں کی نوعیت کو دیکھئے تو اس کے کارکن کے لئے ایک ہمہ گیر شخصیت کا حامل ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر ایسی شخصیت کے حامل افراد آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے، ظاہر ہے اس کمی کو پورا کرنے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس کام کے لئے جلد از جلد اچھے سے اچھے وسائل فراہم کر دئے جائیں۔

اس سلسلے میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کے عوام کے لئے مذہب اور روحانیت میں غیر معمولی کشش ہو، صرف وہی لیڈرشپ کامیاب ہو سکتی ہے جو عوام کی زندگی میں رس بس کر انھیں اپنے رنگ میں رنگ لینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جو لیڈرشپ ان کی اونچی روایات اور آدرشوں کا پاس نہیں رکھتی، بیشتر اُسے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے دلوں میں ان آدرشوں کی بڑی عزت ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے کارکنوں کی سیرت اور ان کا طریقہ کار ان آدرشوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پایا ہے جن کے لئے یہ ساری تحریک اٹھائی گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ سماجی تعلیم کے پروگراموں میں کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے بلکہ جو لوگ ان میں حصہ لیتے ہیں ان کو اس شرکت سے کوئی خوشی نہیں ہوتی اور نہ وہ جوش اور ولولے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

عوام کی ذہنی سطح

عوام کی ذہنی ساخت ایک بیدار مغز انسان کی ذہنی ساخت سے مختلف ہوتی ہے۔ ان میں محسوس کرنے کی قوت اگرچہ بہت ہوتی ہے تاہم عام طور پر کوئی نیا عقیدہ ان کے دلوں میں جلدی جگہ نہیں پاتا — مگر پھر بھی جو خیال یا

ہمارا منشا جمہور میں ایک اجتماعی شعور پیدا کرنا ہوتا ہے، جس کے لئے ہم مختلف اجتماعی سرگرمیاں منظم کرتے ہیں، مگر ہماری یہ خواہش بیشتر ہماری نیک نیتی پر مبنی ایک حسرت ہی ثابت ہوتی ہے۔ ڈیولپمنٹ بلاک ہماری وہ اکائی ہے، جس کو ہماری قومی زندگی کی ایک زندہ نشانی کہا جا سکتا ہے۔ مگر ابتک ہم ایسی بہت کم اکائیاں بنا سکے ہیں جہاں صحیح معنوں میں لوگوں کے اندر بھائی چارگی اور اپنایت کا جذبہ برائے نام بھی پایا جاتا ہو گا۔

ڈیولپمنٹ بلاک میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی حیثیت

ماننے کو تو یہ بات مان لی گئی ہے کہ سماجی تعلیم ہمارے پروگراموں کی بنیاد ہے۔ مگر اس تحریک کے تمام شعبوں میں سب سے زیادہ کسمپرسی کی حالت میں اسی کے کارکن ملتے ہیں۔ دوسرے شعبے جیسے زراعت، پنچایت اور صحت وغیرہ اپنے اپنے مقررہ کام ہیں، ان کے کاموں کا اپنا ایک بندھا ٹکا ڈھرّہ ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ان کے کارکنوں کی ایک خاص حیثیت ہوتی ہے۔ مگر اس تحریک میں ابھی چونکہ سماجی تعلیم کے پروگراموں کو کافی مقبولیت نہیں حاصل ہو پائی ہے اس لئے اس کے کارکنوں کی طرف سے لوگوں کے ذہنوں کا صاف نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کچھ لوگ اسے صرف کھیل تماشوں تک محدود سمجھتے ہیں، ایسی حالت میں دوسرے شعبوں کے کارکنوں کے پروگراموں سے اس کے پروگراموں کے میل کھانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پھر اس کے کاموں کی نگرانی اور رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، اس سے اس کی مصیبت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اسے ذہنی سکون ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود سنا گیا ہے کہ اس کی آزاد حیثیت بھی اب خطرے میں پڑ گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی خیریت بس اسی میں ہے کہ وہ اپنے افسر اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا رہے، اس کے بارے میں کہا تو یہ جاتا ہے کہ وہ جمہور کی شخصیت کا معمار ہے، مگر اس کی اپنی شخصیت اتنی بلند نہیں ہو پائی ہے کہ وہ دوسروں کی شخصیت کی تعمیر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جو بھی پروگرام چلاتے ہیں وہ بے جان قسم کے ڈراموں اور بے رس تفریحی مشاغل تک رہ جاتے ہیں۔

سماجی تعلیم کے کارکن کے مسائل یہیں ختم نہیں ہو جاتے۔ سوشل ایجوکیشن کے بارے میں کوئی یقینی رائے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سماجی عمل اور اس کے طریق کار کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتے، جس کا اس کے پروگراموں پر اور خود اس کے

ہیں اپنے مفروضات اور مسائل کو صاف صاف دیکھ اور پرکھ سکیں۔ ہندوستانی تہذیب نے ہمیشہ زندگی میں ایک توازن قائم رکھنے کا سبق دیا ہے، جو ہر ترقی پسند تحریک کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ اگر ہمارے ان پروگراموں میں تہذیبی تقاضوں کا لحاظ رکھنا ہے تو ہمیں سیاسی، اقتصادی اور روحانی تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی اور توازن بھی قائم کرنا چاہئے، جس کے لئے ایک خاص طرز کے ادب، تفریحی مشاغل اور ایک خاص ڈھنگ کی تبلیغ کی ضرورت ہے۔

آج جو ہم ایک کش مکش کی کیفیت میں مبتلا ہیں، اُسے ہم نے سہنے کے لئے ایک مصیبت سمجھ رکھا ہے مگر یہ کچھ بہت زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے کیونکہ تغیر انسانی شعور کی صحت کی علامت ہے۔ قدیم چیزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا اور نئی چیزوں کی تلاش و جستجو دراصل انسان کی زبردست تعمیر پسند خواہش کا اظہار ہے مگر یہی صحت مندانہ خواہش اگر صحیح راستے پر نہ ڈالی جائے تو تخریبی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے جب تک اس خواہش کی صحیح رہنمائی ہمارے پروگراموں کا مقصد نہیں بن جاتی ہے، اس وقت تک جو نتائج نکلیں گے وہ بہت اُمید افزا نہیں ہوں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے جو کمیونٹی سنٹر قائم کر رکھے ہیں ان سے سماج کی نبض شناسی نہیں ہو سکے گی۔

سماج کی تنظیم کی بنیاد دراصل افراد کی تنظیم پر رکھی جاتی ہے اور افراد کی تنظیم کا مطلب ان کی تالیف قلب کے ذرائع نکالنا ہوتا ہے، اسی شخصی تنظیم کی بنیاد پر ہم لوگوں میں تعمیری شعور کی نشوونما کر سکتے ہیں۔ تالیف قلب کے ذرائع نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انسانی فطرت کو ہر وقت دھیان میں رکھ کر ایسے پروگرام منظم کریں جن سے لوگوں کو قلبی اور ذہنی سکون حاصل ہو سکے۔

تعلیم کے سلسلے میں آج غالب رجحان یہ دکھائی دیتا ہے کہ کچھ اسکول اور تعلیم بالغان کی کلاسیں کھول دی جائیں اور اعداد و شمار کے ذریعہ اپنی تمام کوششوں کی کامیابی کا ثبوت فراہم کر دیا جائے۔ مگر اس طرح کی سطحی تنظیموں سے زندگی میں کسی طرح کی تبدیلی پیدا ہو سکے گی، اس میں مجھے شک ہے۔ کیونکہ اس نہج پر ہم ترقیاتی اور تعمیری پروگراموں کو بھی چلا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے نہ تو کوئی واضح مقصد ہے اور نہ مستقبل کا کوئی واضح تصور۔ ہم یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ہمارے آج کے نظام تعلیم میں بہت سی خامیاں ہیں۔ سماجی تعلیم کے پروگراموں کے تحت اس میں کسی بنیادی اصلاح کی

بات ان کے سامنے رکھی جاتی ہے اُس کی آواز بازگشت ہے۔ اُن کے کانوں میں گونج ضرور ہے۔ اب اگر اس گونج کو بدستور قائم رکھنا ہو تو ضروری ہوتا ہے کہ اُس تار کو بار بار چھیڑا جائے تاکہ اس میں ایک تسلسل قائم ہو جائے، ورنہ یہ جھنکار تھوڑی دیر تک سنائی دینے کے بعد آہستہ آہستہ ڈوب جائے گی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو عوام کے لئے جو پروگرام بنائے جائیں ان میں استحکام اور تسلسل کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے پروگراموں میں آج جدید طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے، مگر اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ہم عوام کے ذہنوں میں تحریک پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

آج کا زمانہ سیاسی اعتبار سے جمہوریت کا اور تہذیبی اعتبار سے عوامی تہذیب کا دور ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ عالمگیر اخوت کے آدرش کو لے کر ہمارا ملک بہت آگے بڑھ رہا ہے، مگر صرف سیاسی اور اقتصادی تحریکوں کے بل بوتے پر ایک نئی زندگی کی تعمیر کی جا سکے گی اس میں مجھے شک ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ سیاسی اور اقتصادی تحریکوں کے دوش بدوش ایک ہمہ گیر تہذیبی تحریک بھی چلائی جائے تاکہ عوام کو اس عبوری دور کی مصیبتوں سے نجات مل سکے۔

ہم جن مصیبتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک دن دو دن یا سال دو سال کی مصیبتیں نہیں ہیں، انکی جڑیں ایک طویل ماضی تک پہنچی ہوئی ہیں جو اپنے سینے میں ہزارہا سال کے عروج و زوال کی کہانی چھپائے ہوئے آج بھی ہماری زندگی پر اثر انداز ہے۔ ان مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے حال اور ماضی دونوں کی روشنی میں اپنے مستقبل کے لئے راہیں متعین کرنی ہوں گی، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ایک ہمہ گیر تہذیبی تحریک شروع کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ جو پروگرام ہم نے بنائے ہیں، اُن میں تہذیبی پہلو پر خاص توجہ دی گئی ہے اور ہم چاہتے بھی یہی ہیں کہ جمہور کے دلوں میں اُتر کر انسانی تہذیب کو چمکائیں۔ مگر عملی اعتبار سے دیکھئے تو ہمارے پروگرام ہماری تہذیب کی بنیادی قدروں سے کوئی وابستگی نہیں رکھتے۔ ہمارے پروگرام یا تو بالکل جدید ڈھنگ کے ہوتے ہیں، یا پھر بالکل ہی فرسودہ طرز کے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پروگراموں میں نئی اور پرانی طرزوں کا اس طرح کا میل ہو جیسے دودھ اور شکر کا میل ہوتا ہے، جس میں ماضی اور حال کے پس منظر میں ہمارے مستقبل کے مسائل سلجھتے نظر آئیں۔ ابھی ہمارے پروگراموں میں اتنی تاثیر اور وسعت نہیں پیدا ہو سکی ہے کہ لوگ آسانی سے ان کے آئینے

ہیں، ان کے اوپر منحصر ہے، وہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ ہمارے عوام ابھی ان منصوبوں کا بار اٹھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہو سکے ہیں۔ جہاں تک عوام کو ذہنی طور پر تیار کرنے کا تعلق ہے اس کی رفتار ڈیولپمنٹ کے دوسرے کاموں کے مقابلے میں بہت سست رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں خود کارکنوں میں بھی اس کا احساس بہت کم رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم عوام کے تعاون کی امید ہی لگائے بیٹھے رہے اور دوسری طرف سارے کام گڈمڈ ہو گئے پھر یہ تحریک عوام کے دلوں سے اپنا رشتہ بھی نہیں قائم کر سکی نتیجہ یہ ہے کہ عوام کی زندگی میں کوئی تنظیم نہیں پیدا ہوئی جو کچھ سطحی تنظیم کی گئی ہے اس میں بھی عوام کا تعاون بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

سماجی تعلیم ہمارے سامنے اس تصور کے ساتھ آئی تھی کہ اس کے ذریعہ لوگوں کی سیرت و شخصیت کی صحت مندانہ تعمیر کی جاسکے گی، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات ابھی ہمارے منصوبوں کی بنیاد نہیں بن پائی ہے، اتنا ہی نہیں کہ یہ تصور ان منصوبوں کی بنیاد نہیں بن پایا بلکہ ان کے ماتحت جو دوسرے کام ہوتے ہیں سماجی تعلیم ان کی طفیلی بن کر رہ گئی ہے اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان جو ہوا ہے یہ ہے کہ ڈیولپمنٹ بلاکوں میں جو کام ہو رہے ہیں وہ کسی ذہنی بیداری کا وسیلہ بن کر صرف باہری لیپ پوت کا آلہ کار بن کر رہ گئے ہیں اور سماجی تعلیم کی حیثیت ان کے پروپگنڈا ایجنٹ کی ہوگئی ہے۔

کوئی پروگرام ہو اس سے متعلق اس قسم کے شکوک و شبہات کو اس وقت رفع کیا جا سکتا ہے، جب اسے ہوشیاری سے چلایا جائے، مگر اس کو کیا کیجئے کہ جو سرگرمیاں ہم ان ہمہ گیر پروگراموں کے ماتحت منظم کرتے ہیں، ان میں روح اور جسم دونوں کی ترقی میں امتزاج نہیں پایا جاتا۔

سطور بالا میں میں نے اسی امتزاج کو تہذیبی توازن کے نام سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جس میں میرے نزدیک ہمارے مذہب، روایات، رسم و رواج اور کام کاج سے لے کر سماجی قدریں اور اعتقادات غرض تمام چیزیں آجاتی ہیں اس تہذیبی توازن میں سیاسیات، مذہب، معیشت، غرض کسی ایک پہلو میں زور نہیں ہوتا۔ بلکہ سب کے میل سے ترقی کا ایک متوازن پروگرام بن جاتا ہے جس کی تبلیغ گوتم بدھ نے بڑے اچھے ڈھنگ سے کی تھی۔

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

کوشش نہیں کرنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے اندران تعمیری پروگراموں کو اپنی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کا حوصلہ بہت کم پیدا ہوا ہے، اور ہمارا یہ سارا کام محض کام کرنے کے لئے چل رہا ہے، اس کے پیچھے زندگی کی ہمت کمی ہے، جس کے بغیر ان انقلابی تحریکوں کی کامیابی ہمیشہ مشکوک رہے گی۔

سماجی تعلیم کا مقصد اجتماعی کردار کو اُبھارنا ہے یا انفرادی کردار کو؟

سماجی تعلیم کی تعریف بیان کرتے وقت اجتماعی سرگرمیوں کے ذریعہ سماج کی نشو ونما کی بات کہی جاتی۔ اس بنیاد پر بہت سے اجتماعی پروگرام بھی بنائے جاتے ہیں اور ہمارا سارا پروگرام اسی کو بنیادی فلسفہ تسلیم کر چل بھی رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ افراد اور سماج لازم و ملزوم چیزیں ہیں اور اس اعتبار سے کسی پروگرام کے تحت ایک پہلو (سماج) پر توجہ دینا اور دوسرے کو نظرانداز کر دینا ٹھیک نہیں ہے اس سے سماجی تعلیم کے عمل پروگرام کے ذریعہ سماجی کردار تو ابھر سکتا ہے مگر افراد کی نشو ونما رک جائے گی۔

پورے سماج کے اخلاق کو بلند کرنا ملک کے سامنے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے چنانچہ اسے حل کے لئے لوگوں میں اجتماعی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے افراد اور سماج دونوں کے کردار کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا تعمیر و ترقی کا پروگرام بہت محدود پیمانے پر ہو رہا ہے، اس میں اپنے اندر زندگی کی ہمہ گیری اور سمو لینے کی قوت نہیں ہے، پھر اس تحریک میں سرکار کا عمل دخل ہونے کی وجہ سے لوگوں میں اس بات کا بہت کم ہے کہ یہ ان کی اپنی ہی تحریک ہے۔

سماجی تعلیم۔ ذہن اور جذبات کی تربیت کا ایک ذریعہ۔

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری ترقی اور خوش حالی، ہمارے منصوبوں کے ماتحت جو تعمیر کے کام

قابلِ کاشت زمین کے رقبے میں اضافہ ہو جائے یا پھر جتنی زمین موجود ہے، اُسی میں فنِ زراعت کے اچھے بیجوں اور طریقے اختیار کئے جائیں کہ اُن سے فی بیگھہ پیداوار بڑھ جائے۔ پہلی بات تو ممکن نہیں ہے زمین جتنی زیرِ کاشت ہے اس میں بس تھوڑی سی بہت بڑھوتری ہو سکتی ہے۔ البتہ دوسری بات ممکن ہے۔ پیداوار کے اوسط میں زراعت کے نئے طریقوں کو اختیار کرنے سے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں خریف تحریک کے دوران میں محکمے نے بڑی سرگرمی سے کام کیا تھا اور ربیع تحریک کی تیاری میں تو وہ جی جان سے لگ گیا ہے۔ نئے طریقوں سے کھیتی کرنے کی تبلیغ میں گاؤں گاؤں کام ہو رہا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ ربیع کی بوائی سے پہلے پہلے تبلیغ کا اتنا کام ہو جائے کہ ہر شخص کے کان میں یہ بات پہنچ جائے۔ چنانچہ کسانوں کے کیمپ منظّم کئے جا رہے ہیں، بات چیت کی مجلسیں منعقد ہو رہی ہیں۔ غرض ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے جس سے نئے طریقے کی کھیتی کا چرچا گھر گھر ہو جائے۔

اس سلسلے میں یہ بھی سوچا گیا ہے کہ اس کام میں ہر شخص حصّہ لے اس لئے کہ سرکاری کارکن اتنی تعداد میں میسر نہیں آ سکتے کہ وہ ایک ایک فرد سے مل سکیں۔ چنانچہ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لئے ہر گاؤں میں "مددگاروں" (گرام سہایکوں) کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہر گاؤں سے ایسے پانچ اشخاص چُنے گئے ہیں جو خود بھی سمجھدار ہوں اور اتنی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کہ بات کو سمجھ کر دوسروں تک پہنچا سکیں۔ ان "مددگاروں" کی تربیت کے لئے ٹریننگ کیمپ منظّم کئے گئے ہیں اور اُن سے یہ اُمید کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر "مددگار" کم سے کم دس اشخاص کو اچھی کھیتی کرنے پر آمادہ کرے گا۔

تحریک میں عورتوں اور بچّوں کا حصّہ

اس تبلیغ کے سلسلے میں یہ بھی سوچا گیا ہے کہ گاؤں کے "مددگار" تو یہ کام کریں گے ہی، ان کے علاوہ اور کون سے ذریعے ممکن ہیں جن سے تبلیغ کے کام میں مدد لی جا سکتی ہے۔ طے یہ کیا گیا ہے کہ نوجوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ تو کام کریں گے ہی، مگر جب تک عورتیں اور بچے بھی اس میں حصّہ نہ لیں، اس پروگرام کو تحریک کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ عورتوں اور بچّوں کو اس پروگرام میں کس طرح شریک کیا جائے؟ ڈیولپمنٹ کے دوسرے بلاکوں کا تو مجھے علم نہیں ہے مگر جس بلاک میں، جہاں میں کام کرتا ہوں، میں نے تمام استادوں کے جلسے منعقد کئے ہیں اور ہم سب نے مل کر بچّوں کے لئے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے اوپر تھوڑا بہت عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔

ہم نے جو پروگرام بنایا ہے اس کے مطابق بچّے ربیع تحریک میں تین موقعوں پر کسانوں کی مدد کریں گے (تبلیغ اور پرچار کے موقعے پر، بوائی کے وقت اور کٹائی کے موقعے پر) یہ پروگرام تو ہم نے سوچ لیا مگر پھر یہ سوال سامنے آیا کہ پرچار کے موقعے پر بچّے کس طرح ہاتھ بٹائیں گے؟ اُن کی بات کون سُنے گا؟ اس صورت میں ظاہر ہے کہ پروگرام ایسا ہونا

ربیع تحریک میں اسکولوں کے بچوں کا اشتراک

ایم۔ ایس۔ مشہور
اسسٹنٹ ڈیولپمنٹ آفیسر بلند شہر

ربیع تحریک کیا ہے؟

یہ بڑے افسوس کی بات ہے اور جسے زبان پر لاتے ہوئے تکلف ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جس کی ۸۰ فیصدی آبادی گاؤں میں بستی ہے غلے کی اسقدر کمی ہے۔ ملک کے دوسرے کم زرخیز حصوں میں یہ کمی ہوتی تو خیر اتنا تعجب نہ ہوتا مگر خاص یو پی میں جسے ہندوستان کا دل کہا جاتا ہے اس سال اناج کی اتنی کمی ہو گئی ہے اور غلے کا بھاؤ اس حد تک چڑھ گیا ہے کہ اوسط طبقے کے لوگ بھی اپنے لئے اچھا غلہ خریدنے کی ہمت نہیں پاتے۔

غلے کی اس کمی کی وجہ سے جو مشکل مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اُسے دیکھ کر یو۔ پی کے ڈیولپمنٹ کمشنر صاحب نے بڑی دانائی کے ساتھ خریف تحریک چلائی تھی مگر قدرت اور انسان کی اس جنگ میں انسان کو حسب دلخواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی ضرورت سے زیادہ بارش اور سیلاب کے طوفان کے ہاتھوں فصل کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ مگر ہمت ہار کر بیٹھ رہنے سے تو کام نہیں چلتا! امید کے سہارے دنیا کا سارا نظام قائم ہے چنانچہ حکومت یو۔ پی نے اب "ربیع تحریک" چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مرتبہ تحریک کی منصوبہ بندی پہلے سے زیادہ مکمل کی گئی ہے اور کام بھی زیادہ زور شور سے ہو رہا ہے۔ مگر اُدھر قدرت نے بھی اپنی "بارش کی تحریک" شروع کر رکھی ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے ربیع کی فصل کی طرف سے بھی مایوسی ہونے لگی ہے۔ لیکن ہمارا کام تو اپنی سی کوشش کرتے رہنا ہے۔ ہو سکتا ہے محنت کا پھل میٹھا ملے

حکومت ہند نے بھی حالات کے تیور دیکھ کر اس تحریک کو اپنا لیا ہے۔ اور آج ملک کے کونے کونے میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ "پیداوار بڑھاؤ" ہندوستان کا ہر فرد جسے کھیتی باڑی کے کام سے دلچسپی اور تعلق ہے۔ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اپنی زمین سے زیادہ پیداوار کس طرح حاصل کرے۔ پنڈت نہرو نے پارلیمنٹ میں ممبروں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ انتخاب میں پہنچ کر ربیع تحریک کو تقویت پہنچائیں۔ اُدھر راشٹرپتی نے بھی کسانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی پیداوار میں اضافہ کریں ملک کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس روز افزوں آبادی کا پیٹ بھرنے کے لئے غلہ اسی وقت میسر آسکتا ہے جب

بعد اس زمین کی نرائی، گڑائی کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر وہ تحریک میں شریک ہو سکتی ہیں۔ اس باب میں خواتین کے سیکشن کی اسسٹنٹ ڈیولپمنٹ افسر سے (جو سماج شکشا کے لئے مقرر ہیں) بہت زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

بچوں کے تعاون کا تیسرا موقع کٹائی کے وقت آئے گا۔ ہماری تحریک میں پیورٹی یک یعنی آپ شدھار ہفتہ "(تزکیۂ نفس) کا بھی ایک پروگرام ہے۔ اس موقع پر بچوں کی ٹولیاں بنوا کر گیہوں کی بالیں بڑی آسانی سے جمع کی جا سکتی ہیں (اور اس طرح جو غلہ مہیا ہو اُسے خدمت خلق کے کام میں لایا جا سکتا ہے) اگر اسکولوں کے ڈپٹی انسپکٹر صاحب اس پروگرام کو مناسب خیال فرمائیں تو ہماری تجویز ہے کہ وہ تمام استادوں کو اس پروگرام کو چلانے کی ہدایت فرما دیں تاکہ پورے ضلع میں یہ کام ہو سکے اگر ضرورت ہو تو اس پروگرام میں توسیع بھی کی جا سکتی ہے۔

میں نے بہر حال اپنی محدود صلاحیت اور تجربے کی بنیاد پر یہ ایک پروگرام بنایا ہے۔ اگر کوئی ساتھی اور کوئی تجویز اس سلسلے میں پیش کریں تو وہ سب کے لئے فائدہ مند ہو گی۔

صفحہ ۲۷ کا بقیہ

——— اور یہی وہ راستہ ہے جسے اختیار کر کے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، یہ راستہ نہ صرف ہماری اس تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے بلکہ وقت کے تقاضے پر بھی پورا اترتا ہے۔

چاہیئے کہ شخص مجبور ہو کر ان کی بات سنے۔ غرض یہ سوچ کر ہم نے طے کیا کہ ہفتے میں کم سے کم ایک دن صبح کو پربھات پھیری ہو جس میں کھیتی اور زیادہ پیداوار کے موضوع پر بچے گیت گاتے ہوئے نکلیں دوپہر کے وقت یا شام کو جب کسان اپنے کھیتوں سے گھر کو آ جائیں تو بچوں کے جلوس نکلیں اس جلوس میں آگے آگے "اچھی کھیتی اور ٹھیک اناج" کا جھنڈا ہو۔ اور بچے اس تحریک سے متعلق خوب زور سے نعرے لگاتے چلیں۔ نعروں کے بیچ بیچ میں گیت بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ پھر استاد حضرات بچوں سے ایسے ناٹک اور مکالمے کرا سکتے ہیں جن سے اچھی کھیتی اور پیداوار بڑھانے کی لوگوں کو ترغیب ہو اور یہ ڈرامے اور مکالمے مناسب وقفوں سے گاؤں میں اسٹیج کرائے جائیں۔ اتوار کے دن بچوں کی چھٹی ہو جاتی ہے۔ اس دن بچے اپنا جلوس لیکر کھیتوں پر بھی جاسکتے

یہ تو ہوا بچوں کا تعاون تحریک کی ابتدائی منزل میں جب تبلیغ اور پرچار کا کام ہوگا۔ اب رہا دوسرے مرحلے پر ان کے تعاون کا مسئلہ یعنی اس وقت جب بوائی شروع ہوگی۔ اس موقعے کے لئے جو پروگرام ہے اس میں ذرا زیادہ محنت کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو کسانوں کے ذہن نشین کرنی ہوگی وہ یہ ہے کہ بچے اس وقت بیگار نہیں بلکہ قوم کی سیوا کرتے ہوں گے۔ اس پروگرام کی تفصیل یہ ہے کہ ہر "مددگار" (گرام سہایک) گیہوں کے لئے کم سے کم ایک بیگھہ زمین ایسی تیار جس میں ڈبلر کے ذریعے بیج بوئے جائیں گے اس زمین کے لئے "مددگار" عمدہ اور ترقی یافتہ بیج کا استعمال کرے گا۔ اس کی بیوی بیج کے ڈھیر میں سے ایک ایک کرکے سوا سیر بیج الگ کرے گی۔ اب جب چنی ہوئی زمین میں بوائی کا وقت آئے گا تو اسکولوں کے جو پہلے سے پانچ گرام سہایکوں میں بٹے ہوں گے، ڈبلر کے سوراخوں میں ایک ایک دانہ ڈالیں گے۔ مگر کام شروع کرنے سے پہلے استادوں کو بچوں کو بھلی بھانت سمجھا دینا ہوگا کہ وہ بیج کا بیجا استعمال نہیں کریں گے جس سے بیج کے ضائع ہونیکا اندیشہ

دیکھنے میں تو اس ترکیب سے گاؤں میں صرف پانچ بیگھہ زمین ڈبلر کے ذریعہ بوئی جائے گی مگر حساب لگائیے تو معلوم ہوگا کہ ڈبلر کے ذریعے بوائی کرنے سے فی بیگھہ چھ سیر گیہوں کی بچت ہوگی اس طرح ہر گاؤں میں ۳۰ سیر گیہوں حاصل ہوگا۔ ہمارے بلاک میں ۱۲۵ گاؤں ہیں۔ ۳۰ سیر گیہوں کو ۱۲۵ سے ضرب دیجئے تو معلوم ہوگا کہ پورے بلاک میں اس ترکیب سے ۹۴ من کی بچت ہوئی اور اگر اسی پالیسی پر پورے ملک میں کام ہوا تو ملک میں صرف اس ایک ترکیب سے ۲۵ ہزار پانچ سو من کے قریب گیہوں کھانے کے لئے بچ جائے گا۔

بوائی میں مدد دے کر صرف بچے ملک کی اتنی بڑی خدمت کر سکتے ہیں اس کا اندازہ پہلے مجھے بھی نہیں تھا یہ ہر گاؤں میں پانچ بیگھہ زمین کی ڈبلر بوائی سے بچت ہوئی۔ لوگوں میں جوش ہو تو ہر گاؤں میں اس سے زیادہ زمین میں اسی طرح بوائی ہو سکتی ہے۔ اور اس سے کئی گنا غلہ کھانے کے لئے بچ سکتا ہے۔

بچوں کے اس تعاون کے بعد اب عورتوں کی باری آتی ہے۔ ڈبلر کی بوائی کے لئے وہ بیج کی چھنائی تو کریں گی ہی اس

سوشل ایجوکیشن

December
1958

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی

The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI Registered No. D. 454.

Printer and Publisher : BARKAT ALI Firaq Printed at Rama Krishna Printing Press, DELH

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

جلد ۹ دسمبر ۱۹۵۸ء شمارہ ۱۲

خاص نمبر

شہروں میں سوشل ایجوکیشن

بانی: شفیق الرحمان قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب ڈائرکٹر

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ، جامعہ نگر نئی دہلی

ٹیلیفون: ۴۲۲۶۱

قیمت: سالانہ چار روپے فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے اس نمبر کی قیمت: ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

ترتیب

اشارات

اطلاع

جو حضرات دسمبر ۱۹۵۸ء سے رسالے کے خریدار بنیں گے ان کی
خدمت میں یہ خاص نمبر مفت ارسال کیا جائے گا۔ منیجر

अखिल भारत प्रौढ़ शिक्षा सम्मेलन के १५ वें अधिवेशन के अध्यक्ष

آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے پندرھویں اجلاس کے صدر



प्रो० मोहम्मद मुजीब

پروفیسر محمد مجیب

ہمارے اس سال کے رہنما

پروفیسر محمد مجیب

۱۔ آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے پندرہویں اجلاس کے صدر۔ مجیب صاحب آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں، اور ایک عرصے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تاریخ و سیاسیات کے عالم ہیں۔

شری رنجیت ایم چیت سنگھ

۲۔ نویں نیشنل سیمینار کے ڈائرکٹر۔ شری رنجیت موہن چیت سنگھ کو اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے عوامی زندگی (پبلک لائف) سے دلچسپی رہی ہے۔ آپ عقیدے کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے اُس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جسے "کوئکر" کہتے ہیں اور جس کا بنیادی مقصد عالمگیر اُخوت اور محبت ہے۔

آپ انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے بانیوں میں سے ہیں اور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک اس کے جنرل سکریٹری رہے ہیں۔ ایسوسی ایشن کا سہ ماہی انگریزی رسالہ انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا تھا جو ایک طویل مدت تک آپ ہی کی ادارت اور انتظام میں نکلتا رہا تھا۔ آپ کی شخصیت کی ایک بڑی خصوصیت آپ کی دوست نوازی ہے۔ جو شخص آپ سے ایک بار مل لیتا ہے اُس کے دل میں پھر ملنے کی خواہش ہمیشہ تازہ رہتی ہے

شہروں میں سوشل ایجوکیشن

شہر کے ماحول میں بھی کیا کشش ہوتی ہے! بالغوں کی تعلیم نے ہندوستان میں آکر شہر میں آنکھ کھولی تھی، اور اگرچہ حالات کی ناسازگاری کے ہاتھوں اس کی نشو و نما کی قریب قریب وہی رفتار تھی جو کسی یتیم کی ہوتی ہے تاہم وہ رہی شہروں ہی میں، اور کبھی فیشنیبل قسم کے خدامِ خلق اور کبھی دردمند انجمنیں اکی دستگیری کرتی رہیں. لیکن ادھر کچھ عرصے سے لوگ اُسے گاؤں کی سیر کو لے گئے اور مستقل وہیں رکھا، اور تقریباً یہ سمجھ لیا کہ اس کی جگہ دراصل دیہات ہی ہے۔ مگر شہر پھر بھی شہر ہے. بالغوں کی تعلیم بُری طرح اپنے پرانے ماحول کے لئے مچل رہی ہے چنانچہ اسی مہینے کے دوسرے ہفتے میں لکھنؤ کا نیشنل سیمینار اس بات پر غور کرنے کے لئے منعقد ہو رہا ہے کہ بالغوں کی تعلیم کو شہر واپس لے چلنے کے لئے کیا انتظام و اہتمام ہونا چاہئے۔

سیمینار کا موضوعِ بحث ہے "شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم"۔ اگر اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ سوشل ایجوکیشن اپنے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں جب اس کا نام اڈلٹ ایجوکیشن تھا، شہروں ہی پھیلی تھی، تو زیرِ بحث موضوع کا منشا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم اب "نئے سرے" سے کرنی ہے۔ اگر یہ منشا تسلیم نہ کیا جائے تو پھر ا... کے کچھ معنی نہیں رہتے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد سے خصوصاً اُس وقت سے جب کہ ملک نے صنعتی ترقی کو اپنے منصوبوں کی منزل قرار دی ہے، شہروں کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اس تبدیلی کی رفتار ابھی

नवें नेशनल सेमिनार (लखनऊ) के

निर्देशक

نویں نیشنل سیمینار (لکھنو) کے ڈائرکٹر



श्री रणजीत एम० चेतसिंह

شری رنجیت ایم چیت سنگھ

ہے کہ اس طریقۂ کار کی ضرورت نہیں ہے لیکن موجودہ موضوع بحث جسکے اوپر عملاً دو سیمیناروں (اندور اور کلکتہ[1]) میں بحث ہو چکی ہے ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اس سے متعلق ابتک کے کام کا تجزیہ اور ای ویلوایشن ضروری نہ ہو۔

اس بات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ سیمینار کا انتظام کرنے والی سنستھا انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن سے چوک ہوگئی ہے۔ مگر اب بھی کم سے کم اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ سیمینار مختلف علاقوں سے آئے ہوئے نمائندوں سے فرمائش کرے کہ وہ اگر تحریری طور پر اُن سے ممکن ہو تو تحریری شکل میں ورنہ زبانی ہی اپنے اپنے یہاں کے اب تک کے تجربات اور مسائل بیان کریں اور ایک آدھ دن ان تجربات کے بارے میں گفتگو کرکے آیندہ کی بحث کے لئے ایک ٹھوس بنیاد قائم کرلی جائے۔ اس سے یہ ہوگا کہ بہت سی باتیں جن کی طرف ورکنگ پیپر مرتب کرتے وقت ہماری نظر نہیں گئی تھی، انکی اہمیت سامنے آجائے اور آیندہ کی بحثوں میں اُن سے مدد لے۔

مثال کے طور پر اب تک کے تجربے سے ایک بات جو خاص طور سے دیکھنے میں آئی ہے یہ ہے کہ شہروں میں تعلیم بالغان کے نام سے عام طور پر کمیونٹی سنٹر قائم ہوتے رہے ہیں۔ مگر یہ کمیونٹی سنٹر غالباً کہیں بھی کمیونٹی یعنی بستی کے اپنے سنٹر نہیں بن سکے اور یہی وجہ ہے کہ ان میں آج تک زندگی پیدا نہیں ہوسکی اور نہ ان کے فیض سے بستی کی زندگی میں کسی قسم کا اُبھار پیدا ہوا۔ ہم آیندہ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی نئی تنظیم کے طور پر کام کا جو نقشہ بنائیں گے۔ اور جس کا اشارہ سیمینار کے ورکنگ پیپر سے بھی ہوتا ہے۔ اس میں بڑا اور اہم مقام کمیونٹی سنٹروں ہی کی طرح کے اداروں کا ہوگا، ان کے نام چاہے کچھ مختلف ہوں اس لئے ہم اس موقعے پر یہ معلوم کئے بغیر کہ اب تک کے کمیونٹی سنٹروں کی ناکامی یا برائے نام کامیابی کے اسباب کیا رہے ہیں، آگے قدم نہیں اُٹھا سکتے اور اگر ایسا کرینگے تو ہماری سعادت شاید افلاطون کی ریاست (Republic

[1] اندور میں "کمیونٹی سنٹروں کی تنظیم" اور کلکتے میں "مزدوروں کی تعلیم" کے موضوعات پر بحث ہو چکی ہے اور یہ دونوں موضوع ایسے ہیں جن کا تعلق بہت بڑی حد تک شہراتی سوشل ایجوکیشن ہی سے ہے۔ اندور مزدوروں کی تعلیم کا نہ سہی، کمیونٹی سنٹروں کی تنظیم کا تو تجربہ بھی ہو چکا ہے اور اب تک ہو رہا ہے۔

زمانے کے ساتھ ساتھ اور بڑھے گی۔ ظاہر ہے ان بدلے ہوئے اور آئندہ اور زیادہ بدلنے والے حالات میں، کوئی چیز بھی ہو، اس کا رنگ روپ پہلے جیسا نہیں رہ سکتا اور نہ رہنا چاہئے۔ اس لئے لکھنؤ نیشنل سیمینار کا اس موضوع پر غور و بحث کرنے کا فیصلہ، بر وقت چاہے نہ ہو، مگر دانشمندی پر ضرور مبنی ہے

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا نیشنل سیمینار نے اپنی بحثوں کے لئے ورکنگ پیپر جیسی خالصتہً نظریاتی بنیاد کے علاوہ تجربات پر مبنی کوئی ٹھوس بنیاد بھی قائم کی ہے؟ یعنی یہ کہ آیا اس نے ایسا کوئی اہتمام بھی کیا ہے کہ اصل موضوع پر بحث شروع کرنے سے پہلے شہروں میں ابتک جو کچھ کام ہوتا رہا ہے، اس کی صحیح کیفیت معلوم ہو جائے؟ اس لئے کہ اگر موضوعِ بحث کا منشا یہ ہے کہ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی از سر نو تنظیم کرنی ہے، تو پھر یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اب تک جو تنظیم تھی اور تعلیم کا جو رنگ روپ تھا اس کی کیا کیفیت تھی اور اس سے کس طرح کے اور کس حد تک نتائج برآمد ہوئے۔ اس میں کیا کمی یا نقص رہ گیا تھا جسے دور کرنا چاہئے اور کون سے پہلو صحت مند تھے جنھیں اور زیادہ اُبھارنا چاہئے۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ جب تک اِس وقت تک کے کاموں، ان کی نوعیت اور نتائج کا پورا پورا اور بغیر کسی رو رعایت کے جائزہ نہ لیا جائے، سمجھ میں نہیں آسکتیں اور جب تک یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں اُس وقت تک ہماری بحثوں پر غلطی کر کے سیکھنے اور تجربے کی روشنی میں آگے بڑھنے کے اصول کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ ہمارے اوپر یہ الزام آسکتا ہے کہ ہم ہوا میں لاٹھی چلانے کے عادی ہیں۔

سیمیناروں کا جو طریقہ کار میسور کے ایشین سیمینار نے ہمارے سامنے رکھا تھا اور جس کے اوپر ہم نے اپنے پہلے نیشنل سیمینار (جبلپور) میں عمل کیا تھا، وہ بھی یہی تھا کہ ہر علاقے سے وہاں ہونے والے کام کی پوری پوری کیفیت منگوائی جائے پھر ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس کا تجزیہ اور ای ویلوایشن کیا جائے اور اس تجزیے سے جو حقائق معلوم ہوں انکی روشنی میں موضوعِ بحث سے متعلق آئندہ کے لئے منصوبے مرتب کئے جائیں۔ اگر کسی سیمینار کا موضوعِ بحث ایسا ہو جس کے اوپر پہلے کبھی کام نہ ہوا ہو، تب تو یہ بات کہی جاسکتی

تعلیمِ بالغان : منصب اور نظامِ تعلیم میں اس کا مقام

ذیل کا مضمون رابرٹ پی ارس کی کتاب (Adult Education in Practice) سے لیا گیا ہے۔ مصنف نے ان سطور میں نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ تعلیم بالغان کا منصب متعین کیا ہے اور اسی ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ تعلیم بالغان کی ضرورت کسی پسماندہ ملک ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی سماج کے بدلتے ہوئے ماحول کے پیش نظر اس کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔

ہمارے یہاں جبکہ ملک ترقی کی ابتدائی منزلوں سے گذر رہا ہے، تعلیم بالغان کی ضرورت اور اہمیت کو تو سبھی تسلیم کرتے ہیں مگر جب ترقیاتی مہموں میں اس کے اطلاق کا سوال پیدا ہوتا ہے تو یا تو جان بوجھ کر یا تعلیم بالغان کی تعریف اور اس کے منصب سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے سب سے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔

ذیل کی سطروں میں رابرٹ پی ارس نے تعلیم بالغان کا جو منصب متعین کیا ہے وہ اگرچہ ایک غیر ملکی مصنف کا نقطۂ نظر ہے تاہم اس میں بہت بڑی حد تک عالمگیریت پائی جاتی ہے اور ہمارے لئے کہ اڈلٹ ایجوکیشن یا سوشل ایجوکیشن کے مقام و منصب کے معاملے میں اکثر الجھن میں پڑ جاتے ہیں، یہ مختصر مضمون بہت مفید ہو سکتا ہے۔

ایڈیٹر

تعلیم کی تعریف اور منصب

ایک مسلسل عمل

ہر قسم کی تعلیم، سچ پوچھئے تو، نام ہے ایک عمل کا جس سے فرد اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش کی

کا دھوکا ہوگا۔

اگر ہم کمیونٹی سنٹروں کے اب تک کے تجربے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو ایک بات صاف دکھائی دے گی۔ ہمارے کمیونٹی سنٹر سوائے ایک آدھ مقام کے جہاں وہ کسی رضاکار ایجنسی کے ماتحت چلتے ہیں، بیشتر حالات میں براہِ راست سرکار کی نگرانی میں قائم ہوتے اور چلتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ براہِ راست سرکار کی نگرانی میں چلنے والے کمیونٹی سنٹر بلا شرکتِ غیرے بستی کے اپنے سنٹر نہیں بن سکتے۔ ہمارا ایمان تو اس سلسلے میں اس حد تک پکّا ہے کہ سرکاری نگرانی تو سرکاری نگرانی ہے، رضاکار جماعتوں کی نگرانی میں چلنے والے کمیونٹی سنٹر بھی صحیح معنوں میں بستی کے اپنے سنٹر نہیں بن سکتے، جب تک کہ وہ اُن سے بالکل بے تعلق ہو کر صرف صلاح مشورے سے ان کی رہنمائی اپنا منصب نہ بنالیں اور اگر سرمایہ لگا سکتی ہیں تو صرف حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط لگا کر انھیں غیر مشروط امداد دینے پر تیار نہ ہوں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سیمینار کے ورکنگ پے پر میں حکومت سے یہ مطالبہ کرکے کہ جس طرح اس نے دیہی علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کی ہے اُسی طرح شہراتی علاقوں میں بھی کرے، اُسی پرانے سبق کو دہرانے کی دعوت دی گئی ہے۔ یعنی سوشل ایجوکیشن کے باب میں سب سے اہم اور بحث طلب جو مسئلہ ہے، اُسی کو غالباً صحیح تسلیم کرکے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

قصہ مختصر، ہم سمجھتے ہیں کہ لکھنؤ سیمینار کی بحثیں اور اس کی سفارشات تشنہ رہ جائیں گی اگر اصل موضوع پر بحث کرنے سے پہلے اب تک شہروں میں جو کام ہوا ہے، اس کا تفصیل سے جائزہ نہ لے لیا جائے گا جو بہت بڑی حد تک سیمینار کے دوران میں بھی ممکن ہے

کردار ہے جو اُسے نبھانا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جو لوگ فوری اور غیر متعلق نتائج دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ان کی نظروں سے وہ بڑے مقاصد بعض اوقات اوجھل رہتے ہیں جو تعلیم بالغان کا منتہائے نظر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چیز معاشیات کے استاد کے فرائض میں شامل نہیں ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کو موجودہ معاشی نظام سے مفاہمت کرنے کے لئے تیار کر دے یا انھیں اس کے بدلے کسی دوسرے معاشی عقیدے کا حامی بنا دے۔ اسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بالغ انگریزی ادب کا مطالعہ کرے گا تو وہ اپنے آپ کو اس دُنیا سے ماورا سمجھنے لگے گا اور اس طرح اب جو وہ باطل کے طلسمات کی طرف سے خوف زدہ رہتا ہے، اس کے بعد اس کی یہ پرہیزگاری جاتی رہے گی، ان لوگوں کا یہ اندیشہ اسی طرح بے بنیاد ثابت ہوگا جیسے کچھ لوگوں کی یہ امید کہ انگریزی ادب کا مطالعہ کرکے یہ نوسکھ لوگ پارٹی کے حق میں بڑے اچھے اور کارگر مبلغ اور پروپگنڈسٹ ثابت ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے دل پسند مطالعے سے بالغ طالب علم، عورتیں اور مرد بہتر انسان بن سکتے ہیں، جماعت کے لئے زیادہ کارآمد شہری بن سکتے ہیں — اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ان کے اندر مروّت اور خوش خلقی بھی زیادہ آجائے گی — اور جس نصب العین پر انھیں ایمان ہوگا اس کی وہ زیادہ قابلیت کے ساتھ خدمت کریں گے۔ تعلیم بالغان اس سے زیادہ کا نہ دعویٰ کرتی ہے اور نہ اس سے کچھ زیادہ کا اس سے مطالبہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے عام مقاصد کا تعیّن کر لینے کے بعد جب ہم تعلیم بالغان کے خصوصی فرائض پر غور کریں تو مسئلہ نسبتاً زیادہ آسان ہو جاتا ہے اور اس باب میں اتحادِ خیال کے امکانات بھی غالباً زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کام تو عارضی نوعیت کے ہیں اور جس وقت ہمارے تعلیمی نظام میں اصلاح ہو جائے گی، اُس وقت ان کی اہمیت گھٹ جائے گی۔ مگر دوسرے کاموں کا تعلیم بالغان سے بنیادی رشتہ ہے اور ان کی اہمیت گھٹنے کے بجائے بڑھے گی۔

<u>نظامِ تعلیم کی کوتاہیوں کی تکمیل</u>

تعلیم بالغان کا منصب ان کمیوں کو پورا کرنا ہے جو طالب علموں کی ایک بڑی تعداد کی سابقہ

دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں گذرتا ہے۔ مگر چونکہ اس کے گرد و پیش کی دنیا مستقل بدلتی رہتی ہے۔ اور چونکہ وہ خود اس تبدیلی کو بروئے کار لانے میں غیر شعوری طور پر دخیل ہوتا ہے، اس لئے اپنی دنیا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے اس عمل میں تسلسل ضروری ہے۔ یہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو بچپن یا زمانہ ما قبل بلوغت میں ہمیشہ کے لئے پورا ہو جائے۔ یہ راز سمجھ لینے کے بعد یہ بات کہ تعلیم کی ضرورت فرد کو عمر بھر جب تک وہ کام کے لائق رہے، رہتی ہے، پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ جھگڑا بھی ختم ہو جاتا ہے کہ آیا صحیح تعلیم وہ ہے جس کا منشا فرد کی نشو و نما ہوتا ہے یا وہ جس کا منتہائے نظر چند سماجی مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔

سماج کے ناقص نظام میں تبدیلی: ایک فرض

تعلیم کا منشا یہ ہونا چاہئے کہ فرد کے اندر جو صلاحیتیں ہیں، ان کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اس کا منصب یہ ہے کہ وہ اس کو وہ علم بھی بہم پہنچائے جو اسے اپنی استعداد کے مطابق اچھی سے اچھی زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہو۔ تعلیم کا پورے سماج سے جو رشتہ ہوتا ہے اس کے اعتبار سے اس کا منصب یہ ہے کہ اس کے ذریعے علم کی بنیادیں جن کے سہارے تہذیب قائم رہتی ہے، ایک کے بعد دوسری نسل میں قائم و دائم رہیں، نئے علوم کی تحقیق و تجسس کی حوصلہ افزائی ہو اور جماعت کو باہم ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے مواقع ہاتھ آئیں۔ تعلیم کا مزاج متحرک اور قدامت پسندانہ دونوں ہونا چاہئے۔ یہ اس لئے کہ اگر جماعت کی ساخت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی رو سے اکثریت کو ذہنی ترقی کے مواقع سے مستفید ہونے اور اس کی بدولت اچھی زندگی کے امکانات سے محروم رکھا جاتا ہے تو تعلیم کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سماج کی موجودہ تنظیم میں ایسی تبدیلی پیدا کر دے جس سے فرد کی نشو و نما کے راستے میں جو رکاوٹیں آتی ہیں، وہ دور ہو جائیں۔

تعلیم بالغان کا مقام

یہاں ہمارا مقصود، بہرحال یہ دیکھنا ہے کہ ان عام مقاصد کے حصول میں تعلیم بالغان کا کیا

کے لئے تیار کرنا ہو، اسکول یا کالج سے نکلنے کے بعد جب آدمی کام پر لگ جاتا ہے تو ابتدائے ملازمت کی مصروفیتیں اُسے اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ اپنے مخصوص ذوق کی تسکین کا کچھ سامان کرسکے البتہ جب ان مصروفیتوں کی شدت میں کمی واقع ہوتی ہے اس وقت کہیں جاکر وہ علم اور فائدہ مندی کے وسیع تر میدانوں کی طرف توجہ کرتا ہے۔ غرض تعلیم کی ضرورت صرف بدنصیب طبقے ہی کو نہیں ہے بلکہ سب کو ہے اور تعلیم بالغان کو ان سب کی ضرورتیں پوری کرنی ہیں۔

یہ کیفیت تعلیم بالغان کے ایک اور اہم مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں علم چند غیر مربوط "مضامین" کی شکل میں طالب کے سامنے آتا ہے۔ ان مضامین کی تحصیل کے دوران میں علم کے الگ الگ تار ہو سکتا ہے بہت دور تک پہنچ جائیں مگر ان سب کی ترکیب سے جو شکل بنتی ہے وہ اسی وقت ظاہر ہوسکتی ہے جب ان تاروں کو ملا کر بٹ دیا جائے اور تجربے کے تابے بانے سے ایک ذات کر دیا جائے۔ بہت سے لوگ جنھیں اپنے خصوصی علوم کا ماہر کہا جاتا ہے کچھ عجیب بے فیض سے ہوتے ہیں۔ ان کی یہ بے فیضی اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مختلف علوم کو سمونے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہر فرد کے دماغ میں خیالات کا ایک فطری نظام ہوتا ہے جو علم اس نظام خیالات میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا وہ فرد کے لئے بیکار محض ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اڈلٹ ایجوکیشن کا اصل رشتہ علم کی مختلف شاخوں کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے، اس سے ہونا چاہیے۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں اُسی وقت کامیابی ہوسکتی ہے جب علوم کے اس "کُل" کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ افلاطون نے جو یہ کہا ہے کہ تعلیم ان لوگوں کے لئے مناسب ہے جو ۲۰ سالہ نوجوانوں میں سے اعلیٰ مراتب کے لئے منتخب کئے جائیں تو اس کا منشا بھی یہی کچھ تھا۔ "وہ علوم جو اُن کے (منتخب ۲۰ سالہ نوجوانوں کے) بچپن میں ایک دوسرے سے الگ کرکے پڑھائے گئے تھے انھیں اب ایک نئے انداز سے باہم سمیٹ کر انکے سامنے پیش کرنا ہوگا تاکہ انکے درمیان جو باہمی ربط ہے اور جو کائنات کے وجود کی اصلیت ہے ان (نوجوانوں) کے اوپر واضح ہو جائے۔[1]

[1] "ریاست" دفتر ہفتم

تعلیم میں رہ جاتی ہیں۔ اگرچہ گذشتہ پچاس سال کے دوران میں ہماری تعلیم میں بہت کچھ اصلاح ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے تعلیمی نظام میں بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ ہماری بالغ آبادی میں بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھیں ۱۴ سال کی عمر میں یا اس سے بھی پہلے باضابطہ تعلیم سے محروم ہوجانا پڑا تھا، یعنی ایسے وقت میں جب ان کے دماغوں کی کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں اور ان کی دلچسپیاں اور صلاحیتیں رونما ہونے لگیں تھیں یہ معلوم ہوجانے کے بعد بھی کہ جواں سال لوگوں کا یہ ریلا جو ہر سال مزدوروں کے بازار میں بڑھتا رہتا ہے، اس سے بے روزگار لوگوں کی موجودہ تعداد کو کام پر لگانے کا مسئلہ اور بھی مشکل ہوجائے گا، ہمارے ملک کے اوپر یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی کہ تعلیم میں کفایت شعاری سے کام لینا جو قوم کے بچوں اور نوجوانوں کی بھینٹ چڑھا کر ممکن ہوتی ہے، بدترین قسم کی فضول خرچی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مزید تعلیم (Further Education) کے مواقع اب بہت ہیں، اور ان سے فائدہ ہے۔ مگر بڑا مسئلہ اب بھی جوں کا توں باقی ہے اور جب تک یہ باقی ہے اُس وقت تک تعلیم کے بعض کام جن کا تعلق ابتدائی منزلوں سے ہوتا ہے، اڈلٹ ایجوکیشن کے اوپر عاید ہوں گے مگر یہ صورت حال نہ صرف بالکل غلط ہے بلکہ غیر کفایت شعارانہ اور الجھن میں ڈالنے والی بھی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم بالغان کا جو اصل کام ہے وہ ماند پڑ جاتا ہے اور اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

مہارت خصوصی کے تقاضوں کی تکمیل

اگر کسی صورت سے یہ مسئلہ حل ہوتا ہے تو دوسرا سامنے آن کھڑا ہوتا ہے کیا کسی حالت میں بھی یہ ممکن ہے کہ جماعت کے ہر فرد کو جو معقول معیار کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، یہ یقین دلایا جاسکے کہ اُسے بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے وہ تعلیم مل جائے گی؟ عہد حاضر میں خود علم کی وسعت اس بات کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ یہ دور مہارت خصوصی کا دور ہے۔ مہارت خصوصی صرف معاشی سرگرمیوں ہی کے میدان میں نہیں بلکہ علم کی ہر شاخ میں ہے۔ بہت آگے کی بات تو دور رہی، وہ لوگ بھی جو تعلیم کی ثانوی سڑک کو پار کرکے یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ لیتے ہیں، انھیں بھی علم کی ایک معین سمت ہی کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کرنا پڑتا ہے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ان کا اولین مقصود اپنے آپ کو کسی پیشے

ہے۔ اس صورت حال کا علاج صرف اسی طرح ممکن ہے کہ تعلیم کو ایک کبھی نہ ختم ہونے والے عمل کی حیثیت دی جائے تاکہ سن رسیدہ نسل کے لوگ علم کے معاملے میں نئی نسل کے دوش بدوش رہ سکیں اور تجربہ اور علم باہم شیر و شکر ہو کر جماعت کو اونچے سے اونچے مقامات پر پہنچا دیں۔

غرض تعلیم بالغان اس حیثیت سے کہ وہ آپ اپنی کوشش سے اپنی قوتوں کو ابھارنے کا ایک ذریعہ ہے اور خدمت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے کا ایک وسیلہ، لوازم جمہوریت کا ایک جزو لاینفک ہے۔

تازہ واردانِ بساطِ زندگی کی دستگیری

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بعض علوم کا مطالعہ تعلیم کی اس منزل میں مناسب ہوتا ہے جب طالب علم بالغ ہو چکا ہوتا ہے۔ جب آدمی بلوغت کی عمر میں قدم رکھتا ہے تو شخصی حوصلے اور جوا سالی کے جذبات کے طوفان میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اُس وقت مذہب واخلاق، سیاست ومعیشت غرض ہر اُس چیز میں جو روزانہ کی زندگی پر اثر انداز ہوئی ہوتی ہے، نئی نئی باتیں اور قدروں کا ایک نیا شعور سامنے آتا ہے۔ اکثر اوقات جواں سالی کے زمانے کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور وہ شکست طلسم اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھل چکی ہوتی ہیں اور وہ بڑے مسائل کی یلغار میں اپنے آپ کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگتا ہے۔ تعلیم بالغان کا منصب ہے زندگی ان نو واردوں کی اس کام میں مدد کرنا کہ وہ خود اپنی کوشش سے اپنے لئے ایک واضح مقصدِ حیات جو وسیع تر مطالعہ پر مبنی ہو، متعین کریں، کائنات میں اپنا مقام تلاش کریں اور ایک ایسا فلسفہ ڈھونڈ نکالیں جو انھیں انفرادی واجتماعی دونوں حیثیتوں میں زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا اہل بنادے

سن رسیدہ اور جواں سال نسلوں کے درمیان مفاہمت

تعلیم بالغان کا ایک اور پہلو ہے جو اس عہد میں علم کی ترقی کی تیز رفتاری اور تیزی سے بدلتے ہوئے معیاروں کی روشنی میں دیکھئے تو بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک نسل پختگی کی عمر کو پہنچ جاتی ہے تو دوسری اُسی راستے پر چلتی ہوئی مگر اس کے مقابلے میں علم کے وسیع تر مواقع سے بہرہ اندوز ہوتی زندگی میں داخل ہو رہی ہوتی ہے۔ نیا علم عہدِ ماضی کے قائم کئے ہوئے رسم ورواج اور روایات کو خا میں نہیں لاتا اور اس وجہ سے وہ لوگ جن کے سوچنے کے طریقے میں لچک باقی نہیں رہ جاتی، ا مخالفت کرتے ہیں۔ جواں سال لوگ قدامت پسندی کو جو اُن کے سامنے اپنا جواز ثابت نہیں کر سکتی جھیلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں نسلوں کے مابین ناچاقی اور غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو تعاون واشتراک اور ترقی کے منظم ومرتب منصوبوں کو ناممکن بنا

شہروں اور قصبوں کا پھیلاؤ

ایک تشویشناک صورت حال

زیر نظر مضمون شری اشوک مہتا کے مقالے "دوسرے پلان کو اس کی اصلی حالت میں قائم رکھنے کا جواز" کا ایک حصہ ہے جو معاصر "اسٹیٹسمین" کی ۲۱ اگست کی اشاعت میں چھپا تھا۔ فاضل مضمون نگار نے اپنی بحث میں دو پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ ایک بڑھتی ہوئی آبادی، اور دوسرے شہروں کا روز افزوں پھیلاؤ۔

ہم نے بحث کے موخر الذکر پہلو کو لے لیا ہے تاکہ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو کہ شہروں کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کے معاشی اثرات و نتائج کیا ہو رہے ہیں اور انکی بنا پر یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ تعلیم اور خصوصاً سوشل ایجوکیشن کے اوپر اس صورت حالات کے کیا مطالبے ہیں ——— ایڈیٹر

ہندوستان کے سامنے غیر ملکی زر مبادلہ کی جو دشواریاں ہیں وہ تو سب پر روشن ہے مگر یہ بات ابھی تک بہت کم محسوس کی گئی ہے کہ ہمارے اندرونی وسائل کا مسئلہ بھی کچھ کم تشویش ناک نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ایسے اخراجات جن کا تعلق نہ ڈیولپ منٹ کے کسی کام سے ہوتا ہے اور نہ وہ پنج سالہ منصوبے کے اندر آسکے ہیں، ان کی مقدار روز بروز بڑھتی جارہی ہے ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ دوسرے منصوبے کے بجٹ کو جسے ہم نے کاٹ کر ۴۸ ارب سے ۴۲ ارب کر دیا ہے۔ اس میں بھی کتر بیونت نہ ہوگی۔ اشیاء کی قیمتیں الگ چڑھتی جارہی ہیں، اس سے بھی پلان کی مجوزہ مادی جسامت میں کمی آتی جارہی ہے۔

تعلیم و ترقی کے خاص نمبر

بہ عنوان

۱۔ سوشل ایجوکیشن میں کتب خانوں کا مقام ۱۹۵۵ء۔ قیمت: ایک پیسہ
۲۔ دیہات کی نئی تعمیر میں سوشل ایجوکیشن کا منصب ۱۹۵۶ء۔ قیمت: ۸ر
۳۔ مزدوروں کی تعلیم ۱۹۵۷ء۔ قیمت: ۸ر
۴۔ شہری علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم ۱۹۵۸ء۔ قیمت: ۸ر

نوٹ:۔ جو حضرات دسمبر ۱۹۵۸ء سے رسالے کے خریدار بنیں گے، اُن کی خدمت میں یہ تازہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔ رسالے کا سالانہ زرِ چندہ چار روپے ہے

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

۴۴ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے تو اس میں ہر فیصدی اضافے پر ۴ء۲ فیصدی کے حساب سے شہروں کی آبادی بڑھی ہے۔ اس طرح حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ء اور سنہ ۱۹۵۱ء کے درمیان ایک لاکھ سے زائد آبادی والے شہروں کی آبادی میں ۲ء۳۶ فیصدی کے حساب سے اضافہ ہوا ہے جبکہ کل آبادی میں اس زمانے میں صرف ۳ء۱۴ فیصدی کے حساب سے اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں شہروں کی کل آبادی ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی جو ہندوستان کی کل آبادی کا ۱۷ فیصدی ہے۔ اس کی تقسیم اس طرح پر ہے :۔ ایک لاکھ یا اس سے زاید آبادی والے شہروں میں اس تعداد کا ۳۸ فیصدی حصّہ آباد ہے، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی آبادی والے شہروں میں ۳۰ فیصدی اور ۵۰ ہزار اور اس سے کم آبادی والے قصبوں میں ۳۲ فیصدی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر شہروں کی آبادی میں اضافے کی یہی رفتار رہی تو سنہ ۱۹۸۱ء تک شہروں کی آبادی کل آبادی کے ۲۷ فیصدی یعنی ساڑھے اُنیس کروڑ تک پہنچ جائیگی۔

اگرچہ ایشیا میں شہروں کی آبادی کا تناسب، کل آبادی کا صرف ۱۳ فیصدی ہے، مگر اس ۱۳ فیصدی میں سے ۸ فیصدی سے زیادہ آبادی کلکتہ، بمبئی جیسے بڑے بڑے شہروں میں رہتی ہے۔ ایشیا میں کھیتی باڑی کے کام سے الگ دوسرے دھندوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا اوسط کل آبادی کا اندازاً ۳۰ فیصدی ہے۔ مغرب کے ملکوں میں بھی مختلف زمانوں میں قریب قریب اسی نسبت سے شہروں کا پھیلاؤ عمل میں آیا تھا جیسے سنہ ۱۸۵۰ء-۱۹۰۰ء میں امریکہ میں، سنہ ۱۸۶۰ء-۱۹۰۰ء میں فرانس میں، سنہ ۱۸۸۰ء-۱۹۰۰ء میں جرمنی میں اور سنہ ۱۸۹۰ء-۱۹۰۰ء میں کناڈا میں۔ مگر ان ملکوں میں زراعت سے الگ دوسرے پیشوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا اوسط کل آبادی کا ۵۵ فیصدی تھا۔ دنیا کے ۸۹۰ شہروں میں (جنکی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے) ۴۶۳ شہر پس ماندہ ملکوں میں ہیں اور ۴۲۴ صنعتی ملکوں میں۔ پس ماندہ ملکوں میں جو شہر ہیں ان کی آبادی اندازاً ۱۹ کروڑ ہے اور ان کے مقابلے میں صنعتی ملکوں کے شہروں کی آبادی تقریباً ساڑھے پندرہ کروڑ۔ اول الذکر شہروں میں سات سے آٹھ کروڑ تک انسان ۱۰ لاکھ سے زائد آبادی والے شہروں میں رہتے ہیں جن کی تعداد ۳۵ یا ۴۰ ہے۔ ان اعداد کی روشنی میں دیکھئے تو ایشیا میں اس کی اقتصادی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ضرورت سے زیادہ شہرائیت ہے۔

اِدھر شرح پیداوار میں بھی کمی واقع ہوئی ہے بمثال کے لئے صنعتی پیداوار کو لیجئے۔ معلوم ہوگا کہ پچھلے چند سال کے مقابلے میں صنعتی پیداوار کا اضافہ سات آٹھ فیصدی سے کم ہو کر محض ۲،۸ فیصدی رہ گیا ہے

اِن حالات میں ان لوگوں جو یاس اور پست حوصلگی کے زیرِ اثر سوچنے کے عادی ہیں، اپنی یاس پسندی کا ثبوت مل جاتا ہے۔ انھیں یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ "ہم نے تو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ دوسرے پلان کو اتنا حوصلہ مندانہ روپ نہ دیجئے!"

اقتصادی پالیسی کے اس خیال کے حامی جو اس گراں باری اور دباؤ کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقتصادی میدان میں اس طرح دوڑ لگانا دانشمندی کے خلاف ہے، یہ بھول جاتے ہیں۔ ہندوستان کے اوپر دو طرف سے دباؤ پڑ رہا ہے اور اُسے بہ یک وقت ان دونوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ آج ڈیولپ منٹ کے کاموں کو تیزی سے آگے بڑھانے کی ضرورت صرف اسی لئے نہیں ہے کہ وہ ایک عرصے سے کس پرسی اور بے بسی کا شکار رہا ہے۔ بلکہ خاص طور پر اس لئے کہ اس کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف شہرائیت کی روز افزوں دبا دعوت پیکار دے رہی ہے۔ آبادی کے سیلاب اور شہروں اور قصبوں کے پھیلاؤ کی اس دوہری مار کو دیکھئے تو منصوبہ بنانے والوں کے سامنے کوئی اور چارۂ کار ہی کہاں رہ جاتا ہے!

(بڑھتی ہوئی آبادی کے کیا نتائج و عواقب ہوتے ہیں اور ملک کی قومی آمدنی اور فی کس آمدنی کے اس کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں، وہ ہمارے موضوع سے اس وقت اتنے متعلق نہیں ہیں جتنا یہ دوسرا پہلو یعنی شہروں اور قصبوں کا بڑھتا ہوا پھیلاؤ۔ اس لئے ہم اول الذکر بات "اضافۂ آبادی" کے پہلو کو یہیں چھوڑ کر شہرائیت کے پہلو پر مصنف کے خیالات پیش کریں گے ——— ایڈیٹر)

شہرائیت کا دباؤ اضافۂ آبادی کے دباؤ سے زیادہ سخت ہے۔ ہندوستانی شہروں کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا حساب یوں سمجھئے کہ اگر ملک کی آبادی میں گذشتہ تیس سال میں

اقتصادی نقطۂ نظر سے بہت نقصان دہ ہے۔ اگر ہم ترقیاتی کاموں کی رفتار میں کمی کرتے ہیں تو اس سے
شہروں کی طرف بھاگنے کے رجحان میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

جبتک شہروں میں ڈیولپ منٹ کا کام اس پیمانے پر نہیں کیا جاتا کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے
لئے شہر میں روزگار کے مواقع، تعلیم، رہائش، صحت و صفائی کی سہولتیں اور پانی کی معقول فراہمی کی ضمانت
ہو جائے، ان کے یہاں غربت و افلاس کی جڑیں روز بروز مضبوط ہوتی جائیں گی۔ مثال کے لئے شہر پونا کو
لیجئے۔ اس شہر کی آبادی ۱۹۳۷ء اور ۱۹۵۴ء کے درمیانی زمانے میں لگ بھگ دگنی ہو گئی۔ مگر اسی
زمانے میں ان لوگوں کی اس تعداد جو غربت و افلاس کی وجہ سے بھیک مانگنے کی نوبت کو پہنچ جاتے ہیں
۱۹۳۷ء کے مقابلے میں ۱۹۵۴ء میں تگنی ہو گئی تھی اگرچہ ان کا فیصدی اوسطہ ۱۵ فیصدی سے بڑھ کر ۲۵ فیصدی
ہی رہا ہے۔

شہروں اور قصبوں کی طرف لوگوں کا یہ جو ریلا ہے، اُسے روکا نہیں جا سکتا۔ اب تو صرف
دو ہی راستے ہیں، یا تو اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کی جائے تاکہ اس کے اثر سے پیدائش میں کمی واقع ہو اور
دوسری طرف روزگار اور دوسرے مواقع کے راستے کھلیں، اور اشیاء غذا کی اتنی افراط کے ساتھ بہم رسانی
ہو کہ شہروں اور قصبوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھرے یا پھر یہ راستہ ہے کہ ہم محتاجی اور تعطل کی
زندگی پر صبر کریں۔

(اسٹیٹسمین کے شکریے کے ساتھ)

" شہروں میں آبادی کا یہ ہجوم دیکھئے اور اس کے مقابلے میں جو آسائشیں اور انتظامات ہونے چاہئیں، ان کی زبوں حالی پر نظر ڈالئے تو یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل کے الفاظ میں " ایشیا کے بہت سے شہر آج اس تشویش ناک حالت کو پہونچ گئے ہیں کہ ان کے یہاں پیداوار کے نام پر جو کام کرتا ہے اس پر معاشی پیداوار کے لفظ کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ اُدھر وہ کیفیت ہے اور دوسری طرف یہ کہ دیہی علاقوں سے بے روزگاری کو ختم کرنا جو شہروں کا منصب ہے، یہ منصب بھی وہ اچھی طرح پورا نہیں کر پا رہے ہیں اور اس طرح قومی ترقی اور خوشحالی کی رفتار میں خلل واقع ہو رہا ہے۔"

شہروں میں آنے والے نئے لوگ

شہروں میں آکر بس جانے والے نئے لوگوں کے بارے میں یونیسکو کی طرف سے ایشیا کے متعدد شہروں کا ایک جائزہ لیا گیا تھا۔ اس جائزے کی تحقیقات کے مطابق " واقعہ یہ نہیں ہے کہ لوگ جو شہروں کی طرف کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں وہ اس لئے ہے کہ شہروں کی چمک دمک میں ان کے لئے بڑی کشش ہے۔ اس جوق در جوق ہجرت کی اصل وجہ وہ طرح طرح کی اقتصادی مجبوریاں اور پریشانیاں ہیں جو لوگوں کو اس طرح گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر شہر ان کو اپنی طرف "کھینچتے" نہیں ہیں بلکہ وہ " دھکا کھا کر" گرتے پڑتے شہروں کی طرف چل پڑتے ہیں۔ معاشیات کے ایک عالم ڈاکٹر کے۔ این۔ راج نے جتلایا ہے کہ " اقتصادی میدان میں جو ترقی اور تبدیلی ہوئی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ آبادی میں کسی قسم کا اضافہ نہ بھی ہو، کھلے بازار میں مزدوری پر کام کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جائے گی۔" اُدھر آبادی کے بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بے روزگاری جس پر چھوٹے روزگار کا پردہ پڑا ہوا تھا، وہ برہنہ ہو کر سامنے آجائے گی اور اس سے شہری علاقوں کے اوپر جو بوجھ ہے، وہ بہت بھاری ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ پہلے شہروں کے پھیلاؤ اور اس کے معاشی عواقب کے بارے میں انڈونیشیا میں ایک مطالعہ کیا گیا تھا جس کا بیان ہے کہ " بات صرف یہیں تک نہیں ہے کہ بڑے بڑے شہر چھوٹے شہروں کے مقابلے میں بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں بلکہ اُس سے زیادہ اہم اور قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ شہروں کی طرف اس طرح لوگوں کی ہجرت

آج کا شہراتی سماج، جو زیادہ تر اکھڑی اکھڑی بستیوں سے بھرا پڑا ہے، افراد اور خاندانی زندگی کی بہبودی کے لئے ایک منظم ادارے یا سنستھا کی حیثیت سے کام نہیں کرتا۔ صنعتی انقلاب کے ہاتھوں شہروں میں لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ چیزوں کی افراط اور انسانوں کے اس جم غفیر میں چونکہ سماج کی بنیاد گھرے اور قریبی رشتوں پر قائم نہیں ہوتی اس لئے افراد اور خاندان دونوں بہت اکھڑے اکھڑے سے دکھائی دیتے ہیں۔ شہروں کی سماجی تنظیم بہت زیادہ پھیلی ہوئی اور بے ہنگم سی ہوتی ہے۔ معمولی انسان اس پھیلے ہوئے سماج میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا اور بے سہارا محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے لئے اس وسیع سماج کو سمجھنا اور اس میں سوجھ بوجھ کے ساتھ حصّہ لینا مشکل ہوتا ہے۔

صنعتی سماج کی کمزوریاں

صنعتی سماج کی نعمتیں بے شک بہت ہیں مگر شہراتی سماج کی وسعت میں لوگوں کو موثر ڈھنگ پر پوری دیانت اور دانشمندی سے حصّہ لینے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور وہ اس نئی دنیا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سماج کی جو کچھ بھی نعمتیں ہیں، اس معیار پر آ کر ان کی قدر و قیمت بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ یہاں زندگی کی حقیقی قدر و قیمت کی پہچان ہو پاتی ہے اور نہ دل و دماغ کو سکون پہونچانے والے وسائل سے آدمی پورا پورا فائدہ اٹھا پاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار اور بڑے بڑے بازاروں میں چیزوں کی افراط سے حاصل ہونے والی خیالی مسرت کے پیچھے شہریوں کی رہائش، سماجی اور جسمانی صحت اور خاندانی بہبود کے لئے جن انتظامات کی ضرورت ہے انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ دراصل انہی ذریعوں سے افراد کی شخصیت کی تعمیر اور نشو نما ہوتی ہے۔ یہ بات نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اس نئے نظام میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اس سے اپنے آپ کو پوری طرح ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور اس کے نتیجے میں سماج دشمن عناصر کی شکل اختیار کر کے خود اپنے آپ کو اور اس نئے سماجی نظام کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اس نئے معاشی نظام کی ارتقائی منزلوں میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، ان کی صحت، تعلیم اور شخصیت کی نشو و نما پر توجہ نہیں دی جاتی اور نہ اس نئے صنعتی سماج سے اپنے آپکو ہم آہنگ کرنے کے لئے انھیں تیار کیا جاتا ہے۔

شہروں میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی ضرورت

ہمارے دوسرے پنج سالہ پلان کا خاص مقصد ہندوستان کو صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ بنانا ہے۔ ۱۸۵۰ء کے بعد یورپ، امریکہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں صنعتی انقلاب رونما ہوئے اور صنعتی سماج کی تشکیل ہوئی۔ ہندوستان صنعتیت کی پہلی منزل سطے کرچکا ہے اور وہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چلنے کی کوشش میں ہے ۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر صنعتیت کے سماجی تقاضوں پر غور کرنا ضروری ہوجاتا ہے ہمیں بہرحال اس موضوع پر اس پہلو سے بحث کرنی ہے کہ صنعتی سماج کے اندر سماجی بہبود کا کام بالخصوص کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے اصول و منہاج کو سامنے رکھتے ہوئے کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے معاملے میں جاگیرداری اور دیہی معاشیاتی نظام کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے ہندوستان کے کچھ علاقوں کی شکل تو آج بھی جاگیردارانہ نظام کا مزاج لئے ہوئے ہے۔ صنعتی انقلاب کی تاریخ تو محض دو سو سال ہی پرانی ہے، مگر اتنی قلیل مدت میں بھی اس نے پرانے سماجی نظام کو قریب قریب نیست و نابود کرکے رکھ دیا ہے۔ جو لوگ اس نئے نظام کی نعمتوں کے قائل ہیں وہ دراصل اس کی ان قوتوں سے مرعوب ہیں جن سے زندگی کے ساز و سامان کی فراوانی پیدا ہوتی ہے اور جن سے زندگی کے معیار میں بلندی پیدا ہونے کے مواقع پیدا ہوگئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ افراد کی زندگی میں بلندی پیدا کرنے کی کوشش اسی وقت صحیح معنوں میں بارآور ہوسکتی ہے جب سماجی تنظیم بھی اسی نسبت سے صحت مند اور مؤثر ہو۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شہر ہی آج تک اس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ان شہروں میں صحت مند انداز فکر، صحت مند سماجی شعور اور بے لوث خدمت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ جہاں تک دیہی علاقوں میں کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کا کام کرنے کا تعلق ہے یہ ہم اس کے باوجود کہ اصول اور مقصد کے لحاظ سے اُس میں بہت سے اُلجھاؤ ہیں بہت بجا اور مناسب ہے مگر اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ آج شہروں کی جو حالت ہے، ہم نے کبھی اس پر بھی سنجیدگی سے غور کیا ہے؟ کیا آج کے شہروں میں اتنی سکت موجود ہے کہ وہ اپنی حالت کو خود سدھار سکیں؟ شہر ہی ملک کی رہنمائی کرتے ہیں اس لئے زراعت اور صنعت کی ترقی کی غیر متوازی صورت حال سے بچنے کے لئے شہری علاقوں میں کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کا کام بلاکسی تاخیر کے جلد از جلد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک صنعتی ترقی کے ذریعہ گاؤں کی آبادی کے لئے روزگار فراہم کرنا چاہتا ہے، ایسی حالت میں اس ارادے کو عملی شکل میں تبدیل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شہروں کی تنظیم اور ان کا نظم ونسق بہتر طریقے پر منظم کیا جائے۔ شہروں اور دیہاتوں کے درمیان اچھے اور خوش گوار تعلقات پیدا کرنے کا سوال بہت اہم ہے اس کے بغیر ملک کی تعمیر و ترقی کا کام متوازن اور مربوط طریقے پر چلانا ممکن نہیں ہوسکے گا۔

کمیونٹی ڈیویلپمنٹ کا مفہوم

ہندوستان میں کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کا کام جس نہج پر ہورہا ہے، اس کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس اسکیم کے پیچھے جو فلسفہ ہے اس کی وضاحت بھی کردی جائے۔ دنیا میں جتنی انسانی بستیاں ہیں وہ سب اپنی سماجی تنظیم اور معمولات زندگی کے لحاظ سے ایک جیسی نہیں ہیں۔ اس وقت مختلف ملکوں میں بستیوں کی تنظیم کا کام پھیل رہا ہے۔ مگر ہر ملک کا تاریخی پس منظر، اس کے موجودہ سماجی محرکات اور اقتصادی اور سماجی استحکام کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور ہر ملک کی بستیوں کی تنظیم کا کام انہی محرکات اور تقاضوں کے مطابق ہورہا ہے۔

آگے نکل جاتے ہیں وہ ایکدم ہندوستانی روایات کو چھوڑ کر مغربی آداب و اطوار کی تقلید شروع کر دیتے ہیں۔ ابتدا میں تو گاؤں کے حسن سادہ کی دلکشی جو فطرت کی گود میں پلنے کا نتیجہ ہوتی ہے، شہر کی تہذیب پر اثر انداز ہوتی ہے مگر پھر عمل اور ردّ عمل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے ایک بالکل مختلف شکل کی تہذیب جنم لیتی ہے۔ یہ ہوتا اس طرح ہے کہ چند گنے چنے خوش حال لوگوں کی نام نہاد آن بان کا سہارا لے کر یہ نئی تہذیب جب عام لوگوں میں پھیلتی ہے تو گاؤں کی زندگی کی قدریں، جو ان کا سہارا ہوتی ہیں، اُن کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں اور پھر وہ غریب شہر کے اس وسیع اور پیچیدہ سماج میں بے یار و مددگار ہو کر اُس گروہ کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں جو اپنے قافلے سے بچھڑ گیا ہو۔ اس عمل سے ایک کشمکش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور بالآخر ایک نئی سماجی تنظیم وجود میں آتی ہے اور پرانی تنظیم جو سماجی شعور اور تعاونی زندگی کی بنیادوں پر قائم تھی ختم ہو جاتی ہے۔

شہروں میں (اس نو وارد آبادی کی) رہائش گاہیں بیشتر گندی بستیاں ہوتی ہیں۔ یہ گندی بستیاں زندگی کی بقا کے لئے جو جد و جہد کرنی پڑتی ہے اس کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ شہروں میں جنسی اور ازدواجی زندگی بہت تلخ ہوتی ہے۔ فطری ماحول کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں گندگی اور بیماری سے نجات دلانے والے عنصر موجود ہوتے ہیں۔ شہروں کی ان رہائش گاہوں میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی اس کے برخلاف انسانی زندگی کے لئے ان میں مضرت کے پہلو زیادہ ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کے اندر سے ذوق جمال ختم ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی کی روایات پر اوس پڑ جاتی ہے۔ شہراتی زندگی میں آمدنی کی کمی اور اس سے بڑھ کر شرح اُجرت کی اونچ نیچ کی وجہ سے لوگوں میں یاس و ناامیدی، پست ہمتی نفرت اور بغض و حسد کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں بدکاری، قمار بازی اور جرائم پیشگی کی لعنتوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔

شہروں میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی ضرورت

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان ایک زراعت پیشہ اور گاؤں کا دیس ہے، وہاں

کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی اسکیم شروع کرنے کی سخت ضرورت ہے

سوشل ایجوکیشن کی اہمیت

شہراتی علاقوں میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا جو بھی پروگرام شروع کیا جائیگا اُس میں سوشل ایجوکیشن کی جگہ ایک طریق کار اور ایک وسیلے کی حیثیت سے بہت اہم ہوگی۔ ہم نے اپنے تعلیمی پروگراموں میں سماجی تعلیم کی ایک بنیادی حیثیت تسلیم کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں ابتک جو کچھ ہوا ہے وہ ابتدائی مراحل سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے اور نہ سماجی تعلیم کے اصول و منہاج پوری طرح واضح ہوئے ہیں۔ سماجی ارتقا میں اس کا کیا مقام ہے اور اس کا کیا دائرہ عمل ہے اس کے بارے میں بھی ابھی پوری صفائی نہیں ہوئی ہے۔ اس باب میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ ایک ان لوگوں کا نقطۂ نظر جو سماجی تعلیم کے پروگرام کو خواندگی، صحت اور تعلیم تک محدود سمجھتے ہیں، اور دوسرے خیال کے ماننے والے سماجی تعلیم کے ایک وسیع مفہوم کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک سماجی تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جو سماجی ارتقا میں ایک زبردست قوت کا حامل ہے۔ سماجی تعلیم نہ صرف یہ کہ اُس کمی کو پورا کرتی ہے، جو اسکول کی باقاعدہ تعلیم میں رہ جاتی ہے۔ بلکہ یہ عوام کے دل و دماغ اور ان کے عادات و اطوار میں تبدیلی پیدا کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے سماجی تعلیم صرف خواندگی یا مختلف مظاہروں اور دکھا کر تعلیم دینے والے ذریعوں کے سہارے نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ وہ تو ایک مسلسل اور متواتر عمل ہے جو ساری زندگی جاری رہتا ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ سماجی تعلیم کا معلم اپنی زندگی کو بستی کی زندگی اور اسکے مسئلوں میں مُدغم اور اس سے اپنے آپ کو بخوبی ہم آہنگ کرلے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لئے گہری نظر، لامحدود صلاحیت اور عوام کی زندگی کا گہرا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ سماجی تعلیم سے عوام میں ایک نئی قوت پیدا ہوتی ہے، جس سے آدمی اپنی زندگی کے مسائل سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کام ۳۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ پانے والے پرائمری اسکول کے استادوں سے نہیں لیا جا سکتا جو دن بھر کے تھکا دینے والے کام کے بعد رات کو نشستم برخاستم چند بالغ طالب علموں کو جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں پرائمری کلاس کے لڑکوں کی طرح پڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کام

ہندوستان کی شہری بستیوں کا پس منظر ابھی تک بہت کچھ دیہاتی ہے۔ شہروں میں کئی پشت گذر جانے کے بعد بھی دھرم، ذات پات، زبان اور تہذیبی روایات کا اثر ان بستیوں پر جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہراتی بستیوں کے اندر ایسے محرکات موجود ہیں جو اُسے چھوٹی چھوٹی اور تعاونی بستیوں کی شکل دینے میں مدد دے سکتے اور بڑی اور پیچیدہ بستیوں میں صحت مند سماجیت کی ضمانت کر سکتے ہیں۔ ان بڑی اور پیچیدہ بستیوں میں باہمی کش مکش اور مقابلے کی زندگی کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ بستی کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن میں نیک نیتی اور اشتراک و تعاون کے جذبے کی کارفرمائی ہو۔ جو بستی اپنے اندر اتحاد اور یگانگت کا جذبہ رکھتی ہے، اس کے اراکین و افراد بستی کی بہبود کے لئے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ لہذا کوشش کرکے ایسی چھوٹی چھوٹی بستیوں کی تشکیل کرنی چاہئے جن میں اتحاد خیال اور یگانگت کا جذبہ ہو۔ یہ اکائیاں بہت بڑی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک وسیع جمہوری سماج کا جزو ہوں گی اگر یہ اکائیاں نسبتاً زیادہ بڑی ہوں گی تو ان سے بستی کی تنظیم سے حاصل ہونے والے تمام فائدے حاصل نہیں ہوں گے۔ اُن میں بستی کی تنظیم سے متعلق مختلف خدمات تو فراہم کی جاسکیں گی مگر اُن کے اراکین و افراد اپنے اندر اتحاد اور یگانگت نہیں محسوس کر سکیں گے، جو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں کا خاص مقصد ہوتا ہے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے بنیادی اصول کے مطابق بستیوں کو اپنی سماجی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے متعلقہ سرگرمیوں اور پروگراموں کو خود اپنی سوجھ بوجھ اور اپنی تحریک پر چلانا چاہئے۔ ان کی اگوائی خود انہی کے اندر سے ابھرنی چاہیے اور ان کاموں کے لئے وسائل بھی جہاں تک ممکن ہو، خود انہی کو فراہم کرنا چاہئے۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو ہمارے شہروں میں جو بستیاں بستی ہیں، ان میں اپنے بہبود کے کام خود چلانے کی سکت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سماجی اور اقتصادی حالت کچھ ایسی ہے کہ شہروں میں انفرادیت کا رجحان خود غرضی کا رنگ اختیار کرکے دن بدن زور پکڑتا جا رہا ہے پھر شہروں میں جو بستیاں یا جو گروہ بہت پسماندہ ہیں، ان کی اصلاح و ترقی کی ضرورتوں کے پیش نظر شہروں میں

سماجی تعلیم کا کام پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس کو دلکش بنا کر تعلیم دینے والے ذرائع اور نشر و اشاعت کی سہولتوں نے بہت مدد دی ہے۔ سینما، ریڈیو اور اجتماعی پروگراموں کے ذریعے افراد کو اُن مشکل اور دشوار طریقوں سے واقف کرایا جا سکتا ہے جن کی مدد سے وہ زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بحث و مباحثے، مختلف قسم کے مقابلے اور بات چیت کی مجلسیں بستی کو بستی اور سارے ملک کے مسائل سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ غرض سماجی تعلیم کے اس تصور کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ شہروں میں چلائے جانے والے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں ایک غیر معمولی وسیلہ ثابت ہو گی۔

(سہ ماہی "سماج" کاشی سے ماخوذ)

کے لئے ایک ایسے عملے کی ضرورت ہے۔ جو اس مشن سے عقیدت کے ساتھ سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہو، اور پوری طرح تربیت یافتہ ہو۔

کیا سوشل ایجوکیشن کے لئے ایک علیحدہ تنظیم کی ضرورت ہے؟

میرے خیال میں سوشل ایجوکیشن کے لئے الگ سے کسی کمیٹی، ادارے یا ایجنسی کے قیام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شہری علاقوں میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام شروع کرنے کے لئے جو تنظیم بنائی جائے۔ اسی کے تحت سوشل ایجوکیشن کا پروگرام بھی چلنا چاہئے۔ سوشل ایجوکیشن کے کارکن اور خاص طور سے سوشل ایجوکیشن کے آرگنائزر اگر بستی ہی کے لوگ ہوں تو اچھا ہے۔ یہ کارکن لوگوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کریں گے۔ ان کاموں کی فہرست میں، خاندانی تعلقات کی خوش گواری حفظان صحت، فن خانہ داری، تفریح اور کھیل کود، عورتوں کی تعلیم اور لوگوں کے اندر شہری فرض داری کا احساس پیدا کرنا سبھی شامل ہوں گے۔

سوشل ایجوکیشن کے پروگرام

سماجی تعلیم کے پروگراموں میں حفظان صحت وغیرہ کی تعلیم بھی شامل کی جاتی ہے۔ یہ مزدوروں کی کارکردگی کو بڑھا کر ان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا کام بالغوں کو پڑھانا لکھانا بھی ہے۔ سماجی تعلیم جنیاتی اور ازدواجی زندگی کے مسائل کو حل کر کے زندگی کو زیادہ خوشگوار بنانے میں مدد دیتی ہے۔ غرض دل بہلاؤ اور تفریحی پروگراموں کا تعلق تو سوشل ایجوکیشن سے ہے ہی اس کے علاوہ وہ پروگرام بھی اس کے احاطہ عمل میں آتے ہیں جنہیں ہم تہذیبی سرگرمیاں کہتے ہیں اور جن سے افراد کو اظہار نفس کا موقع ملتا ہے جو لوگوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان کے ذوق کی تکمیل کا سامان کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ سماجی تعلیم لوگوں کو شہری ذمہ داری کے لئے تیار کرتی ہے اور ان میں اجتماعی شعور بیدار کر کے بستی اور سارے ملک کی زندگی میں کھل کر حصہ لینے کے قابل بناتی ہے۔

یہ بستی کی ایسوسی ایشن افراد کو تو اپنا ممبر بناتی ہی ہے۔ بستی کی دوسری جماعتیں بھی اس کی ممبر ہوتی ہیں، بستی کی جتنی جماعتیں چاہیں، اس سے منسلک ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کھیل کود کے کلب، گرجاگھر، خیراتی کام کرنے والی انجمن، مزدور سبھائیں، وغیرہ، غرض وہ تمام جماعتیں جن کے اہتمام میں لوگ کسی نہ کسی دلچسپی یا شوق کی تسکین کی غرض سے ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کی انتظامی مجلس جو کمیونٹی سنٹر کی بھی انتظامی مجلس ہوتی ہے، اس میں ان دونوں اقسام کے ممبروں کی نمائندگی ہوتی ہے جن میں سے بعض کا انتخاب شخصی اراکین کرتے ہیں اور بعض کا ملحقہ جماعتیں۔

اس ایسوسی ایشن کی طرف سے جو کام ہوتا ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے اور جن باتوں پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے، اس کے پیش نظر یا تو سماج سیوا کا کام ہے یا تعلیم کا۔ سماج سیوا اس اعتبار سے کہ ایسوسی ایشن کا وجود ہی سماج کی خدمت کے لئے عمل میں آیا ہے اور یہ جو کچھ بھی کرے گی، وہ سماج کے افراد کے بھلے کے لئے ہوگا —— مثال کے طور پر اس کے اہتمام میں شہریوں کو صلاح و مشورہ دینے کا دفتر کام کر رہا ہو تو وہ بھی، یا (سماج سیوا کے محدود مفہوم کے مطابق) مظلوم اور مفلس لوگوں کی امداد کا کوئی فنڈ قائم ہو، تو وہ بھی، ماں باپ بننے کی تیاری کرنے کے لئے کوئی شعبہ قائم ہو یا صحت مند تفریح فراہم کرنے کی کوئی ایجنسی کام کر رہی ہو تو وہ بھی، غرض یہ سب سماج کے بھلے کے لئے کام کر رہے ہوں گے۔ اسی طرح ایسوسی ایشن کا کام تعلیم کا کام ہے —— اچھی سے اچھی زندگی گذارنے کی تعلیم، چاہے وہ بچوں کی نفسیات کی کلاس کی شکل میں ہو، چاہے تربیت جسمانی اور جوڑیوں کے ناچ کی کلاس کی شکل میں یا مختلف شوق (ہابی) رکھنے والے بچوں کے گروپ کی شکل میں۔ بستی کے لئے ڈاک اور تار کے بہتر انتظامات کا مطالبہ کرنے کی غرض سے بستی کی اصل ضروریات کا اندازہ کرنے والی کمیٹی کی مصروفیتیں ہوں یا سنٹر کا نظم و نسق چلانے کے پردے میں جمہوریت کی عملی مشق کرنے والے گروہ کے بحث مباحثے اور تبادلۂ خیالات یہ سب تعلیم کا کام ہے۔

بستی کی یہ ایسوسی ایشن بستی کی خدمت ہر ایسے طریقے پر کرنے کا اہتمام کرتی ہے جس کی ایک فضا کا

انگلستان کے کمیونٹی سنٹر

اس شمارے میں ہم "تعلیم بالغان کے منصب اور نظام تعلیم میں اس کے مقام" کے باب میں انگلستان کے ایک محقق رابرٹ پی ارس کے خیالات پر مبنی ایک مختصر سا مضمون شریک کر رہے ہیں۔ انگلستان کے کمیونٹی سنٹر تعلیم بالغان کے اس تصور کے پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ اس لئے جہاں مذکورہ بالا نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے یہ مضمون مثال کا کام دے گا وہاں اسی کی روشنی میں ہمیں اپنے کمیونٹی سنٹروں کے کام اور افادیت کا اندازہ کرنے میں بھی بڑی مدد ملیگی۔

—— ایڈیٹر

کمیونٹی سنٹر، جیساکہ انگلستان میں ہم لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں، ایک عمارت سے مراد ہے، جہاں مختلف طریقوں سے بستی کی خدمت کا کام ہوتا ہے۔ وہ بستی کا کلب بھی ہے، سماجی خدمات کا مرکز بھی ہے اور مختلف قسم کی جماعتوں کی جلسہ گاہ بھی ہے، غرض وہ بستی کا دل ہے جہاں سے تعلیم کے چشمے پھوٹ کر پوری بستی میں پہنچتے ہیں۔ کسی بستی کو پہچاننا ہو تو اس کے کمیونٹی سنٹر کو دیکھ لیجئے، بستی کی نوعیت کا پورا پورا علم ہو جائے گا۔ اس کا انتظام و انصرام بستی کی ایک ایسوسی ایشن کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس عمارت کو گھر کی شکل دے دے — بستی کے تمام گھروں کا مشترک گھر، بستی کی زندگی کا مجسمہ،

پروگرام کے سلسلے میں انھیں یہ ٹکٹ انعام میں دئے جا سکتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں اجنبی آدمیوں سے دلچسپی ہوتی ہے، کچھ نہیں تو اسی مطلب سے کہ گھر پر بیٹھے مکھیاں مارنے سے لوگوں سے ملنا جلنا اور تعلقات بڑھانا اچھا ہے۔ کمیونٹی سنٹر جتنے ہیں قریب قریب سب اپنے اپنے یہاں طرح طرح کی تقریبیں اور سرگرمیاں منظم کرتے ہیں جیسے رقص و سرود کی مجلسیں، ڈرامے، مشاعرے، دعوتیں وغیرہ، اور ان تقریبوں میں بیشتر رضا کار کارکن کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تقریب میں ہاتھ بٹانے کے لئے نئے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نووارد چھوٹے چھوٹے کام سے شروع کرکے بڑے بڑے ذمّے داری کے کاموں پر لگ سکتے ہیں، مثلاً جب وہ پہلے پہل آئیں گے تو شاید انھیں گیٹ کے اوپر داخلے کی فیس وصول کرنے پر لگایا جائے، اس کے بعد دوسری منزل میں ممکن ہے وہ میزبان کا کردار ادا کریں اور اس حیثیت سے آنے والے مہمانوں کا استقبال کریں، اور پھر وہی لوگ تقریب منعقد کرنے والی ذمے دار کمیٹی کے رکن بن کر کام کرسکتے ہیں۔ غرض ایک بار جب کوئی شخص کمیونٹی سنٹر میں ذمے داری کے کام انجام دینے لگ جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ نئی نئی ملاقاتوں اور نئے خیالات کی راہ پر چل پڑا ہے اور اسی راستے پر چل وہ کمیونٹی سنٹر کی زندگی سے آگے بڑھ کر شہر یا پورے ملک کی زندگی میں داخل ہوسکتا ہے۔

جو لوگ پہلے پہلے ذمے داری کا کوئی کام ہاتھ میں لیں گے ان کی ملاقات سنٹر سے متعلق دوسرے لوگوں سے ہوگی جو پہلے سے ذمے داری کے کام کرچکے ہوتے ہیں یا کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسرے لوگوں کے کاموں اور صلاحیتوں کا کما حقہٗ اندازہ لگانے کا موقع ملتا ہے اور اس چیز سے خود اشخاص سے دلچسپی اور وابستگی پیدا ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہوسکتا ہے کہ ناچ کے پروگرام میں جو شخص گیٹ کے اوپر ٹکٹ کی چیکنگ پر لگا ہے، وہ یہ دیکھ کر کہ لوگ شرح ٹکٹ کے زیادہ ہونے کی شکایت کررہے ہیں، یہ محسوس کرے کہ ٹکٹ کی شرح واقعی زیادہ ہے اور اس احساس کی بنا پر تجویز پیش کرے کہ شرح ٹکٹ میں کمی ہونی چاہئے اس سلسلے میں اسے معلوم ہوگا کہ فائنانس کمیٹی کے ماتحت ایک سوشل کمیٹی ہے جس نے سنٹر کی عمارت کی مرمت

جماعت سے امید کی جاسکتی ہے، البتہ پارٹی کی سیاست اور فرقہ پرستانہ مذاہب کے معاملے میں یہ بستی کی کوئی خدمت نہیں کرتی اور ان سے اپنے آپ کو الگ رکھتی ہے۔ یوں یہ مقامی حکومت سے بستی کے لئے نرسری اسکول کھولنے کے لئے یا سواری گاڑیوں کا انتظام کرنے والی کمپنی یا جماعت سے بس سروس کا انتظام بہتر کرنے کے لئے درخواست کرسکتی ہے، لڑکوں کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق دلا سکتی ہے، یا لڑکیوں کے لئے بیلے ڈانس کی تربیت گاہ کا انتظام کرسکتی ہے، بالغوں کے لئے مرغی خانہ کلب یا ڈراما سوسائٹی قائم کرسکتی ہے اور نوخیز لڑکوں کا فٹ بال کلب بنا سکتی ہے۔ غرض اسی طرح کے وہ سب کام کرسکتی ہے جو بستی کی زندگی میں بحالی اور بہتری کا موجب ہوسکتے ہوں۔

بالغوں کی دلچسپی کی سرگرمیاں

یہاں ہم صرف انہی سرگرمیوں کا ذکر کریں گے جو کمیونٹی سنٹر کی طرف سے بالغوں کے لئے منظم کی جاتی ہیں، اور اس جائزے میں ان کے اوپر تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کریں گے۔ بالغوں کی تعلیم میں بہ نسبت کم عمر طلبار کے جن کے ذہنوں میں ابھی پختگی نہیں آئی ہوتی ہے، یہ بڑی اہم بات ہے کہ کام اس جگہ سے شروع کیا جائے جہاں وہ (بالغ) پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے موجودہ مفاد اور دلچسپیوں سے۔ کام شروع یہاں سے کیا جائے اور نظر اس بات پر رکھی جائے کہ ان مفاد اور دلچسپیوں میں کس طرح وسعت پیدا کی جائے اور انہیں کس طرح استعمال کیا جائے کہ اس سے ان کی زندگی میں بحالی اور بہتری پیدا ہو، اس کے بعد اگلا قدم یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان دلچسپیوں کی روشنی میں نئی کون سی دلچسپیاں ہیں جو امکاناً پیدا کی جاسکتی ہیں۔ بعض اوقات لوگوں کو اس بات کے لئے بھی آمادہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی باتوں کا تجربہ کریں جو ان کے لئے بالکل نئی اور اجنبی ہیں۔ اس قسم کے تجربے سے انسان کے ذہن میں بین الاقوامیت کا شعور پیدا ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر بستی کے آس پاس یا بستی ہی کے اندر موسیقی کے کسی ایسے طرز کا پروگرام ہو رہا ہے جس سے لوگ قطعاً ناواقف ہیں اور اس سے ان کے کان نامانوس ہیں۔ کمیونٹی سنٹر کا مہتمم کچھ لوگوں کو تیار کرسکتا ہے کہ وہ اس پروگرام کو دیکھنے جائیں۔ مگر اس قسم کی نامانوس سرگرمیوں کے لئے کوئی پیسہ نہیں لگانا اس ذہنی افتاد کا پاس بھی رکھنا چاہئے اور جو لوگ آمادہ ہوں ان کے لئے فری پاس حاصل کئے جاسکتے ہیں، یا کسی دوسرے انعامی

ہوتا ہے ہر اُس فیصلے پر متفق ہو جاتے ہیں جن کا اُن حقائق کے زیر اثر تقاضا ہوتا ہے۔ اس طرح اُسے یہ سبق ملتا ہے کہ جمہوریت کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اقلیت کے نقطۂ نظر کو پس پشت ڈال اکثریت اپنے فیصلے عاید کرے بلکہ وہ ایک ایسا طریقہ کار ہے جس میں حقائق وواقعات کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے، ہر شخص جس بات کو صحیح سمجھتا ہے، اُسے پیش کرتا ہے اور پھر سب مل کر جو فیصلہ کرتے ہیں، اُسے تسلیم کیا جاتا ہے۔

کمیونٹی سنٹر کے توسط سے بستی والوں کو جو تعلیم ملتی ہے اُس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ ایسوسی ایشن مختلف قسم کی سرگرمیاں منظم کرنے اور آپس کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنے والی جماعت ہی نہیں ہے بلکہ اس کی عمارت اور اس سے متعلق دوسرے امور مثلاً اُسے گرم اور صاف ستھرا رکھنا، اور اس کی دیکھ بھال کرنا بھی اس کے فرائض کی فہرست میں شامل ہے۔ ذمے داری کا یہ پہلو جو بیشتر اوقات اختلافات کا سبب ثابت ہوتا ہے، اس سے انسان حقائق وواقعات کی ایک مختلف شکل سے دوچار ہوتا ہے اور اس سے ایک مختلف قسم کے ضبط ونظم (ڈسپلن) کی تربیت ہوتی ہے جو اُسے بہر حال ملنی چاہئے۔ لوگوں کو اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اینٹ، پلستر، اور رنگ وروغن کی کیا حقیقت ہے، ان کے استعمال کا کیا طریقہ ہے، یہ چیزیں کس قیمت کی آتی ہیں، ——— غرض ایسی باتیں جن کی عملی واقفیت اور کسی طرح ممکن نہ ہوتی۔

میل ملاقات کے ذریعے تعلیم

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کمیونٹی سنٹر کی ایسوسی ایشن کو عمارت حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو ممبروں کو آپ اپنے ہاتھوں عمارت بنانی پڑتی ہے۔ اس جدوجہد میں وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ راز سیکھ جاتے ہیں کہ کسی مشترک مفاد کے لئے مل کر محنت کرنا باہم اخوت و یگانگت اور افہام وتفہیم کی عادت پیدا کرنے کا اتنا زبردست ذریعہ ہے کہ اور کوئی دوسرا ذریعہ اس کے مقابلے پر نہیں رکھا جا سکتا۔

وغیرہ کے لئے ایک متعین رقم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ "دربان" اپنے احساسات ظاہر کرتا ہے کہ اگر شرح ٹکٹ کم ہوتی تو لوگ زیادہ تعداد میں آتے اور اس طرح اب کی بہ نسبت زیادہ آمدنی ہو سکتی تھی اب ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس "دربان" سے سوشل کمیٹی، اور اس کے بعد فائنس کمیٹی اور آخرالامر خود ایسوسی ایشن کی انتظامی کمیٹی کا رکن بننے کی درخواست کی جائے۔

تعلیم ذمّے داری کی راہ سے

کسی جماعت کی سماجی سرگرمیوں کے بالعموم دو مقصد ہوتے ہیں: تفریح کا سامان بہم پہنچانا اور رقم حاصل کرنا۔ ان میں بعض سرگرمیاں جیسے ناچ گانے اور دعوت کا پروگرام ہفتے میں یا مہینے میں ایک بار ہوتا ہے اور بعض جیسے سرکس یا کارنیوال سال میں ایک مرتبہ۔ ان سالانہ تقریبوں کے لئے بہت زیادہ پلاننگ اور تعاون و اشتراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اس حیثیت سے ان کی بڑی تعلیمی قیمت ہوتی ہے

بستیوں کی اس قسم کی جماعتیں جمہوری جماعتیں ہوتی ہیں۔ اس حیثیت سے ان جماعتوں کے معاملات اور سرگرمیوں میں شرکت کرنے سے جمہوریت اور جمہوریت کی مشکلات کا تجربہ اور ان مشکلات کو حل کرنے کی عملی تربیت ہوتی ہے۔ کمیونٹی سنٹر کی ایسوسی ایشن کا یہ اہم ترین تعلیمی منصب ہے۔ جب وہ "دربان"، کسی کمیٹی کا رکن بننے کے بعد اس کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لئے آتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اپنے نقطے کے علاوہ بہت سے اور نقطۂ نظر بھی ہیں جنھیں اب سے پہلے وہ کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اسی طرح بیشمار حقائق ایسے ہیں جنھیں نہ اس نے کبھی سوچا تھا اور نہ سمجھا تھا۔ یہی نہیں جس بات کو وہ سمجھتا تھا کہ چٹکی بجاتے ان کے بارے میں فیصلہ ہو جائے گا، دراصل اُس پر غور و خوض کرنے اور حقائق و آرا کی توضیح و تشریح میں گھنٹوں صرف ہو سکتے ہیں۔

اگر کمیٹی میں جمہوریت کے اصولوں اور طریقوں کا پورا پورا استعمال ہو رہا ہے تو وہ دیکھے گا کہ کمیٹی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زیر بحث صورت حال پر اثر ڈالنے والے جو حقائق ہیں ان پر سب کا اتفاق ہو جائے وہ یہ بھی محسوس کرے گا کہ جب یہ منزل طے ہو جاتی ہے تو معقولیت پسند لوگ جن کے سامنے مشترک مفاد

ارادہ ہو، وہاں کی ایسی ہی (کمیونٹی ایسوسی ایشن جیسی) کسی جماعت سے سیاحوں کے تبادلے کا ایک معاہدہ ہو جائے۔ اس طرح کی سیاحت میں تعلیمی فائدے بہت ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ایک دوسرے کے یہاں کی تنظیم کو، ان کے خیالات و افکار کو جن کی تھوڑی سی واقفیت پہلے سے کرا دی گئی ہو، اور ان کی ندگی میں عملاً شریک ہو کر ان کی روایات و اقدار کو سمجھنے اور اُن سے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے مکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر سیاحوں کے اس تبادلے کی منصوبہ بندی کافی پہلے کر لی جائے تو اس سے بہ امکان بھی ہے کہ لوگوں میں اس ملک کی باضابطہ طور پر زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے اور اس کے ئے باقاعدہ کلاس کھولنے کی ضرورت محسوس ہو۔

قاعدہ کلاسیں اور کلب

عورتوں کو اپنے گھر سے بہت زیادہ لگاؤ ہوتا ہے، اُن میں اور اسی سلسلے میں اور لوگوں میں ما سے زیادہ وسیع اور مختلف النوع دلچسپیاں پیدا کرنے کے لئے اس چیز کو نقطۂ آغاز بنایا جا سکتا ۔اس سلسلے میں کام کے تین میدان آزمائے گئے ہیں، بین الاقوامی، تاریخی اور فنی۔ بین الاقوامی میدان ذکر پہلے آ چکا ہے۔ تاریخی میدان میں بھی کام کا یہی اصول اپنایا جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ ، الذکر میں بحث مقام سے ہوتی ہے، اور یہاں تعلق زمانے سے ہوتا ہے، سوائے اس بات کے ۲۰۰ سو سال پہلے کی کوئی عورت تو یہ بتانے کے لئے نہیں آ سکتی کہ اُس زمانے کے اطوار و آداب کیسے ۔اس قسم کی معلومات کا تعلق آنکھ اور کان سے زیادہ دماغ سے ہوتا ہے۔ تاریخی معلومات ہر قسم کی ئی معلومات حاصل کرنے والے گروپ کی خواہش ہو، حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کوئی گروپ یہ معلوم کرنا ہے گا کہ اب سے سو دو سو یا ہزار یا پانچسو سال پہلے انگلستان کے مکانات کس طرح کے ہوتے تھے، یہ جاننا چاہے گا کہ اس زمانے کے لوگ کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے اور کس قسم کے کھیل کھیلتے تھے ،راسی طرح کی اور بہت سی باتیں۔ اس کے لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان باتوں کا ف رکھنے والے کسی مقرر یا مقالہ نگار کی خدمات حاصل کریں مگر اس انتخاب میں یہ خیال رکھنا ہئے کہ موضوع کے کسی ماہر کے بجائے جس میں اپنی بات سے لوگوں کو متاثر کرنے کی اہلیت نہ ہو،

بعض ایسوسی ایشنوں کو خوش قسمتی سے اپنے سنٹروں کی عمارت بنانے میں بین الاقوامی امدادی دستوں کی امداد حاصل رہی ہے۔ مثلاً ایک بین الاقوامی امدادی دستے کے رضا کاروں نے ۱۹۵۴ء کے ایام گرما میں نوورنز پارک کے کیمونٹی سنٹر کی عمارت بنانے میں مدد دی تھی ان رضا کاروں میں آدھے کے قریب تو انگریزی تھے مگر باقی میں کچھ فنڈلینڈ کے رہنے والے تھے، کچھ سوڈان کے، کچھ سوئٹزرلینڈ کے، کچھ اسرائیل کے، کچھ امریکہ اور کچھ میکسیکو کے۔ ان میں سے بیشتر بیس بائیس سال کے نوجوان تھے یہ لوگ روزانہ آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرتے تھے اور نوورنز پارک کے رہنے والوں کے ساتھ دعوتوں، سیروتفریح اور سوانگ وغیرہ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ قیام کے لئے خیمے لگے تھے مگر بعض اوقات دستے کے ممبر آس پاس کے گھروں پر مہمان ہوتے تھے اور انہی کے یہاں قیام کرتے تھے۔ دونوں حالتوں میں نوورنز پارک کی ایسوسی ایشن کے ممبروں کو یہی نہیں کہ ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا موقع ملا اور ان کے سنٹر کی عمارت جلد تیار ہوگئی جو اس کے علاوہ دوسری طرح ممکن نہیں تھا۔ بلکہ یہ فائدہ بھی ہوا کہ انھیں اس بین الاقوامی امدادی دستے کے رضا کاروں سے متعارف ہونے اور دوسرے ملکوں کے عادات و اطوار سے تھوڑا بہت واقف ہونے کا موقع مل گیا۔

مگر ان بین الاقوامی امدادی دستوں کے نزدیک بالعموم یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کے توسط سے لوگ دوسری قومیتوں کے عادات و اطوار سے واقفیت حاصل کریں۔ البتہ عورتیں ضرور یہ جاننا چاہتی ہیں کہ دوسرے ملکوں کی عورتیں اپنے گھروں کا کس طرح انتظام کرتی ہیں اور گھر والوں کو کس طرح کھلاتی پلاتی ہیں مگر اس مقصد کے لئے اگر زیر بحث ملک کی کسی عورت کی اس موضوع پر تقریر ہو جائے تو وہ زیادہ بہتر رہتی ہے۔

اس مقصد کے لئے بالخصوص ہمارے براعظمی ہمسایوں (یورپ کے ملکوں) کے معاملہ میں یہ زیادہ اچھا رہتا ہے کہ لوگوں کو ان ملکوں کی سیاست کا شوق دلایا جائے۔ اس سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ جس ملک کو سمجھنے کا

کلاسوں کی شکلوں میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

تعلیم بالغان کی سعی اور باضابطہ شکلوں کا بیشتر ایسوسی ایشنوں میں بہت رواج ہے جنکا انتظام یہ ایسوسی ایشنیں یا تو خود کرتی ہیں یا اس سلسلے میں دوسری جماعتوں کی مدد کرتی ہیں۔ بعض مضامین کی تعلیم کا ذکر جن کے لئے کلاسیں چلائی جاتی ہیں جیسے علم خانہ داری کی مختلف شاخیں اور دوسرے گھریلو دھندے پہلے آچکا ہے۔ انکے علاوہ بعض دوسرے مضامین جیسے تاریخ، معاشیات، نفسیات، ادبیات، آرٹ اور سائنس، انکے لئے بھی کلاسیں منظم کی جاتی ہیں۔ ان مضامین کی کلاسوں کی تحریک لوگوں کو دو طرح سے ہوتی ہے۔ یا تو کسی مضمون پر بے ضابطہ طور پر کبھی کوئی تقریر یا مباحثہ ہوتا ہے، اس سے لوگوں کو اس مضمون میں مرتب معلومات کا شوق ہوتا ہے یا بعض اوقات کچھ لوگ پہلے سے یہ شوق دل میں لئے اپنے سنٹر میں آتے ہیں اور ان کی پہلی فرمائش یہ ہوتی ہے کہ سنٹر ان کے لئے اس علم کی کلاس کا انتظام کرے۔ ان مضامین کے لئے کلاس کے انتظام کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسوسی ایشن کلاس کا بندوبست براہ راست، مقامی تعلیمی محکمہ یا یونیورسٹی سے مل کر کرتی ہے۔ کبھی وہ ورکرز ایجوکیشنل سے اس قسم کی کلاس کھولنے کی فرمائش کرتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن یا مقامی تعلیمی محکمہ یا یونیورسٹی ایسوسی ایشن سے فرمائش کرتی ہے کہ وہ اس کلاس کے لئے جگہ کا بندوبست کر دے یا ایسی آسانیاں فراہم کر دے کہ کلاس یا لیکچروں کا سلسلہ بخوبی چلتا رہے۔

بہت سے سنٹروں میں لوگوں کو اپنی صحت بنانے سے دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ٹولیوں میں عام جسمانی تربیت حاصل کرنے یا وزن اٹھانے یا گھونسہ بازی جیسے کسی مخصوص ورزشی ہنر کی مشق بہم پہنچانے کی غرض سے سنٹر میں آتے ہیں۔ یہ دلچسپیاں کلبوں کی شکل میں منظم کی جاتی ہیں۔ یہی دستور بعض کھیلوں کی تنظیم کے بارے میں بھی رہتا ہے جو بستی کی دوسری ایسوسی ایشنوں کے ممبر کھیلتے ہیں۔ ان کھیلوں کے کلب بنانے کا خاص مقصد تو چاہے ان کھیلوں کی اپنی جاذبیت ہی ہو مگر ان کا تعلیمی پہلو بھی ہوتا ہے بالخصوص بیڈمنٹن، پنگ پانگ، فٹ بال اور کرکٹ میں اس لئے کہ ان کھیلوں میں جسمانی مہارت حاصل کرنے کا پہلو بھی ہوتا ہے اور وہ نظم و ضبط کا تقاضا بھی کرتے ہیں جس کے سبب سے ممبروں کو ٹیم یا گروپ کے

مقرر یا مقالہ نگار ایسا ہو جو موضوع سے متعلق لوگوں میں وہی دلچسپی اور لگاؤ پیدا کر دے جو خود اُسے ہے

فنی میدانوں میں عورتوں کو سب سے زیادہ جس فن سے دلچسپی لیتے پایا گیا ہے وہ ہے لباس کی تراش خراش اور سلائی جو وہ اکثر اوقات مقامی تعلیمی محکمے کی طرف سے بھیجی ہوئی کسی استانی سے سیکھتی تھیں جنگ سے پہلے اس فن کے اوپر بہت زور تھا، اس لئے کہ اس وقت زیادہ سے زیادہ کفایت شعاری کی طرف لوگوں کی توجہ تھی۔ جنگ کے زمانے میں جب کپڑے کا ٹوٹا پڑ گیا تھا، اس ہنر کی طرف خاص طور مرمت اور پرانے کپڑوں میں کچھ تبدیلی کر کے اُسے زیادہ مدت تک کے لئے قابل استعمال بنانے کے فن کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ لباس سازی کے بعد بعض سنٹروں میں کھانا پکانے کا فن مقبول رہا ہے جو لباس سازی کی طرح باقاعدہ کلاس چلا کر سکھایا جاتا رہا ہے یا گیس بورڈ یا بجلی بورڈ کی طرف سے ہونے والے مظاہروں کی شکل میں۔ کہیں کہیں آٹا بنانے اور جوتوں کی مرمت کا ہنر بھی کافی مقبول رہا ہے۔

جوتے کی مرمت کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ مردوں کے کرنے کا کام ہے اور متعدد سنٹروں میں اس ہنر کے سکھانے کا انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ اس سے زیادہ تخلیقی کام لکڑی کے کام کے کارخانوں میں ہوا ہے اگرچہ بعض اوقات اس میدان میں بھی پُرانی چیزوں کی مرمت ہی کا ہنر سکھایا گیا ہے۔ کام کا پہلو خواہ کچھ ہی رہا ہو، پُرانی چیزوں کی مرمت یا نئی چیزیں بنانا، لوگوں کی تربیت اس بات میں کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کریں اپنے ہاتھ سے کریں۔ ان مضامین کے علاوہ سنٹروں میں مرغی خانہ کلب خرگوش خانہ کلب، اور باغبانی کی سوسائٹیوں کی تنظیم بھی ہوئی ہے جن میں مرد اور عورتیں اور بعض اوقات نوعمر لڑکے اور لڑکیاں بھی شریک ہوئی ہیں۔ یہ کلب اور سوسائٹیاں اس خیال سے بھی قائم ہوئی ہیں کہ کچھ لوگوں کے لئے جنھیں ان چیزوں کا شوق ہوتا ہے، اسکی تسکین کا سامان ہو جائے گا اور اس نیت سے بھی کہ لوگ جو ایک نہ ایک گھریلو دھندا کر کے اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ اس طرح ایک کام سیکھ لیں گے۔ جاندار چیزوں سے دلچسپی لامحدود تعلیمی امکانات کی حامل ہوتی ہے جو دو اشخاص کی گفتگو، بحث مباحثہ، نمائشوں اور مظاہروں سے لے کر سردی اور گرمی کے زمانے کی باضابطہ

جائے۔ تعلیم بالغان کے تجربے کے ساتھ اس افسر کے اندر یہ صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ وہ ایسے موقعے سے جس میں بالغوں کی تعلیم کا کسی شکل میں بھی پہلو نکلتا ہو، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔

(فنڈامنٹل اینڈ اڈلٹ ایجوکیشن جنوری ۱۹۵۴ء)

مفاد پر اپنے شخصی ذوق اور خواہشات کو قربان کرنے کی عملی مشق بہم پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔

ہر کمیونٹی سنٹر میں ناشتہ خانہ (کینٹین)، کامن روم یا بیٹھک (لاؤنج) بھی ضرور ہوتی ہے۔ یہ جگہیں ان لوگوں کی تسکین کا سامان کرتی ہیں جو سنٹر میں مختلف مقاصد کے پیش نظر دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے اور تعلقات قائم کرنے اور شاید اس راہ سے اپنی زندگی میں نئی نئی دلچسپیاں تلاش کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ اس غرض کے لئے یہ بڑی اچھی بات ہے اگر سنٹر میں ہمہ وقت کسی نہ کسی تہذیبی مضمون کی کلاس چل رہی ہو۔ اس سے یہ ہوگا کہ فرض کیجئے ایک نوجوان جو پنگ پانگ کھیلنے کی غرض سے آتا ہے اس کی مڈبھیڑ آرٹ یا موسیقی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والی لڑکی سے ہو جائے یا جو عورت لباس سازی کی کلاس میں آتی ہے اس کی ملاقات نفسیات کا مطالعہ کرنے والے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی سے ہو جائے۔

ایسی صورتوں میں جہاں لوگ ذہنی پختگی کے اعتبار سے اس منزل پر پہنچ گئے ہوتے ہیں، جب انھیں خود اپنی ضرورت کا پورا پورا علم ہوتا ہے، سنٹر کا کام صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے دفتر معلومات کا کام انجام دے اور انھیں بتا دیا کرے کہ جس چیز کی اُن کو ضرورت ہے، وہ انھیں فلاں جگہ سے حاصل ہوگی۔ یہ خدمت بعض اوقات سنٹر کے نوٹس بورڈ کے ذریعے انجام دی جاسکتی ہے اور کبھی اس کے رسالے میں اشتہار چھاپ کر کہ فلاں مقصد کے لئے فلاں فلاں اشخاص سے ملنا مفید ہوگا۔

تنظیم

ایسوسی ایشن کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے افسر اور مختلف کمیٹیاں برابر سوچتی رہیں کہ ان کے سنٹر کے تعلیمی امکانات کیا کیا ہو سکتے ہیں اور یہ جبھی ہوگا جب وہ سنٹر سے پوری پوری دلچسپی اور وابستگی رکھیں گے۔ مگر اس سے بھی حسب منشا کامیابی نہیں ہوگی۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر ان تعلیمی امکانات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہو تو ہونا یہ چاہئے کہ کسی ایسے شخص کو، وہ مرد ہو یا عورت، جسے تعلیم بالغان کی رسمی اور غیر رسمی دونوں شکلوں کا کچھ تجربہ ہو، پورے وقت کے تنخواہ دار افسر کے طور پر ملازم رکھ لیا

طالب علموں کے زندگی کے عملی تجربات کے اوپر اپنے دستور العمل کی بنیاد نہ رکھے۔ چنانچہ تعلیم کے ذمے داروں کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اسکول کی چہار دیواری سے باہر نکل کر کام کریں تاکہ اسکول کے باہر کی دنیا میں جو صحت مند اور تعلیمی نقطۂ نظر سے نتیجہ خیز تجربات حاصل ہوتے ہیں ان کو وسعت اور ترقی دی جا سکے۔ اس طرح مسئلہ بستی کی صرف تعلیم کا نہیں ہے بلکہ اسے وسیع تر معنی میں دیکھئے تو بستی کی ترقی و تعمیر کا ہے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے نیویارک کے بورڈ آف ایجوکیشن نے سرکاری (پبلک) اسکولوں کا تمام ساز و سامان ــــ پڑھائی کے کمرے، جلسہ گاہیں اور ہال، کارخانے، کھیل کے میدان اور جمنازیم وغیرہ تجربہ کرنے والوں کے سپرد کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس نے ان کے کام کے لئے معلم بھی فراہم کئے، اور اس طرح اسکول کے بعد کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ان میں ۱۲ سال تک کے لڑکوں لڑکیوں کے لئے تفریحی پروگرام، تیرہ سے اٹھارہ انیس سال کی عمر کے نوجوان لڑکوں لڑکیوں اور بالغوں کے لئے اسی طرح کے شام کے پروگرام اور بالغوں کے لئے شبینہ تعلیم کی کلاسیں شامل تھیں اس کے علاوہ بستی کی جو جماعت چاہتی، وہ ان سرکاری اسکولوں کی جلسہ گاہوں کو جلسوں تبادلۂ خیالات کی مجلسوں اور ناچ کی تقریبوں کے لئے مفت استعمال کر سکتی تھی۔ جلسہ گاہوں کے مفت استعمال کے ساتھ ان جماعتوں اور اشخاص کو ان فنون میں تربیت اور صلاح مشورہ بھی مفت مل سکتا تھا۔ مرکزی طور پر سب کے لئے جو سرگرمیاں منظم کی جاتی تھیں، یہاں تک کہ بالغوں کی کلاسیں بھی مفت یا بیشتر صورتوں میں مفت ہوتی تھیں۔ بچوں کے لئے تو جو سرگرمیاں منعقد کی جاتی تھیں، وہ یکسر مفت تھیں، البتہ نوجوانوں اور بالغوں کے لئے منظم کی جانے والی سرگرمیاں صرف سنٹر کے ممبروں کے لئے مفت ہوتی تھیں۔ ممبری کے لئے یہ قاعدہ بنا ہوا تھا کہ نیویارک کے ہائی اسکول کی منزل کا جو طالب علم چاہے ۲۵ سینٹ دے کر سنٹر کا ممبر بن سکتا تھا۔ اسی طرح نیویارک کا کوئی باشندہ جو ۱۸ سال سے اوپر کی عمر کا ہو، ایک ڈالر ادا کر کے ممبر بن سکتا تھا۔ اس طرح ۲۵ سینٹ یا ایک ڈالر ادا کر کے سنٹر کا ممبر اس بات کا حقدار ہو جاتا تھا کہ اس کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے اور جتنی کلاسوں میں اس کا مرضی ہو، داخلہ لے لے۔

بستی کی تعلیم میں نیویارک کا ایک تجربہ

شہر نیو یارک کے بورڈ آف ایجوکیشن کے اہتمام میں ۱۹۴۶ء میں ایک تعلیمی تجربہ کیا گیا تھا۔ اس تجربہ کا منشا یہ تھا کہ اس سے ایک ایسا ہمہ گیر اور جامع دستورالعمل ہاتھ آجائے جسے شہر نیویارک اور اس کے آس پاس کے رہنے والے اپنی بستی کے لوگوں کی تفریحی اور تہذیبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے استعمال کریں۔ یہ تجربہ سرکاری محکموں، نجی سنستھاؤں اور بستی کے لوگوں کی مشترک کوشش سے عمل میں آیا تھا اور اب اس کی حیثیت بستی کی تعلیم کی ایک طاقت ور تحریک کی ہو گئی ہے۔

بستی کی تعلیم کی اس تحریک کے پیچھے جو فلسفہ ہے اس کی بنیاد چند بنیادی تعلیمی تصورات کے اوپر رکھی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ پڑھائی (Schooling) اور تعلیم کے درمیان امتیاز کی ضرورت ہے۔ پڑھائی وہ عمل ہے جس سے اشخاص نوعمری کی منزل میں گذرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں تعلیم عمر بھر جاری رہنے والا ایک عمل ہے لیکن ابھی کہا تھا اگرچہ پڑھائی اور تعلیم کے مفہوموں میں فرق ہے، پڑھائی کو تعلیم سے الگ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جیسے اسکول کو بستی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بچہ بستی کے اُن تمام محرکات کی پیداوار ہوتا ہے جن میں اسکول، صرف ایک محرک کی حیثیت سے آتا ہے۔ گھر، گلی کوچے، تفریحی مقامات اور مراکز اور بالغوں کے "رنگ روپ" ان سب کا نہ صرف بچوں کو ڈھالنے میں بلکہ ان سے بڑی عمر والوں کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ہوتا ہے۔ اسکول جس کا اولین منصب نوجوانوں کی شخصیت کی نشوونما کرنا ہوتا ہے، اُس وقت تک اپنے منصب میں پورا نہیں اتر سکتا جب تک وہ

کے لئے اس نے جو طریقۂ کار بنایا، وہ حرکت میں آیا۔ کانفرنس ہوئی اور اس میں شرکت کرنے کے لئے جو لوگ ــــ عورتیں اور مرد، آئے، انہوں نے اس کانفرنس کے پیغام کو اپنی اپنی جماعتوں اور تنظیموں تک پہنچایا۔ اسکولوں کے بچوں میں چھپے ہوئے خطوط تقسیم کے گئے جنھیں وہ اپنے ساتھ اپنی بستی میں لئے لئے پھرے۔ والدین کی انجمنوں نے اپنے اپنے ممبروں کو اس بارے میں خطوط لکھے پادریوں نے منصوبے پر اپنے اپنے گرجا گھروں میں تبادلۂ خیالات کئے۔ نشر و اشاعت کے ان وسائل کے علاوہ منصوبہ کی اشاعت ریڈیو پر، سینما گھروں میں، اور پرچوں اور فولڈروں کے ذریعہ بھی کی گئی۔

اس کے بعد مجوزہ پروگرام کی تفصیل کے ساتھ ایک جوابی پوسٹ کارڈ کا مضمون بنایا گیا جس میں ایک کنارے پر یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ پروگرام میں بالغوں کے فرصت کے اوقات کے لئے کیا کیا کلاسیں منعقد کی جائیں گی اور یہ فرمائش کی گئی تھی کہ وہ اپنی پسند کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع دیں۔ اس جوابی پوسٹ کارڈ سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں نے بلا تاخیر لکھ دیا کہ انھیں کس طرح کی سرگرمیاں پسند ہیں۔ جب سب جگہ سے جوابی کارڈ وصول ہو گئے تو بستی کی کمیٹی کے ایک جلسے میں ان سب فرمائشوں کا تجزیہ کیا گیا اور لوگوں کی ضرورتوں اور خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے ایک پروگرام ترتیب دیا گیا۔

اس غرض سے کہ پروگرام کسی حالت میں لوگوں کی ضروریات و خواہشات سے دور نہ ہونے پائے بستی کی کمیٹیاں اور بالغ طالب علموں کی کاونسلیں جو ہر سنٹر میں بن جاتی ہیں، سنٹر کے ڈائرکٹر سے پابندی سے سلسلۂ ملاقات جاری رکھتی ہیں۔ یہ ٹولیاں (بستی کی کمیٹی اور بالغ طالب علموں کی کاونسل کے ممبر اور نمائندے) موجودہ کورسوں کے بارے میں بات چیت کرتی ہیں، نئے کورسوں کی تجویزیں پیش کرتی ہیں، اور مشورہ دیتی ہیں کہ نئے کورسوں کے لئے کون سے دن یا اوقات مناسب رہیں گے۔ وہ تقریبوں اور مجلسوں کے انعقاد میں امداد بھی دیتی ہیں، غرض یہ ڈائرکٹر کے لئے اپنے تعاون سے ایسا وسیلہ ثابت ہوتی ہیں جس سے اس کا تعلق لوگوں سے ہر وقت تازہ رہ سکے۔ "ان" جتنا گھروں"

اگر کوئی یہ سمجھنا چاہئے کہ تفریح اور تعلیم بالغان کے ایک وسیع اور ہمہ گیر نظام کی تخلیق کے معاملے میں بستی اور اسکول کے درمیان کس طرح اور کس حد تک اشتراک ہو سکتا ہے تو اس کے لئے یہ کیمونٹی سنٹر بہت اچھی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ ان کیمونٹی سنٹروں کا خاص مقصد بستی کی زندگی کی سطح میں بلندی پیدا کرنا ہے۔ اسی لئے یہ اصول رکھا گیا ہے کہ ان کے اہتمام میں جو کچھ بھی کیا جائے، وہ متعلقہ بستی کی ضرورتوں اور خواہشوں کے عین مطابق ہو۔ کوئی پروگرام بنی بنائی شکل میں ان کے اوپر عائد کرنے کے بجائے ہونا یہ چاہئے کہ اس کی ترتیب اور منصوبہ بندی میں وہ خود شریک ہوں اور وہ انھیں خوشی سے منظور ہو۔ امدادیں تو سہولتوں، کارکنوں، ساز و سامان اور ماہرانہ مشوروں کی شکل میں دوسروں کی دی ہوئی قبول کی جا سکتی ہیں، مگر جہاں تک بستی میں اتحاد و یک جہتی اور اس کی تعمیر نو کے عمل میں قوت محرکہ کے فراہم کرنے کا تعلق ہے، مقامی باشندوں کے اپنے جوش و خروش اور دلچسپی کے بدلے کو خارجی تحریص و تحریک تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے جب سنٹر قائم کرنے کی بات طے ہوئی تو سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ بستی کے اپنے لیڈروں کی ایک جامع اور مکمل فہرست بنائی گئی اور اس غرض کے لئے اسکولوں کے پرنسپلوں، ضلع کے نگرانوں، سیاسی نمائندوں اور سماجی بہبود کا کام کرنے والے اداروں کی ڈائرکٹریوں کا مطالعہ کیا گیا۔ اس فہرست کی ترتیب و تالیف میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ اس میں مختلف مذہبی، قومیت اور تہذیب کے لحاظ سے بنے ہوئے گروہوں، تاجروں اور مزدوروں کی جماعتوں، سماجی بہبود کا کام کرنے والے اداروں، سرکاری محکموں اور والدین کی انجمنوں غرض ہر گروہ کے نمائندے آ جائیں۔ اب ان نمائندوں کو ایک میٹنگ میں مدعو کیا گیا تاکہ آپس میں غور و بحث کر کے سنٹر کی اسکیم بنائی جائے اور اس مقصد کے لئے بستی کے باشندوں کی ایک کمیٹی بنا دی جائے۔ ان جلسوں میں لوگوں نے بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور ہر پہلو سے یہاں تک کہ روپے پیسے کے معاملے میں بھی امداد اور تعاون کی پیشکش کی گئی۔

دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اس اسکیم کے بارے میں بستی کے لوگوں کے خیالات و جذبات کا اندازہ کرنے اور اسی کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے کمیٹی نے پورے شہر کا ایک جلسہ منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لئے ایک مجلس عمل مقرر کی گئی اور لوگوں کا اشتراک حاصل کرنے

ہمارے کمیونٹی سنٹر

مغربی ممالک خصوصاً انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں کے مقابلے میں

اس شمارے میں امریکہ اور انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں کی تنظیم کے طریقوں اور ان کی سرگرمیوں سے متعلق دو مضامین شریک کئے جا رہے ہیں انگلستان کے کمیونٹی سنٹر ہندوستان میں غیر متعارف نہیں ہیں بلکہ اگر ہماری معلومات غلط نہیں ہے تو ملک میں متعدد مقامات پر انہی سنٹروں کے نمونے پر کمیونٹی سنٹر قائم ہو چکے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا دوسرا نیشنل سیمینار اسی موضوع پر بحث کرکے اپنی رپورٹ بھی دے چکا ہے۔

اس موقع پر امریکہ اور انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں کا تعارف دینے کا منجملہ اور مقاصد کے ایک مقصد یہ ہے کہ اب جبکہ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کے معاملہ نیشنل سیمینار کی سطح پر غور و خوض ہونے والا ہے ہم اس کی روشنی میں اپنے کمیونٹی سنٹروں کی کیفیت کا جو بیشتر شہراتی علاقوں میں قائم ہوتے رہے ہیں اور اب بھی زیادہ تر شہراتی علاقوں ہی میں قائم ہوتے ہیں، جائزہ لیں اور فیصلہ کریں کہ آیا ہم اپنے اس تجربے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اور اگر کہیں کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کے کیا اسباب ہیں ——— ایڈیٹر

کمیونٹی سنٹروں کی ابتدا کا طریقہ

اس بات کا ہمیں ذاتی تجربہ بھی ہے اور یہی کچھ دوسری جگہوں پر بھی دیکھنے میں آیا کہ

پیپلز ہاؤسوں کے طریقۂ کار میں بڑی لچک ہوتی ہے ان کا طریقۂ کار اس طرح کا ہوتا ہے کہ وہ کام کی ابتدا اس مقام سے کر سکیں جہاں لوگ ذہنی اعتبار سے ہوتے ہیں، پھر جس نسبت سے ان کی دلچسپی میں ترقی ہو، اسی نسبت سے وہ بھی اپنے آپ کو بدل سکیں، اور جب آگے بڑھنے کا وقت آئے تو وہی راستہ اختیار کر سکیں جس پر لوگ چل رہے ہوں۔

نوجوانوں اور بالغوں کے ان مرکزوں سے نہ صرف افراد نے بلکہ ہر قسم کے گروہوں نے بھی بڑی دلچسپی دکھائی ہے۔ کچھ گروہوں نے ان کی سرمائے سے مدد کی ہے، کچھ نے تبادلۂ خیالات کی مجلسیں منعقد کی ہیں، لیکچروں کے سلسلے منظم کئے ہیں، اور خصوصی کلاسیں چلائی ہیں۔ کچھ نے اسکولوں کی طرف سے بہم پہنچائی گئی سہولتوں سے جی بھر کے استفادہ کیا ہے اور کچھ نے سنٹر سے مدد حاصل کر کے اپنے شخصی پروگراموں کو بحال رکھا ہے۔ غرض ان سنٹروں کی بدولت سب نے عملاً اس بات کا تجربہ کر لیا ہے کہ وہ کل سے الگ نہیں بلکہ اس کا ایک جزو ہیں، اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کا تجربہ اُن کو اُس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس کی مانگ کے جائز ہونے کے ثبوت سے فائل کا پیٹ اچھی طرح نہیں بھر جاتا گودام سے نکل کر کارکن کے ہاتھ میں نہیں آتی۔

— یہ اور اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں کمیونٹی سنٹروں کی ناکامی یا بے کیفی کے جواز میں کہی جاتی ہیں۔ یہ بات کہ آیا یہ اسباب کہاں تک حق بجانب ہیں، اس پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے سوائے اتنی بات کے کہ مذکورہ بالا چار خاص باتوں میں پہلے کی دو باتیں تو ایسی ہیں۔ کہ ان کو جماعت سے دو رکرنا ہی تعلیم بالغان یا سوشل ایجوکیشن کا منصب ہے جس کے تحت کمیونٹی سنٹروں کا کام آتا ہے، اور چوتھی بات تو ایسی ہے کہ اگرچہ اس کی وکالت اور حمایت خود حکومت کے ذمہ دار لوگ کرتے ہیں مگر جب اس قسم کے کسی نئے پروگرام کو شروع کرنے کا موقع آتا ہے تو وہی لوگ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے براہ راست سرکاری انتظام میں چلانے کے علاوہ اور کوئی صورت ہی نہیں سوچ سکتے

کمیونٹی سنٹروں کی ناکامی کا اصل سبب

واقعہ یہ ہے کہ تعلیم بالغان کے سلسلے میں انگلستان، امریکہ، اسکنڈی نیویا، غرض یورپ کے قریب قریب ہر ملک میں جو تجربات ہوئے ہیں، اور ان کی کامیابی کے پیچھے جو روح کام کرتی رہی ہے ہم نے اپنے ہر تجربے میں اُسی کو نظر انداز کیا ہے۔ یہ بات چاہے کسی اور میدان میں صحیح اُترے یا نہ اترے مگر کمیونٹی سنٹروں اور اڈلٹ ایجوکیشن کے دوسرے اداروں مثلاً لیبر کالجوں، فوک ہائی اسکولوں، شبینہ اسکولوں اور کورسوں کے باب میں کامیابی کا وہی واحد راز رہا ہے اور وہ ہے ان کاموں کی تنظیم میں جمہوری طریقہ کار کا چلن جس کے اثر سے ان اداروں سے لوگوں میں اپنایت کا احساس پیدا ہوتا رہا ہے اور جب کسی چیز کے متعلق کسی کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کی اپنی ہے اور اس کے بھلے بُرے کی پوری ذمے داری اسی کے اوپر ہے تو قدرتی بات ہے کہ "اپنی چیز" کو بگڑتا ہوا یا اس کے روپ میں پھیکا پن آتا ہوا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

ہمارے کمیونٹی سنٹروں کا ایک عرصے کے بعد زوال ہمارے خیال میں اسی اور صرف اسی

ہمارے یہاں جب کسی کمیونٹی کی ابتدا ہونے والی ہوتی ہے تو اس وقت بڑا جوش ہوتا ہے، کارکنوں میں بھی اور عوام میں بھی۔ اس سلسلے میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ پہلے ایک "عظیم الشان" سا جلسہ ہوتا ہے جس کے ذریعے کمیونٹی سنٹر کا افتتاح ہوتا ہے۔ اس جلسے میں لمبی چوڑی تقریریں ہوتی ہیں جن میں طرح طرح کے وعدے کئے جاتے ہیں اور اونچے اونچے آدرش بیان کئے جاتے ہیں، ان وعدوں اور آدرشوں کے سہارے سنٹر کچھ عرصے تک خوب زوروں سے چلتا ہے اور اس کی عمارت میں بڑی رونق رہتی ہے اسکیم کے شروع کرنے سے پہلے سازوسامان خاصی مقدار میں پہلے سے موجود رہتا ہے اس لئے کارکن بھی سمجھتا ہے کہ اُسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہے، اور جی جان لگا کر کام کرتا ہے۔ دوسری طرف اس عارضی چمک دمک سے لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے بھلے کے لئے کچھ ہونے والا ہے اس کے کچھ عرصے تک "اپنی بھلائی کی امید" کے سہارے آتے رہتے ہیں۔

مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور کارکن اور عوام دونوں کا جوش ٹھنڈا ہونے لگتا ہے اور پھر وہ وقت بھی آجاتا ہے جب سنٹر کا انتظام چلانے والے ذمہ دار لوگ چونک پڑتے ہیں کہ "آخر یہ ویرانی کیوں! یقیناً کارکن محنت سے جی چرانے لگا ہے" نتیجے کے طور پر ان غریبوں سے رپورٹ اور اعداد و شمار طلب کئے جانے لگتے ہیں۔ اس مقام پر اب کارکن کو اپنے روزگار کے خطرے میں پڑنے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے اور وہ بناوٹ اور کاریگری سے کام لینا شروع کرتا ہے۔

ہم نے ابتدا میں کہا ہے کہ اس صورت حال کا ہمیں ذاتی تجربہ بھی ہے اور یہی کچھ دوسرے مقامات پر بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ لیکن اگرچہ ذاتی تجربے اور مشاہدے دونوں کا اصل سبب ~~یہ ہے کہ جیسا کہ ہم آگے چل کر ذکر کریں گے،~~ دونوں میں درجے کے لحاظ سے خاصا فرق ہے۔ ہم نے جو تجربہ کیا ہے، وہ ایک غیر سرکاری ادارے کے اہتمام میں ہوا اور جو کچھ دوسری جگہ دیکھا ہے وہ سرکاری اداروں کی نگرانی میں واقع ہوا ہے۔ پہلے معاملے میں ادارے اور اس کے کارکنوں

نقص کا نتیجہ ہے، خواہ وہ کمیونٹی سنٹر غیر سرکاری کسی ادارے کے ماتحت قائم ہوئے تھے، یا سرکاری اداروں کے اہتمام میں۔ غیر سرکاری اداروں کے اپنے مخصوص مشن یا دستور اساسی نے انھیں بستی کا اپنا کمیونٹی سنٹر نہیں بننے دیا اگرچہ دفتر شاہی نظام سے ان اداروں کی آزادی کی بدولت کسی حد تک وہ کامیابی سے چلتے رہے۔ سرکاری اداروں کے ماتحت چلنے والے سنٹر سرکار کے دفتر شاہی نظام عمل کی وجہ سے بستی کے اپنے کمیونٹی سنٹر نہ بن سکے اگرچہ ان کے کارکن انھیں لشٹم پشٹم چلاتے رہے اور اب تک چلا رہے ہیں۔

چند بنیادی باتیں جن سے ہمارے سنٹر خالی ہوتے ہیں

یہ اگرچہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہوں گی مگر آیئے ان کی روشنی میں انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں اور اپنے یہاں کے کمیونٹی سنٹروں کے فرق کا مطالعہ کریں۔

۔ سنٹروں کی آزادی اور خود مختاری

انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں کے بارے میں انگلستان کا ایک نمایندہ اور ذمے دار مصنف دعویٰ کرتا ہے "کسی بستی کو پہچاننا ہو تو اس کے کمیونٹی سنٹر کو دیکھ لیجئے، بستی کی نوعیت کا پورا پورا علم ہو جائے گا"۔ کیا ہم اپنے کسی کمیونٹی سنٹر کے بارے یہ دعویٰ پوری دیانت داری کے ساتھ کر سکتے ہیں؟ انگلستان کا رہنے والا یہ دعویٰ کیوں کرتا ہے؟ وہ جس جگہ یہ بات کہتا ہے وہیں دوسری سطر میں یہ بھی کہتا ہے کہ "اس کا انتظام خود بستی کی ایک ایسوسی ایشن کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس عمارت (سنٹر) کو گھر کی شکل دے دے ــــ بستی کے تمام گھروں کا مشترک گھر، بستی کی زندگی کا مجسمہ"

کیا ہم پوری سچائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے کبھی بھی اپنے ذہن میں اپنے کمیونٹی سنٹروں کا یہ روپ قائم کیا ہے؟ ایک ادنیٰ سی بات لے لیجئے۔ بستی کے لوگ چاہتے ہیں کہ سنٹر رات کے بارہ بجے تک کھلا رہے۔ کیا ہم عوام کی اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں؟ ہم اپنے دفتری نظام کے تحت یہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ اس صورت میں اگر سنٹر کا ذمہ دار کارکن زیادہ وقت تک کام کرنے کا معاوضہ مانگے تو اس کا یہ مطالبہ پورا نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر سنٹر کا انتظام بستی کے اپنے ہاتھ میں ہو تو وہ یہ خواہش

کے جوش اور خلوص میں کمی نہیں پائی گئی اور نہ انہوں نے اپنے بازار کو ٹھنڈا پاکر" بناوٹ اور کاریگری" سے کام لیا۔ البتہ انھیں اس صورتِ حال پر حیرت ضرور ہوئی اور انہوں نے اپنے بس بھر اس کا تجزیہ کیا۔ مگر دوسرے معاملہ میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر بازار ٹھنڈا پڑا تو کارکن بھی ٹھنڈے پڑ گئے" یا یہ کہئے کہ حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے شکست تسلیم کر لی اور لشتم پشتم گاڑی کو ہانکتے رہے۔

اس صورتِ حال کا جائزہ لینے سے اب تک حسب ذیل اسباب پر نظر پڑی ہے اور ان کو دور کرنے کی تھوڑی بہت کوشش بھی کی گئی ہے۔

۱۔ لوگوں میں عام طور پر تقدیر پرستی کی ذہنیت ہوتی ہے چنانچہ اُن میں اپنی حالت کو سدھارنے کا شوق نہیں ہے۔ اسی تقدیر پرستی کا نتیجہ سستی اور آلکس ہے جس کی وجہ سے لوگ کہنے سننے اور گھروں پر جا جا کر بُلانے کے باوجود سنٹر میں نہیں آتے۔

۲۔ عام طور پر لوگ مفت خوری کے عادی ہوتے ہیں چنانچہ سنٹر میں جن سہولتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اگر انھیں مفت استعمال کرنے کی اجازت ہو تو لوگ شوق سے آتے ہیں لیکن اگر ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوئی معاوضہ طلب کیا جائے یا کسی تقریب کی شرکت کیلئے ٹکٹ لگا دیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔

۳۔ لوگوں کو کسی کورس یا تقریب میں شرکت کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ابھی تک کوئی کارگر طریقِ کار (MOTIVATION کا طریقہ) ایجاد نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوتی۔

۴۔ عوام کی تعلیم کا یہ کام جو عوام کے اپنے نمائندوں اور اداروں کے کرنے کا ہے، سرکاری اہتمام و نگرانی میں چلتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے (جس کی طرف مسٹر شری رام گپتا نے بھی جنھیں دہلی میونسپل کمیٹی کے سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے عرصے تک کام کرنے کا موقع ملا ہے، اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے) کہ حکام جن کے اوپر اس کام کی ذمے داری ہوتی ہے کارکنوں سے ٹھوس شکل میں اور وہ بہت جلد نتیجہ دکھلانے کی فرمائش کرتے ہیں دوسری طرف سرکاری اہتمام کے کام چلانے کا عنصر یہ ہوتا ہے کہ ساز و سامان کی فراہمی بالعموم بروقت پوری نہیں ہوتی اور وہ ٹکے کی چیز بھی جب تک

بنا پر اچھی طبیعت کے لوگ اپنے پڑوسی کے، اُسے علم ہوئے بغیر کام آتے ہیں اور بُری نیت کے لوگ اکثر اُسے نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ اس قریب کی واقفیت کا مقابلہ کوئی اور جائزہ، چاہے وہ کتنا ہی سائنٹفک بنیاد پر کیوں نہ ہو، نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے فائدہ اُسی حالت میں اٹھایا جا سکتا ہے جب کمیونٹی سنٹر سولہ آنے بستی والوں کے اختیار و اقتدار میں ہو اور اس کے پروگرام اور سرگرمیاں بلا شرکت غیرے بستی کے لوگوں کی مرضی کی پابند ہوں۔

۴۔ ہمارے سنٹروں کا پھیکا پن

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے کمیونٹی سنٹروں میں یکسانیت کا رنگ رہتا ہے اور یکسانیت انسان کے حق میں وہ زہر ہے کہ اگر وہ اس سے پرہیز نہ کرے تو وہ اُسے زندہ درگور کرکے رکھ دے لیکن سنٹر میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کس طرح ہو سکتی ہے جب اس کے پروگراموں اور سرگرمیوں کی منصوبہ بندی باہر سے نوکری کی غرض سے آیا ہوا ایک شخص یا اس سے بدتر بستی سے دور دفتروں میں بیٹھنے والے حکام کرتے ہیں۔ تنوع اور رنگا رنگی تو جب پیدا ہو سکتی ہے جب رنگا رنگ طبیعتیں اور شوق رکھنے والے بستی کے لوگ اس میں عملاً اور وابستگی کے جذبے کیساتھ شریک ہوں۔ مگر یہ شرکت بھی کس کام کی جب ان کے مرتب کئے ہوئے یا کم سے کم پسند کئے ہوئے کسی پروگرام کو اس لئے رد کر دیا جائے کہ وہ سنٹر چلانے والے ادارے کی پالیسی یا بجٹ کے خلاف پڑتا ہے چاہے وہ ادارے سرکاری ہوں یا غیر سرکاری۔

باہر کے خیالات اور اپنے حالات کے مطابق ان میں ردّ و بدل

ہمارے یہاں منجملہ اور خیالات کے کمیونٹی سنٹروں اور جنتا کالجوں کا خیال بھی باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ یہی دونوں چیزیں ناکام ہوئی ہیں۔ جب کوئی خیال باہر سے لیا جاتا ہے تو یہ بات بجا طور پر کہی جاتی ہے کہ باہر کے خیالات جوں کے توں اختیار کرنے سے اچھا یہ ہوگا کہ ان میں اپنے مخصوص حالات کے لحاظ سے ردّ و بدل کر لیا جائے۔ دوسرے خیالات کے

ظاہر کرنے سے پہلے اس پہلو پر غور کرے گی اور یہ خواہش بھی کرے گی جب اپنے آپکو اس قابل پائیگی

۲۔ رکنیت کی وسعت

ایک خصوصیت انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں کی یہ ہے کہ بستی کی ایسوسی ایشن افراد کو تو اپنا ممبر بناتی ہی ہے، بستی کی دوسری جماعتیں بھی جو چاہیں اس کی ممبر بن سکتی ہیں مثلاً کھیل کود کے کلب، گرجاگھر، مزدور سبھائیں، خیراتی کام کرنے والی انجمنیں وغیرہ غرض وہ تمام جماعتیں جن کے اہتمام میں لوگ کسی نہ کسی دلچسپی یا شوق کی غرض سے ایک جمع ہو سکتے ہیں۔

کیا ہمارے کمیونٹی سنٹروں کی رکن بستی کی، سیاسی چھوڑیئے، اس قسم کی تفریحی اور سماجی جماعتیں بھی بن سکتی ہیں اور اپنے کسی جلسے یا تقریب کے لئے سنٹر کی عمارت کو استعمال کر سکتی ہیں؟ اور اگر نہیں جیسا کہ واقعہ ہے تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کمیونٹی سنٹر پوری بستی کی زندگی کا آئینہ ہیں؟

۳۔ بستی کے لوگوں کی ضروریات اور خواہشات کا لحاظ

انگلستان یا مغرب کے دوسرے ملکوں میں کمیونٹی سنٹر کے طریقہ کار کے پیچھے بنیادی فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ کام وہاں سے شروع کیا جائے جہاں بستی کے لوگ ذہنی کیفیت کے اعتبار سے پائے جائیں اور جوں جوں سنٹر کے کام کے اثر سے ان کے ذہنی آفاق میں تبدیلی اور وسعت ہو اسی نسبت سے سنٹر بھی اپنے آپ کو بدلتے اور ڈھالتے رہیں اس طریقہ کار پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب کمیونٹی سنٹر اپنی سرگرمیوں کی بنیاد بستی کے لوگوں کی ضروریات اور خواہشات پر رکھیں

ہمارے جائزوں کی حقیقت

ہمارے کمیونٹی سنٹر اس بات کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ سنٹر کی سرگرمیاں شروع کرنے سے پہلے بستی کا مفصل جائزہ لیا جاتا ہے اور اسی جائزے کی بنیاد پر پروگرام مرتب کئے اور چلائے جاتے ہیں۔ لیکن اس نام نہاد جائزے کے بارے میں بھی کارکنوں کو اس بات کی شکایت کرتے عام طور پر سنا گیا ہے کہ لوگ سوالناموں کا پورا پورا جواب نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگ اپنے دل کی بات عام طور پر پرائے آدمیوں پر ظاہر نہیں کیا کرتے۔ اور نہ اپنی اصل ضرورتوں کا پتہ نشان دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بستی میں شب و روز ایک سلسلے رہتے سہتے ہیں، انھیں اکثر اپنے ہمسایوں کی ضروریات اور خواہشات کا پتہ رہتا ہے، اور اسی علم کی

اب جبکہ حکومت کی پالیسی ہی ہر کام کو براہ راست اپنے انتظام اور نگرانی میں انجام دینا قرار پائے تو ظاہر ہے اس کام میں کوئی غیر سرکاری اور رضا کار جماعت حکومت کے مقابلے پر آنے کی جرات نہیں کرسکتی اور نہ حکومت ہی ایک ہی جیسے کام کیلئے رضا کار جماعتوں کو امداد دے کر اپنے اوپر ڈپلیکیشن کی بدنامی اوڑھنے کے لئے تیار ہوگی، ان حالات کی روشنی میں دیکھئے تو یہ بات نہیں ہے کہ رضا کار جماعتوں میں اپنے بل بوتے پر یا سرمائے کی کمی کی وجہ سے اپنا کام چلانے کا حوصلہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں کوئی کام اپنے طور پر کرنے کا موقع ہی نہیں رہ گیا ہے۔

بانہہ گہے کی لاج حکومت کے کام کرنے کا ڈھنگ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ایک بار جب ایک فیصلہ ہو گیا تو اس سے پیچھے ہٹنا، خواہ اس کے خلاف منطقی دلائل کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، بہت کم ممکن ہوتا ہے۔ نتیجہ وہی "بانہہ گہے کی لاج" کی صورت میں نکلتا ہے کہ جس کی بانہہ گہی جاتی ہے اس کی بھی خرابی اور جس نے بانہہ گہی ہے اس کی بھی خرابی۔

مگر یہ بات نہیں ہے کہ حکومت کو اس راز سے کبھی آگاہ ہی نہیں کیا گیا۔ جو لوگ تعلیم بالغان کی تحریک کے گذشتہ دس بارہ سال کی تاریخ سے واقف ہیں وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ سوشل ایجوکیشن کی نئی مہم کے آغاز سے پہلے ۱۹۵۰ء ہی میں حکومت کو اس خطرے کی طرف سے آگاہ کر دیا تھا۔ ساتویں آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے شفیق صاحب مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت میں صاف الفاظ میں یہی بات کہی تھی، ملاحظہ ہو:-

"...... لیکن ایک بات مجھے بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ ایک جمہوری ریاست کے بالغوں کی زندگی بھر کی تعلیم کا پورا بوجھ دنیا کی کوئی جمہوری حکومت تنہا اپنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ یہ بوجھ جمہور ہی کو بالآخر اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا مگر ظاہر ہے کہ اس وقت ہم کو اس بوجھ کو اٹھانے کا نہ تو شعور ہی پیدا ہوا ہے اور نہ سکت اور طاقت ہے۔ اس لئے دور اندیش حکومت کا یہ فرض ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خدمت کا جذبہ رکھنے والے پرجوش اور پرخلوص کارکنوں اور نجی اداروں کی سرپرستی کرے۔ ان کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار کرے، ہمت افزائی کرے

بارے میں تو ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے مگر کمیونٹی سنٹروں اور جنتا کالجوں کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ ہم نے ان خیالات کے صرف خارجی رنگ روپ کو اپنی نظر کے سامنے رکھا ہے، اس روح کو ہماری نگاہ نہیں دیکھ پائیں جس کی بدولت یہ خارجی رنگ روپ وجود میں آتا ہے۔ یعنی ان اداروں کی ہر قسم کے خارجی اثر یہاں تک کہ حکومت کے بھی اثر سے آزادی اور ان کی جمہوری تنظیم۔

تال میل اور سرمائے کی دشواری کا مسئلہ

۱۔ سرمائے کی دشواری اور اس کی حقیقت

ہمارے یہاں عوام کی تعلیم کا کام عوام کے اپنے اداروں کے ہاتھ میں نہ ہونے کی ایک سب سے بڑی وجہ بظاہر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عوام میں اپنا کام خود اپنے بل بوتے پر چلانے کا نہ حوصلہ ہی اور نہ موقع۔ مگر اسی کے ساتھ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آزادی سے پہلے اس طرح کے کاموں کی ان گنت انجمنیں قائم تھیں اور وہ اپنے ہی بل بوتے پر اپنا کام کرتی تھیں۔ سوچنا یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد کیا بات ہوئی کہ لوگوں کے اندر سے یہ حوصلہ ختم ہوگیا! اور اب اس قسم کی رضاکار انجمنیں نہیں ابھرتیں۔ اس سوال کے ہماری سمجھ میں دو جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ جنگِ آزادی کے زمانے کے وعدوں اور یقین دہانیوں کے پس منظر میں لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اب سرکار اپنی ہے اور وہ ہمارے لئے سب کچھ کرے گی دوسری طرف حکومتِ وقت اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر اس طرح کے کام بھی اپنے ہاتھوں میں لے کر جمہور کو یہ دکھانا چاہتی ہے کہ وہ اپنے وعدوں اور یقین دہانیوں کو بھولی نہیں ہے اور ان کے لئے اپنے بس بھر کام کر رہی ہے۔ غالباً وہ یہ سمجھتی ہے کہ خود پردے میں رہ کر اور عوام کے اداروں کو روپے پیسے کا سہارا دے کر کام کرنے سے اس کا کام لوگوں کے سامنے نہیں آئے گا اور اگر وہ پردے میں رہ کر سرمائے سے مدد کرے گی تو اس مدد کے بارے میں لوگ یہ سمجھ لیں گے کہ "ہمارا پیسہ تھا ہم کو مل گیا۔ اس میں خود حکومت نے کیا کارنامہ انجام دیا؟" اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انتخابوں کے موقعے پر حکومتِ وقت کی بے عملی ثابت ہوگی اور آئندہ کے لئے اس کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔

جیسے انگلستان کی ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن یا ورکرز ایجوکیشنل ٹریڈ یونین کمیٹی وغیرہ۔ ہمارے یہاں اوّل تو اس قسم کی رسدی ایجنسیاں موجود ہی نہیں ہیں اور اگر موجود بھی ہوں تو سرکاری اہتمام میں چلنے والے ان کمیونٹی سنٹروں کو اُن سے الحاق کی اجازت ہی شاید نہ ملے۔ کسی ادارے یا ایسوسی ایشن کا اپنے آپ کو باہر کی کسی ایجنسی سے ملحق کرنا تو اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عمل کی آپ ذمّے دار ہو۔ دوسری طرف یہ بات بھی رہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کی دوسری درسگاہیں اپنی چہار دیواری سے باہر جا کر علم کی تبلیغ کرنے کی طرف سے غافل ہیں۔ ہمارے خیال میں ان اداروں کی غفلت کی ذمّے داری بھی تعلیم بالغان کے اداروں کو سرکاری انتظام میں چلانے کے اصول ہی پر ہے۔ ظاہر ہے جب اُن کو کوئی اپنے کسی کام یا شوق کی تکمیل کے سلسلے میں پوچھے گا ہی نہیں تو انھیں کیا پڑی ہے کہ اپنے آرام اور فرصت کے وقت کو قربان کر کے لوگوں کو تعلیم دینے کی پیش کش کرتے پھریں۔

بہرحال خوشی کی بات یہ ہے کہ روز بروز بڑھتی ہوئی شہرائیت کے پیدا کئے ہوئے مسائل کے دباؤ کو محسوس کر کے ہم نے شہراتی سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کے موضوع پر ایک دفعہ پھر غور و بحث کرنے کا ارادہ کیا ہے[1]۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ شہروں میں کمیونٹی سنٹر وغیرہ کی شکل میں اب تک جو کچھ کام ہوا ہے اور اس کے جو نتائج رہے ہیں، اُن کا پوری طرح جائزہ لیا جائے گا اور اس جائزے کی روشنی میں جو مسائل ابھریں گے اُن کے اوپر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا تاکہ ہمارے اوپر کے ملک میں تعلیم بالغان کی تحریک کے چلانے والے کہے جاتے ہیں، "آزمودہ را آزمودن" کی مثل صادق نہ آئے۔

[1] واضح رہے کہ ۱۹۵۸ء کا نیشنل سیمینار کمیونٹی سنٹروں کی تنظیم کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا، اور وہ زمانہ تھا جب کمیونٹی سنٹر ہو یا اڈلٹ ایجوکیشن کا کوئی اور پروگرام شہروں سے نکل کر گاؤں میں ابھی تک نہیں پھیلا تھا۔

اُن کو سہارا دے، ان کو مدد دے اور ان کے کام کی بس اسی حد تک نگرانی کرے جو تھوڑا سا نظم وضبط پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اُن پر ایسی پابندیاں عاید نہ کرے جو اُن کی اُمنگ اور جوش عمل کو کچل کر رکھ دیں۔"

اگر اڈلٹ ایجوکیشن کا کام کرنے والی انگلستان کی اور مغرب کے دوسرے ممالک کی ایجنسیوں اور ان کی حکومتوں کے باہمی تعلق کا بغور مطالعہ کیا جائے اور آزادی ملنے سے پہلے کے زمانے کی خود ہندوستانی انجمنوں کے کام کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہی وہ پہلو ہے جو ان ایجنسیوں کی کامیابی کی ضمانت کرتا ہے اور اسی کو ہم اب تک ارادی یا غیر ارادی طور پر چھوڑے بیٹھے ہیں۔

۲۔ تال میل نہ ہونے کے مسئلے کی حقیقت

ہمارے کمیونٹی سنٹروں اور یورپ کے ملکوں خصوصاً انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں کے درمیان دوسرا سب سے بڑا جو فرق نظر آتا ہے وہ ہے فرصت کے اوقات میں لوگوں کے لئے گھریلو دستکاریوں اور علمی مضامین کی رسمی یا غیر رسمی کلاسوں کی تنظیم۔ ہندوستان کے دوسرے مرکزوں کا حال تو ہمیں مستند طور پر معلوم نہیں ہے، مگر دلّی کے کمیونٹی سنٹروں کی تو یہی کیفیت ہے کہ یہاں خواندگی کی کلاسوں کے علاوہ اور کوئی کلاس غالباً کہیں اور کبھی بھی منعقد نہیں ہوتی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمیں بستی کے لوگوں کی ضرورتوں، خواہشات اور ذوق وشوق کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر اس کا پتہ چل بھی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلاس چلائے کون۔ بستی کے پندرہ بیس آدمی اگر ادبیات یا معاشیات یا نفسیات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو سنٹر کا مہتمم تو اس قسم کی کلاسیں نہیں لے سکتا۔ ان کے لئے تو یونیورسٹی یا ڈگری کالجوں کے ماہر اساتذہ ہی موزوں ہوتے ہیں ان اساتذہ کو ایسی کلاسیں لینے کے لئے کون تیار کرے؟ ایسے موقعوں کے لئے ضرورت ہوتی ہے، ایسی رسدی ایجنسیوں (FEEDING CENTRES) کی جو یونیورسٹیوں اور ٹکنیکل درسگاہوں سے تعلق رکھتی ہوں اور جن سے اس قسم کے مقامی ادارے جیسے کمیونٹی سنٹر ہیں، باضابطہ طور پر ملحق ہوں

جس میں عوام اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر شہر دہلی میں بالغوں کی تعلیم کی تحریک پرانی ڈگر سے ہٹ کر کمیونٹی سنٹروں کی شکل میں چلائی گئی۔

ان کمیونٹی سنٹروں کی تنظیم کا خاص مقصد تھا لوگوں کو ان کے فاضل اوقات میں کچھ ایسی سہولتیں فراہم کرنا جن سے وہ انفرادی طور پر کچھ ترقی کر سکیں، اور لوگوں کو بغیر کسی امتیاز اور تفریق کے ایک جگہ اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا موقع مل سکے۔

دہلی کی تشویش ناک صورت حال

اُس وقت شہر کے نظم و نسق سے متعلق بہت سے مسائل دہلی میونسپلٹی کے سامنے تھے۔ آزادی لے ابھی بہت دن نہیں گذرے تھے اور دہلی کی آبادی دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں شرنارتھی عورتیں اور مرد دہلی میں آ آ کر بستے جا رہے تھے۔ ہزاروں مکانوں پر ان کا غیر قانونی قبضہ تھا۔ مختلف جگہوں پر، سڑکوں اور پارکوں اور عوام کے استعمال کی دوسری جگہوں پر لکڑی کے کھوکھے یا پھوس کی جھونپڑیاں ڈالے یہ پناہ گزیں ڈیرہ ڈنڈا ڈالے پڑے ہوئے تھے۔ لٹے لٹائے ان خانماں برباد شرنارتھیوں کے دل میں غصے اور نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ان کو آباد کرنے کا سوال ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ آپس کا بھائی چارہ تو دور رہا، شہر کی صفائی اور بیماریوں کی روک تھام بھی مشکل ہو گئی تھی

دہلی کے کمیونٹی سنٹروں کا مقصد

اس وقت ان شرنارتھیوں میں اعتماد اور محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت تھی تاکہ ان پناہ گزینوں اور یہاں کے قدیم باشندوں میں باہم اتحاد و یگانگت، اور اشتراک و تعاون کی فضا پیدا ہو اور شہر میں نظم و نسق اور امن و سکون بحال ہو جائے۔ یہ محض قانون کے بس کی بات نہیں تھی، اس کے لئے لوگوں کے دلوں کو بدلنے اور ان کے خیالوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ جو صرف امن و سکون محبت اور یگانگت، اعتماد اور خلوص کی فضا قائم کر کے ہی پیدا کیا جا سکتا تھا۔

شہری علاقے میں سوشل ایجوکیشن کے کچھ تجربے

آزادی سے پہلے

ہندوستان میں سوشل ایجوکیشن (ایڈلٹ ایجوکیشن؟) کی تحریک کی ابتدا ۱۹۳۷ء سے نسبتاً زیادہ منظم ڈھنگ پر ہوئی۔ اس وقت صوبائی حکومتوں کا مقصد عوام کو خواندہ بنانا تھا۔ اسی لئے یہ تحریک خواندگی کی مہموں کی شکل میں شروع ہوئی۔ شروع میں یہ کام بہت اطمینان بخش طریقے پر چلتا رہا، مگر تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ اچھی اور موزوں کتابوں اور لائق معلموں کی کمی، بالغوں کی بددلی اور ایسی ہی دوسری دشواریوں سے یہ تحریک کمزور پڑتی چلی گئی۔

آزادی کے بعد

حصول آزادی کے بعد ملک میں ہر جگہ جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں اور اسی کے ساتھ انتخابات میں عالمگیر بالغ رائے دہندگی کے اصول کا اعلان کیا گیا۔ اس صورت حال کا تقاضہ یہ تھا کہ ووٹ دینے والے دنیا کے معاملات سے پوری طرح واقف اور تعلیم یافتہ ہوں، تاکہ آزادی ملنے کے بعد ان کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں اور جو حقوق انھیں ملے تھے انھیں وہ سوچ سمجھ کر مناسب طریقہ پر نبھا سکیں۔

حصول آزادی کے ساتھ ملک کی تقسیم کے جو تلخ تجربے عوام کو ہوئے تھے، اور جس زہر آلود ماحول میں وہ سانس لے رہے تھے، اس کا بھی تقاضہ یہ تھا کہ باہم میل جول اور امن و سکون کی فضا پیدا کی جائے

ایک تلخ تجربہ

یہ سب کچھ ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ یہ مشغلہ ان کے فاضل اوقات کا جائز استعمال بھی ہے، اور عوام کی تعلیم و ترقی کا ذریعہ بھی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے ذمے دار لوگ بھی اس اسکیم پر جو صرفہ آتا ہے اُسے فضول خرچی پر محمول کرتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جو سماجی خدمت کا کام کرنے والوں کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔ دراصل لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جو پیسہ بھی خرچ کیا جائے اس کا نتیجہ بھی فوراً ہی برآمد ہو جائے اور وہ نتیجہ ایسا ہو کہ اس کی ناپ تول بھی کی جا سکے۔ مگر یہاں جو کام ہوتے ہیں اُن میں خواندگی تو کسی قدر ایک ایسا کام ہے جس کا نتیجہ اعداد و شمار میں پیش کیا جا سکتا ہے مگر اس کے علاوہ باقی سب کام ایسے ہیں کہ ان کے نتائج کو اعداد و شمار میں پیش نہیں کیا جا سکتا عوام کے ذہن کو کس حد تک متاثر کیا گیا ہے، ان میں کتنا حوصلہ بڑھا ہے، ان کی بات چیت اور آداب و اطوار میں کتنی پختگی آئی ہے، وہ ایک دوسرے سے کس قدر اشتراک و تعاون سے کام لیتے ہیں، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے نتائج کو اعداد و شمار کے خاکوں میں پیش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ خواندگی کے اعداد بھی اسی وقت صحیح مانے جا سکتے ہیں جب پڑھنے والوں نے مسلسل پڑھ کر کوئی مستند امتحان پاس کر لیا ہو بالغوں کے لئے مستقل اسکولوں کی بہت ضرورت ہے جس سے کم پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ شہر میں رہنے والوں کے لئے معمولی استعداد کی خواندگی میں کوئی کشش نہیں ہوتی، اس لئے ضروری ہے کہ اُن کے لئے شام کے مستقل اسکول اور ایکس ٹنشن اسکول قائم کئے جائیں۔

ان مرکزوں کے تنظیمی معاملات میں نوجوان بڑی دلچسپی دکھلاتے ہیں مگر تنظیمی اعتبار سے جب ان کی ایک حیثیت قائم ہو جاتی ہے تو کبھی کبھی یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سوشل ایجوکیشن کا کام سماج کی ترقی کا کام نہ رہ کر سیاسی کام بن گیا ہو۔ ان حالات پر قابو پانے کے لئے کارکنوں کو بہت صبر اور ہوشیاری

محبت اور خلوص کی یہی فضا تیار کرنا اور لوگوں کے فاضل اوقات کے صحیح استعمال کے لئے مواقع فراہم کرنا، یہی ان کمیونٹی سنٹروں کا مقصد تھا۔

شہر آخر شہر ہے، یہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ رہتے ہیں۔ یہاں چھوٹے بڑے امیر و غریب عالم اور جاہل، مالک اور مزدور سبھی کا اپنا اپنا مقام اور اہمیت ہے۔ ان سب کو خلوص اور محبت کے رشتے میں منسلک کرنا، خوش انتظامی اور تہذیب دونوں کا تقاضا ہے۔

کمیونٹی سنٹروں کے ذریعہ قدیم اور نووارد، سب کو ایک مقام پر لانے کی کوشش کی گئی۔ ان سنٹروں میں دیواری اخبار کا انتظام کیا گیا۔ مختلف کھیلوں اور تفریح کے دوسرے ذرائع کا اہتمام کیا گیا۔ ان سنٹروں کے پروگراموں کی منصوبہ بندی کا کام، سنٹر میں آنے والے لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق مختلف کمیٹیاں بنا کر سونپا گیا تھا تاکہ وہ سب لوگ سنٹر کے پروگرام کو اپنا پروگرام سمجھ کر اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اپنی صلاحیتوں کو ابھار سکیں۔

تعلیم کے لئے خواندہ ہونا کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ در اصل لوگ اچھی صحبتوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ ہماری ہمیشہ سے رائے رہی ہے اور اسی بنیاد پر مطالعے کے حلقے، بحث مباحثے، تقریریں اور لیکچر، کتھا کیرتن وغیرہ اور ایسے ہی دوسرے پروگراموں پر خاص توجہ دی جاتی تھی جن سے ایک ساتھ تفریح، تعلیم اور جذبۂ یگانگت کی پرورش، کئی مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ سنٹروں میں اسی قسم کے پروگرام شروع کئے گئے اور نوجوانوں نے خاص طور پر ان میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ اس کے لئے مختلف گروہوں نے اپنے معتمد منتخب کئے اور یہ پروگرام بڑی کامیابی سے خود بخود چلتے رہے۔ ڈراموں اور فلموں کی نمائش کا تجربہ بھی بہت کامیاب رہا۔ سنٹر کے پروگراموں میں لوگوں نے اچھی خاصی دلچسپی لی اور اس طرح مرکز میں آنے والوں کی ایک برادری بن گئی۔ نووارد شرنارتھی تھے، یا قدیم باشندے، سب اس رشتے میں منسلک تھے اور یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ دلی کی فضا کو سازگار بنانے میں، تھوڑا سا ہی سہی، مگر ان سنٹروں کا حصہ ضرور ہے۔

ہریجن بستیوں اور گندے علاقوں کا مسئلہ

چھوٹے چھوٹے گھریلو دھندوں کی تربیت کا انتظام، مزدور بستیوں میں عوامی بہبود کے منصوبے کا انتظام، کتب خانوں کا قیام، سنگیت اور ڈرامہ کلبوں کی تنظیم وغیرہ وغیرہ اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر سوشل ایجوکیشن کے کارکن کو غور کرنا ہوگا۔ ان سب کا انتظام سماجی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے مگر اس میں ہمارا کیا مقام ہونا چاہئے یہ غور کرنے کی بات ہے۔

پنج سالہ منصوبوں کے تحت گاؤں کی ترقی کے لئے کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اِس اسکیم میں سوشل ایجوکیشن کا ایک اہم مقام ہے اور پچھلے آٹھ سال کے تجربوں کی بنیاد پر اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سماجی ترقی کے کاموں میں سوشل ایجوکیشن کا بہت اہم مقام ہے۔ دیہاتی علاقوں کی ترقی کے لئے سڑکوں اور نہروں کی تعمیر کی ضرورت تھی، اچھے بیج اور اچھی کھاد اور نئے نئے اوزاروں کی ضرورت تھی، کوآپریٹیو سوسائٹیوں، گھریلو دھندوں، اچھے مکانوں اور پختہ گلیوں، اسکولوں، دوا خانوں اور زچہ خانوں کی ضرورت تھی، زیادہ اناج پیدا کرنے، گھروں کو صاف ستھرا رکھنے اور بیماریوں سے نجات پانے اور پیار و محبت کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت تھی، عام معلومات حاصل کرنے اور فاضل اوقات کے صحیح استعمال کی ضرورت تھی۔ ان سب کے لئے سوشل ایجوکیشن کے ذریعے ایک سازگار فضا تیار کی گئی اور عوام میں بیداری اور حوصلہ پیدا کیا گیا تاکہ لوگ اپنے کام اور اپنے فرائض کو سمجھ کر کام پر ڈٹ جائیں اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے خود کام کریں حکومت کا حصہ اس کام میں بس اتنا ہے کہ "صلاح مشورے اور روپے پیسے سے ان کی مدد اور حوصلہ افزائی کرے۔

شہری مسائل کی نوعیت اور ان کے حل کی چند تجویزیں

طرح شہروں کی ترقی کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ مختلف ہی کیوں نہ ہوں

کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ یہ کام ایسا ہے جس میں دس نیک نیت انسانوں کی نیک خواہی اتنا فائدہ نہیں پہونچا سکتی جتنی ایک آدمی کی مخالفت نقصان پہونچا سکتی ہے۔ نوجوانوں کی تنظیمیں اور ان کی دلچسپیوں کے مطابق ان کی مختلف جماعتیں بنانے کے موقعوں پر ان باتوں پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں خود کارکنوں کا پارٹی بازی سے دور رہ کر کام کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

کمیونٹی سنٹر کے کام میں بچوں کی سرگرمیوں کی اہمیت

یہ بھی محسوس کیا گیا ہے کہ کمیونٹی سنٹروں کو پوری کامیابی سے چلانے کے لئے سارے سماج کو ساتھ لیکر چلنا ضروری ہوتا ہے اور اس کے کسی بھی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جہاں ہم نوجوان عورتوں اور مردوں کے لئے پروگرام بناتے ہیں، وہاں بچوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ بچوں کے کلبوں اور برادریوں کا قیام اس اسکیم کی کامیابی میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو صاف ستھرا رکھنا، کھیل کود اور تفریحی مشغلوں میں اُن کو شریک کرنا، تصویروں کو پڑھنا اور تصویریں بنانا انہیں کاٹنا، کترنا اور چپکانا، مٹی یا پلاسٹی سین سے طرح طرح کی شکلیں بنانا، گانا بجانا اور ناچنا یہ سب ایسی دلچسپیاں ہیں جو بچوں کو ایک مہذب انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔ بچوں کے کھیلوں کا انتظام کرنا اور ان سے عوامی بہبود کے کام کرانا ان کی شخصیت کی تعمیر میں بہت مددگار ہوتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں، بچوں کی اس سائنٹفک اور ہموار نشو ونما کو دیکھ کر ان کے والدین کے دلوں میں بھی سوشل ایجوکیشن سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بخود ان سنٹروں کی طرف بڑھتے ہیں ان سے ان سنٹروں میں عوام کی شرکت کا ایک دشوار مسئلہ حل ہو جاتا ہے چنانچہ منصوبے کے اس پہلو پر غور کرنا بھی سوشل ایجوکیشن کی تنظیم میں بہت ضروری ہے۔

کمیونٹی سنٹروں کے کاموں کی فہرست میں بچوں کی اس قسم کی سرگرمیوں کا شامل کرنا بھی تکلف غیر متعلق سی بات تھی لیکن اگر سنٹر میں "پورے سماج" کے اشتراک کا حصول مان لیا جائے تو اس پہلو کی ضرورت خود ثابت ہو جاتی ہے

تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بہت سے لوگ عام معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ واقعہ بھی ہے کہ وہ ایک طویل مدت کی پابندی میں اپنے آپ کو باندھنا پسند نہیں کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے کسی موضوع پر تھوڑی مدت کے لیکچروں کا سلسلہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے شہروں کے ٹیکسوں کے قانون، مکان اور زمین سے متعلق قوانین، ضبط تولید، بچوں کی نگہداشت اور بیماروں کی خدمت، حکومت کی درآمدی اور برآمدی پالیسی وغیرہ بہت سے موضوع ہو سکتے ہیں، جن پر لیکچروں کے سلسلوں کا انتظام فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اگر شہروں کے علماء اور ماہرین اس طرف توجہ کریں تو ان کی یہ کوشش شہری علاقوں کے لئے خاص طور سے مفید ہوگی۔

عوام کی شرکت کا مسئلہ

سوشل ایجوکیشن کے میدان میں کام کرنے والا ہر کارکن اس بات کو تسلیم کرے گا کہ سوشل ایجوکیشن کے کسی پروگرام میں عوام کا جمع کرنا سب سے مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ کام فلم اور ڈراموں وغیرہ کے اہتمام سے کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں ایک اور تجربہ بھی قابل غور ہے۔ شہروں میں اپنی تندرستی کی فکر تقریباً ہر آدمی کو ہوتی ہے۔ سبھی آدمی صبح شام کھلے میدانوں، پہاڑیوں، پارکوں وغیرہ میں چہل قدمی کے لئے جاتے ہیں وہیں جسمانی تربیت کے اکھاڑے قائم ہو جاتے ہیں اور کچھ شہروں میں تو ان مقامات پر جسمانی تربیت اور ورزش کے باقاعدہ مرکز قائم ہیں۔ صبح شام ان مرکزوں میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ انھیں مرکزوں میں اگر کمیونٹی سنٹر بھی قائم کر دیئے جائیں، جنھیں دار المطالعے اور کتب خانے اور جلسہ گاہیں بھی ہوں تو تربیت جسمانی اور سوشل ایجوکیشن دونوں پروگرام بہت کامیابی سے چلائے جا سکتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو نوجوانوں کی بہبود کے کام اور تربیت جسمانی وغیرہ کا سوشل ایجوکیشن کے پروگرام سے گہرا تعلق ہے۔ اگر ان دونوں کو اس طرح باہمی اشتراک و تعاون کی بنیاد پر چلایا جائے تو بہت اچھے نتیجے نکل سکتے ہیں۔

سماجی بہبود کے کسی بھی منصوبے کو قانون کے شکنجے میں کسنے سے ان کی ترقی بہت کچھ رُک

باقی صفحہ ۱۰۰ پر

مگر اس کا حل بھی عوام میں اشتراک و تعاون کا جذبہ پیدا کر کے نکالا جا سکے گا۔ اوپر شہری زندگی کے جن مسائل کا ذکر کیا گیا ہے یعنی گندی بستیوں کی صفائی اور تعمیر نو، ہر بستی بستیوں میں عوامی بہبود کی خدمات فراہم کرنا، مزدور بستیوں میں تعلیمی اور تفریحاتی کاموں کی ابتداء، گھریلو دھندے سکھانے کا انتظام وغیرہ ایسے بہت سے مسئلے ہیں جن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم کا خاکہ بناتے وقت ان سب باتوں پر غور کرنا ہوگا۔ کمیونٹی سنٹروں کے تحت نوجوانوں کے کلب، رضاکاروں کی جماعتیں، سہیلی سبھاؤں اور بچوں کے کلبوں کا قیام اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

شہروں میں روزگار کے مسئلے کی نوعیت گاؤں سے مختلف ہوتی ہے یہاں لاتعداد افراد بھیک مانگ کر، جیبیں کاٹ کر، چوری کر کے اور دھوکہ دے کر روزی کماتے ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان اتائی، نجومی، تانبے کو سونا بنانے والے درویش وغیرہ سبھی طرح کے انسان شہروں میں بستے ہیں۔ ان سب کے مسائل مختلف نوعیت کے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے سماج میں پیدا ہی کیوں ہو جاتے ہیں؟ آخر ناسازگار ماحول ہی تو ایسے عناصر کو جنم دیتا ہے! کام کرنے کا موقع یا صلاحیت نہ ہونے کی حالت میں بھوک ان سے کیا کچھ نہیں کرنے پر مجبور کرتی! ستم بالائے ستم یہ کہ جب ایک بار بےراہ روی کی زندگی اختیار کر لی گئی تو پھر ان لوگوں کو اپنی برادری کے پھیلانے کی فکر بھی دامن گیر ہو جاتی ہے۔

اگر لوگوں کو اپنے فاضل اوقات کا صحیح استعمال کرنے کے مواقع مل جائیں تو سبھی لوگ اپنی اپنی پسند کے مطابق اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کر کے اس گندے ماحول سے بچ سکتے ہیں۔ موسیقی میں دلچسپی رکھنے والا اچھا گویا اور موسیقار بن سکتا ہے، ڈراموں میں دلچسپی لینے والا ایکٹر بن سکتا ہے، شعر و شاعری میں دلچسپی رکھنے والے شاعری میں اپنے جوہر دکھا سکتے ہیں اور اسی طرح پینٹر، پیکنگ، جلد سازی وغیرہ وغیرہ سبھی کو اپنی صلاحیتوں پر صیقل کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ کمیونٹی سنٹروں میں اس طرح کے مضامین کی باضابطہ تعلیم کا بہت انتظام ہونا بہت ضروری ہے

ریسرچ ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سنٹر نے کچھ دن ہوئے تعلیم بالغان کے لئے ایک اسکیم تجربے کے طور پر مرتب کر کے حکومت ہند کے سامنے پیش کی تھی۔ حکومت نے اس اسکیم پر غور کرنے کے بعد اُسے منظور کیا اور اگست ۱۹۵۵ء سے اس اسکیم پر عمل ہو رہا ہے۔

یہ اسکیم خاص طور سے شہری علاقوں کے لئے مرتب کی گئی ہے، اس کے بعد دیہی علاقوں کے لئے دوسری اسکیم مرتب کی جائے گی۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے دیہی اور شہری علاقوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں علاقوں کی اقتصادی و سماجی زندگی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے چنانچہ کوئی ایسی اسکیم مرتب کرنا جو پورے ملک کے لئے ہو مناسب نہیں ہے۔

اسکیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملک میں تعلیم بالغان کے لئے مستقل اسکول قائم کئے جائیں اور تعلیمی معیار کم از کم چوتھی یا پانچویں جماعت تک رکھا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ وہ کم سے کم معیار ہے جسے حاصل کئے بغیر ایک ناخواندہ شخص کو خواندہ نہیں کہا جا سکتا۔ صرف انگوٹھے کے نشان کی جگہ دستخط کر لینے سے یا اٹک اٹک کر کچھ پڑھ لینے سے کوئی خواندہ کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اس اسکیم کے مطابق ہر بالغ کے لئے پڑھنے لکھنے کی اتنی صلاحیت حاصل کرنا ضروری ہے جو ایک بچہ عموماً ۴۔ ۵ سال کی کامیاب تعلیم کے بعد حاصل کرتا ہے۔

اس تجربہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دہلی کے علاوہ ریسرچ سنٹر کی رہنمائی میں ہندوستان کی ۶ مختلف ریاستوں میں ریسرچ یونٹ قائم کئے گئے ہیں۔ ان کی نگرانی وہاں کی علاقائی ایجنسیاں کر رہی ہیں جو کافی عرصہ سے تعلیم بالغان کی تحریک سے وابستہ رہی ہیں۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

ایجنسی کا نام	اسکولوں کی تعداد	طالب علموں کی تعداد	زبان
۱۔ ریسرچ ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سنٹر دہلی	۱۲	۲۸۸	ہندی۔ اردو
۲۔ لٹریسی ہاؤس لکھنؤ	۶	۱۳۹	ہندی۔ اردو

بالغوں کے لئے مستقل اڈلٹ اسکول: اسکیم اور تجربہ

آج کا دور ایٹمی دور کہا جاتا ہے۔ چاند اور ستاروں میں پہونچنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ دُنیا کے سائنس دانوں نے اس کوشش میں کچھ کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ غرض یہ ترقی اور تہذیب کے عروج کی دنیا ہے مگر جہاں اس کی آغوش میں ترقی اور تہذیب پروان چڑھ رہی ہیں، وہیں اس کے دامن میں تقریباً ۰، کروڑ ایسے انسان بھی ہیں جو ناخواندہ اور اس ترقی اور تہذیب کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ موجودہ تہذیب پر یہ ایک بدنما داغ ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق تقریباً ۷۴ فیصدی لوگ ان پڑھوں کی فہرست میں شامل تھے۔ پھر یہ تعداد روز بروز بڑھتی بھی جارہی ہے۔ ایک اعتبار سے ہماری دشواری دوچند ہو جاتی ہے کیونکہ ایک طرف تو اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہم نے جو قدم اُٹھائے ان میں برائے نام کامیابی ہوئی۔ دوسری طرف ہر سال ہماری آبادی میں قریب ۹۰ لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان میں ہر بس تھوڑی سی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ابتدائی تعلیم حاصل کر پاتے ہیں باقی ان پڑھوں کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ان حالات میں ناخواندگی کو دور کرنے کی فوری ضرورت ہے اور خاص طور سے آج جبکہ ہم ملک کی تعمیرِ نو کے لئے منصوبے پر منصوبے بنا رہے ہیں، اور ملک میں سوشلسٹ طرز کے سماج کی تعمیر کو ہم نے اپنا منتہائے مقصود قرار دے رکھا ہے۔ مگر مسئلے کی اہمیت کو صرف تسلیم کر لینے سے مسئلہ حل تو نہیں ہو جاتا! اس میں سوالات اور مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس سے گذرنا لازمی ہے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ ایک ناخواندہ کو کتنی تعلیم دی جائے اور کس طرح۔ ان مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جامعہ ملیہ

اگر اس کو بغور دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سماجی علوم اور جنرل سائنس کے نصابوں کا اپنا اپنا خاص مقام ہے۔ خیال ہے کہ یہ نصاب بالغوں کے لئے بار نہیں ہوگا۔ وہ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس کو ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ دنیا میں آج جبکہ آئے دن حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ہر شخص کو اس قسم کا علم دینا ضروری ہے ورنہ وہ زندگی کے عام دھارے سے دور پڑا رہے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ بغیر اس کے ہم اپنے ملک کی تعمیر نو کا کام بھی بخوبی انجام نہیں دے سکیں گے۔ اس قسم کے نصاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ ہماری منزل ایک سماجی، معاشی اور تہذیبی جمہوریت کا قیام ہے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اس نصاب کو پورا کرنے کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی؟ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ نصاب اگر حالات سازگار ہوں تو تقریباً ۲۴ مہینے کے اندر اندر پورا کیا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مختلف تجربوں سے ماہرین تعلیم نے اندازہ لگایا ہے کہ سیکھنے کی کوئی حد نہیں ہے زندگی کے ۵۰ برس گذرنے کے بعد تو ہو سکتا ہے سیکھنے کی اہلیت میں بتدریج کمی پیدا ہونے لگے لیکن اس سے پہلے انسان میں سیکھنے کی صلاحیت بدستور باقی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ بالغوں کا ذخیرۂ الفاظ بچّوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ ان کے کان ان الفاظ سے صرف آشنا ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے معنی اور استعمال سے بھی واقف ہوتے ہیں، چنانچہ بچّوں کے مقابلے میں بالغوں کی سیکھنے کی رفتار زیادہ ہوتی ہے۔ قوی امید ہے کہ جو نصاب بچّے چار سال میں پورا کرتے ہیں اُسے بالغ ۲ برس کی مدّت میں پورا کرلیں گے۔

نصاب کے بعد درسی کتابوں کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ تعلیم بالغان کے لئے اس وقت ملک میں صرف قاعدے اور ابتدائی مشق کی کتابیں (Follow up Literature) ضرور کچھ ملتی ہیں لیکن وہ بھی الفاظ اور عبارت کے لحاظ سے تدریجی (Graded) نہیں ہیں۔ درسی کتابیں قریب قریب ناپید ہیں۔ زبان کے لئے تو بچّوں کی کتابیں کسی حد تک استعمال کی جاسکتی ہیں لیکن

۳۔ بنگال ماس ایجوکیشن سوسائٹی کلکتہ	۲	۱۰۹	بنگلہ
۴۔ پی۔ ایس جی۔ اسکول آف سوشل ورک کوئمبٹور	۴	۱۱۹	تامل
۵۔ میسور اسٹیٹ اڈلٹ ایجوکیشن کاؤنسل	۳	۸۱	کناری
۶۔ بمبئی سٹی سوشل ایجوکیشن کمیٹی۔ بمبئی	۴	۱۱۴	مراٹھی۔ گجراتی
۷۔ سوشل ایجوکیشن ایسوسی ایشن۔ حیدر آباد	۶	۱۶۲	تیلگو۔ اردو

مندرجہ بالا فہرست کے مطابق اس وقت ملک کی مختلف ریاستوں میں ۲۷ تجرباتی سکول کام کررہے ہیں جو اس سال جولائی اور اگست میں قائم کیے گئے تھے۔ بنگال اور حیدرآباد کے اسکول اس سے ایک مہینہ پہلے کھولے گئے تھے۔ طالب علموں کی تعداد اس وقت ۱۱۲ دلے کے قریب ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ایسے اسکولوں کی ضرورت ہے تو پھر چند اہم سوالات اور پیدا ہوتے ہیں جن کا پورے بھروسے کے ساتھ جواب دینا اس وقت تک مشکل ہے جب تک تجربہ مکمل نہ ہو جائے مثلاً کیا ان اسکولوں کے لئے کسی مخصوص نصاب کی ضرورت ہے جسے مکمل کرنے کے بعد ایک ناخواندہ اس حد تک لکھ پڑھ جائے اور اتنی مہارت پیدا کرے کہ اس کی روزمرہ کی زندگی میں جن کاموں میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے انھیں وہ خود انجام دے سکے؟ اور اس کی عام معلومات میں بھی اضافہ ہو جائے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کن مضامین کی تعلیم دی جائے؟ آیا صرف زبان کی تعلیم دینا کافی ہوگا یا سماجی علوم اور جنرل سائنس بھی پڑھائی جانی چاہئے؟ ان باتوں کو نظر رکھتے ہوئے ایک تجرباتی نصاب تعلیم مرتب کیا گیا ہے جس میں زبان کے ساتھ حساب، سماجی علوم اور جنرل سائنس کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ امید یہ ہے کہ اس نصاب کے ماتحت ان پڑھوں کو ایسی تعلیم دی جا سکے گی جو ان کو بیدار مغز بنانے میں کافی مؤثر ثابت ہو

یہ نصاب کہنے کو تو ابتدائی منزل کی چوتھی یا پانچویں جماعت کے نصاب کے برابر ہے لیکن

ان میں سے ہر گریڈ کی تعلیم پوری ہونے پر طالب علموں کا امتحان لیا جائے گا۔ چوتھے گریڈ کی پڑھائی مکمل ہونے پر اُن کا آخری امتحان ہوگا، پھر ریاستی حکومتوں سے درخواست کی جائے گی کہ ان طلبا کا پبلک امتحان لیا جائے اور کامیاب طالب علموں کو پرائمری کی سند عطا کی جائے۔ اس سلسلہ میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم مختلف ریاستوں سے خط و کتابت کر رہی ہے۔ دلی ایڈمنسٹریشن (Delhi Administration) نے تو سند دینے کی تجویز منظور بھی کر لی ہے۔ امید ہے کہ دوسری ریاستیں بھی اس تجویز کو جلد منظور کر لیں گی۔

اس تجربے کے اختتام پر پوری اسکیم کا باقاعدہ جائزہ لیا جائے گا۔ اس جائزے کی بنیاد پر تجویز ... کر کے حکومت کے سامنے پیش کی جائے گی تاکہ اگر وہ چاہے تو اس اسکیم کو باقاعدہ ملک کے تعلیمی ... م میں شامل کرے۔

مستقل اڈلٹ اسکولوں کے تجربے کے چند مقاصد حسب ذیل ہیں :-

- اگر ناخواندہ اشخاص کو ابتدائی منزل کی چوتھی یا پانچویں جماعت تک کی تعلیم دی جائے تو کتنی مدت درکار ہوگی؟ اس سوال کی روشنی میں ایک نصاب تعلیم مرتب کرنا جس سے ایک ناخواندہ کو نتیجہ خیز قسم کی تعلیم دی جا سکے: ایسی تعلیم جس سے فرد کی ایک مخصوص حد تک نشو و نما ہو سکے، وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکے اور اسی کے ساتھ سماج کی تعمیر نو میں بھی اپنا کردار ادا کر سکے۔
- ان باتوں (Facts) کو معلوم کرنا جو بالغوں کی دلچسپی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے درجہ میں حاضری گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور ان کا حل استادوں کے لئے ایک گائڈ بک تیار کرنا جو بالغ طالب علموں کو پڑھانے میں استادوں کی رہنمائی کر سکے۔
- استاد کس قسم کے ہوں، کل وقتی یا جز وقتی؟ ان کی قابلیت کا معیار کیا ہو؟ ان کی ٹریننگ کس طرح کی ہونی چاہیے؟ اس کی خصوصیات کیا ہوں گی؟ ان سوالات کی تحقیق اور

سماجی علوم اور جنرل سائنس کی معلومات کن کتابوں کی مدد سے دی جائے یہ ایک حل طلب سوال ہے اس لئے زیر بحث اسکیم کے مطابق مختلف مضامین کے نصاب کی روشنی میں تدریجی درسی کتابیں (Graded Text Books) بھی مرتب کی جائیں گی۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس سے متعلق بھی کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف درجوں کی کتابوں میں الفاظ کی تعداد اور انھیں سیکھنے کا بوجھ (Load) کتنا ہو۔ جملوں کی بناوٹ کیسی ہونی چاہئے۔ سماجی علوم اور سائنس کی عام معلومات کو کس انداز سے پیش کیا جائے کہ پڑھنے والوں کے لئے اس میں دلچسپی ہو۔ مشکل یہ ہے کہ ہندی میں کوئی ایسا فارمولا نہیں ہے جو کتابوں کی درجہ بندی کرنے میں ہماری رہنمائی کرے۔ مختلف ماہرین مثلاً فلشر۔ اور گیٹس نے کافی کاوش کے بعد چند فارمولے تیار کئے ہیں۔ لیکن وہ ہمارے لئے بے سود ہیں۔ ہمیں اپنے ملک کے حالات اور ضروریات کے مطابق مناسب فارمولے مرتب کرنا پڑیں گے۔ چنانچہ ان حالات میں اچھی کتابوں کی ترتیب و تالیف بذات خود ایک اہم تجربہ ہے۔

ان کتابوں کے لکھنے کا کام بھی بہرحال شروع ہو گیا ہے۔ سماجی علوم، جنرل سائنس اور حساب کی کتابیں "ریسرچ سنٹر" میں تیار کی جا رہی ہیں اور زبان کی درسی کتابیں لکھنے کی ذمہ داری ہندوستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد کے سپرد کر دی گئی ہے یہ کتابیں، نصاب کے مطابق ہندی میں لکھی جا رہی ہیں۔ اس کے بعد ان کتابوں کا ترجمہ بھی دوسری زبانوں میں شائع کیا جائے گا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بالغوں کو پرائمری تک کی تعلیم دینے کے لئے ۲۴ مہینے کی مدت درکار ہو گی جس کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:

گریڈ اول	۴	مہینے
گریڈ دوئم	۸	مہینے
گریڈ سوئم	۸	مہینے
گریڈ چہارم	۴	مہینے

شہراتی علاقوں میں فنڈامنٹل ایجوکیشن

(نوجوانوں کے اندر کام)

دُنیا کے جن علاقوں کو بہت زیادہ ترقی یافتہ کہا جاتا ہے ان کے یہاں بچوں کی بیشتر تنظیمیں یا تو خود حکومت کے اہتمام میں وجود میں آئیں یا رضا کار جماعتوں کی تحریک سے اٹھیں۔ اس تحریک کے پیچھے حکومت تھی یا رضا کار جماعتیں، ان تنظیموں کے قائم کرنے کا مقصد دونوں کے سامنے یہ تھا کہ صنعتیت اور شہراتیت[1] کی بے تحاشہ اور بے روک ٹوک فضا سے بچوں اور نوخیز لڑکوں لڑکیوں کے اوپر جو خراب اور مضر اثرات پڑ رہے تھے، اُن کا توڑ کیا جائے۔ شہراتیت اور صنعتیت کی اس بھاگ دوڑ میں ایک بات بہرحال یہ ہوگئی —— اور وقت پر ہوگئی کہ ان علاقوں میں صنعتیت کی بدولت سرمایہ بڑی مقدار میں جمع ہوگیا جسے بچوں کی مفت اور جبری تعلیم کے اوپر خرچ کیا گیا اور اس طرح بچوں کی ان تنظیموں کے سامنے اپنے ممبروں کے لئے ابتدائی بُنیادی تعلیم کا پروگرام ضروری نہیں رہ گیا مگر یہ صورتِ حال ہر جگہ تو نہیں ہے صنعتی انقلاب کا عمل، ابھی دنیا میں بہت سے علاقے ایسے ہیں جن کے لئے زمانۂ ماضی کی داستان نہیں بنا ہے۔ ان کے لئے یہ ابھی حال ہی کا تجربہ ہے اور اس حیثیت سے اس وقت جبکہ دنیا کے شہروں میں بہت تیزی سے پھیلاؤ ہو رہا ہے۔ بچوں میں کام کرنے والی تنظیموں کے لئے یہ عمل نہایت کٹھن اور حوصلہ آزما ہے۔

---

[1] شہراتیت کا لفظ ہم نے (Urbanisation) کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس ترجمے کی سند تو کوئی نہیں ہے۔ مگر صوتی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ہمارے نزدیک یہ لفظ انگریزی لفظ سے قریب ہے
ایڈیٹر

ان کا جواب فراہم کرنا۔

- ہندی میں مختلف درجوں کے لئے درسی کتابیں تیار کرنا اور اس کے بعد ملک کی مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ کرنا۔
- اگر شہری علاقوں میں اس طرح کے اسکول کھولے جائیں تو کس قسم کے مسائل پیدا ہوں گے اور ان کا کیا حل ہوگا؟ ان اسکولوں کی تنظیم کے کیا اصول ہوں گے۔
- اسکول کے اخراجات کا تخمینہ معلوم کرنا۔

شہراتی علاقے میں سوشل ایجوکیشن کے کچھ تجربے صـ۶۷ سے آگے

جاتی ہے۔ ان کاموں کی حیثیت بہت کچھ تجرباتی ہوتی ہے۔ اور ان میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطا تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن کی طرف پہلے سے ذہن کی رسا نہیں ہوتی ہے۔ قانونی پابندیوں کی قید اس طرح کے کاموں میں اکثر رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے اس شہروں میں سوشل ایجوکیشن کی تنظیم پر غور کرتے وقت، عوام کی صلاحیتوں اور ان کی قوتوں پر اعتماد بھی ضروری ہے تاکہ وہ ان منصوبوں کو اپنا نجی کام سمجھ کر اس میں پورا پورا تعاون کرسکیں۔

چائلڈ ویلفیر (بقیہ صـ۹۸)

مگر مجھے اندیشہ ہے کہ ہم میں سے بہت کم لوگ ان بچوں کی طرف رخ کرنے کے لئے تیار ہوں گے اس لئے کہ یہاں پھر وہی اپنی مجبوری — اپنے آپ کو طبقاتی امتیاز سے پاک نہ کرنے کی مجبوری آڑے آتی ہے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ اس طرح کا کام کرنے والے لوگ جب تک پہلے اپنی قلب ماہیت اور اصلاح نہ کریں گے۔ یہ کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

پروفیسر ڈائی بل فورڈ جنھوں نے آبجان کانفرنس کی رپورٹ کا خلاصہ تیار کیا ہے، وہ شہروں کی
طرف آنے والے مزدوروں کی دو تقسیمیں کرتے ہیں اور اسی نسبت سے ان کی ہجرت سے جو سماجی مسائل
ٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان میں بھی فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مہاجروں کا ایک گروہ وہ ہے جو کسی
یک صنعت جیسے کان کنی میں کام کرنے کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑ کر آتا ہے، اور دوسرا گروہ ان
ذلوں کا ہے جو اناڑی (Unskilled) مزدور ہوتے ہیں اور شہروں کی مختلف النوع معاشی
ہموں میں کام کرنے کی غرض سے غیر معینہ مدت کے لئے آتے ہیں۔ اس صورت حالات میں ان کے
پنے سماج سے کٹ کر الگ ہو جانے، طرح طرح کے خطرات کا شکار ہونے اور جرائم پیشگی کے رو گ
ں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ شوہر اور بیوی اور باپ اور بیٹے
ے درمیان بہت زیادہ بُعدِ مکانی پیدا ہو جاتا ہے اس لئے نہ صرف خاندانی رشتوں میں خلل واقع ہوتا
بلکہ برادری کی پشتہا پشت کی روایات سے کٹ جانے کی وجہ سے آپس میں اجنبیت اور بیگانگی
دا ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال بچوں اور نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کی سماجی تعلیم اور ان میں سماج کو
جھنے اور اس کے اندر اپنے مقام کو پہچاننے کی اہلیت پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بہت
ادہ اہمیت کی حامل ہے۔ بہت سے علاقوں میں خاص طور پر وہ علاقے جہاں مہاجر بہت بڑی
ادمیں آکر رہتے ہیں کیفیت یہ ہے کہ ایک "احاطے" میں بہت سے نوجوان اکٹھا ہو کر رہتے
۔ ان کی بستی کچھ غیر قدرتی سی بستی ہوتی ہے اور شرم ولحاظ کی پابندی زیادہ نہیں ہوتی اس لئے
ں بے راہ روی کا زور ہو جاتا ہے اور اخلاق میں گراوٹ آجاتی ہے۔ ان علاقوں میں اس صورتِ حال
ے یہ ہوتا ہے کہ روایاتی اقدار کی وہ بندش جو دیہی علاقوں میں جہاں سے یہ لوگ آئے ہوتے ہیں قانونی
ے کا کام کرتی ہے، بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے اور "لوگ کیا کہیں گے" کا خوف مختلف اور انجان دیہی
ں سے آکر ایک جگہ جمع ہونے والے لوگوں کے اس ہجوم میں بے معنی اور بے کار محض ثابت
ہے۔ شہروں میں سمجھا بھی جاتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ طاقت اور اقتدار کا وجود کام دینے
ے مالک یا شہر کے حاکمِ اعلیٰ کے پاس ہوتا ہے اور بس۔ اور چونکہ اس صاحبِ اقتدار شخصیت سے
ت کا کوئی احساس نہیں ہوتا اس لئے جب، جہاں اور جس طرح ممکن ہو، اس شخصیت سے بچ نکلنا

اس پہلو سے غور کیجئے تو فنڈامنٹل ایجوکیشن کی سب سے زیادہ ضرورت ان "غیر ترقی یافتہ" ملکوں کے لئے اور ان علاقوں کے لئے ہے جو ترقی تو کر گئے ہیں مگر دنیا کے لئے "مسئلہ" بنے ہوئے ہیں۔ لفظ "غیر ترقی یافتہ" سے چونکہ احساسِ کمتری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس لئے قدرتی طور پر یہ علاقے روز افزوں ترقی کی منزل سے گذر رہے ہیں۔ یہ روز افزوں ترقی بیشتر اوقات صنعیت و شہرائیت کی ہم معنی ثابت ہوتی ہے۔

۱۹۵۴ء میں افریقہ کے ہاتھی دانت کے علاقے (آیوری کوسٹ) میں آبجان کے مقام پر یونیسکو اور دو اور جماعتوں کے مشترک اہتمام میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس کا موضوعِ بحث تھا، "افریقہ میں صنعت اور شہراتی حالات کے سماجی نتائج" ذیل میں اسی کانفرنس کے فیصلوں کی روشنی میں کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شہرائیت

گذشتہ بیس تیس سال کے اندر یہی نہیں کہ نئے نئے شہر وجود میں آگئے ہیں، بلکہ جن علاقوں میں صدیوں سے شہراتی زندگی کا معمول تھا، وہاں بھی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ فرانسیسی مغربی افریقہ کے ایک شہر داکار کی آبادی اس وقت تین لاکھ ہے جبکہ ۱۹۲۶ء میں اسی شہر میں صرف تین ہزار نفوس بستے تھے۔ کوناکری ایک دوسرا شہر ہے جس کی آبادی ۱۴ سال کے اندر ساڑھے تیرہ ہزار سے بڑھ کر ۷۵ ہزار ہوگئی۔ اسی طرح نائجیریا کے ایک قصبے لاگوس کی آبادی میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان ۸۰ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے مقامات پر جیسے مشرقی افریقہ ہے، شہروں کا پھیلاؤ اور ہی نوعیت کا ہے۔ لیکن نائروبی، ممباسا، کمپالا، جنجا اور وسطی افریقہ میں تانبے کی کانوں کے علاقے کے قصبے اور سالسبری وغیرہ شہروں کی صنعتی زندگی کے تمام سماجی مسائل کے بُری طرح شکار ہو رہے ہیں۔ بعض شہروں میں چونکہ یہ مسائل دیسی اور ہجرت کر کے آنے والی آبادی دونوں کے لئے بالکل نئے ہیں، اس لئے وہاں ان مسائل کے نتائج اور مہلک شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں

بہت چلن ہوگیا ہے اس میں ہوتا یہ ہے کہ مقامی باشندے ٹولیوں میں بٹ کر اپنے شہر یا قصبے کی سماجی ضرورتوں اور کمیوں کی کھوج لگاتے ہیں۔ اس جائزے کا نتیجہ بیشتر اوقات عملی پروگراموں کی شکل میں نکلتا ہے کبھی مقامی حکومتیں کوئی پروگرام چلانے لگتی ہیں اور کبھی خود باشندے رضاکارانہ طور پر کوئی اسکیم اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ ریاست نیویارک کے ایک قصبے نیوراشیل کا ذکر ہے جس کی آبادی ساٹھ ہزار ہے۔ وہاں کے ۳۰۰ رضاکاروں نے ۶۷ ٹولیوں میں بٹ کر اپنے قصبے کی ضرورتوں اور مسائل کا جائزہ لیا۔ اس جائزے سے پتہ چلا کہ منجملہ اور ضرورتوں کے ایک بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ قصبے کے بچوں اور نوعمر لڑکوں لڑکیوں کو ان کے فاضل اوقات کے استعمال کے لئے سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی جائیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لئے کھیل کے میدانوں کا بندوبست ہوگیا اور گندی بستیوں کے ایک علاقے میں لڑکوں کے ایک کلب کے لئے ہینڈبال کے کھیل کا ایک کورٹ بن گیا۔ اس طرح گیارہ بارہ سال سے لے کر اٹھارہ انیس سال کی نوعمر آبادی کی کایا پلٹ ہوگئی اور ان کے اندر سے جرائم پیشگی کا عنصر خود مقامی باشندوں کی کوشش سے ختم ہوگیا۔

مغربی نائیجریا کا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے۔ وہاں اس میدان میں قدم سب سے پہلے حکومت کے سماجی بہبود کے محکمے نے اٹھایا۔ لیکن کام براہ راست حکومت نے نہیں کیا۔ اس نے قصبے کی مختلف بستیوں کے چند با اثر مردوں اور عورتوں کو بلاکر اُن سے مشورہ کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں بستی کا صحیح معنوں میں لیڈر کہا جاسکتا ہے اور جوان نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے تھے جن کے بگڑجانے کا اندیشہ تھا۔ ان مقامی لیڈروں نے ان لڑکوں لڑکیوں سے اُن کی بستیوں میں جاکر بات چیت کی اور ان کو بتایا کہ اگر وہ چاہیں تو ان کے لئے نوجوان کلبوں کے قائم ہونے کے امکانات ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس کام میں وہ خود آگے بڑھیں اور اپنے لئے بستی کے بالغ لوگوں میں سے ایسے لوگوں کو خود منتخب کرلیں جنھیں وہ اپنی برادری یا جماعت کا لیڈر بنانا چاہتے ہوں۔ اس طرح بہت سے نوجوان کلب قائم ہوگئے جن کا روپ ابتدا ہی سے ایسا رکھا گیا کہ وہ اُن ہی کے اپنے قائم کئے ہوئے اُن ہی کی اپنی چیزیں ہوں، نہ یہ کہ باہر سے آکر کسی بالغ نے انھیں ان کے اوپر تھوپ دیا ہو۔

نچا دے جانا یہاں تک کہ کھلے بندوں اسے دھوکا دینا عام بات ہوتی ہے۔ غرض جرائم پیشگی کا ایک مستقل ماحول بن جاتا ہے جس کے اثر سے بچوں اور نوجوانوں کا بے داغ رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

یہ مسائل تو ایسے شہروں کے ہیں جہاں باہر سے آ آ کر بسنے والوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ ایسے شہر جہاں یہ صورتِ حال نہیں ہے یا بہت کم ہے اور وہاں کے لوگ قدیم باشندے ہیں، وہاں بھی اس بیسویں صدی کے شہراتی ماحول نے ایسے مسائل پیدا کر دئے ہیں جن سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہے اور خاص طور پر نئی پود کو ان مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنا بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بچوں اور نوجوانوں کو ایسی تعلیم سے آراستہ کرنے کے مسائل ہیں جو اس نئی اور بالکل اجنبی شہراتی زندگی سے میل کھاتی ہو۔ بے روزگاری کے مسائل ہیں اور یہ وہ میدان ہے جس میں صنعتی انقلاب کے وہ تجربات جو اب سے سو سوا سو سال پہلے یورپ اور امریکہ کے لئے عذاب بنے رہے، نئے سرے سے سامنے آ رہے ہیں۔ رہائش کے مسائل ہیں جو بعض شہروں میں اتنی نزاکت اختیار کر گئے ہیں کہ سر چھپانے کے لئے مکان نہ ہونے یا گھٹیا ہونے کے منجملہ اور نقصانات کے ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ عمر کا اوسط گر کر ۳۰ سال یا اس سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ پھر خصوصاً نوعمر لڑکوں لڑکیوں کے معاملہ میں فرصت کے اوقات کے استعمال کا مسئلہ ہے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور صنعتی ملکوں کے بڑے بڑے شہروں میں ناقابلِ حل ہو رہا ہے۔

بجائے اس کے کہ میں اس بات پر کہ کسی مخصوص شہراتی صورتِ حال میں کیا ہونا یا کیا کرنا چاہیے کوئی نظری اور فلسفیانہ بحث کروں، چند عملی مثالیں پیش کروں گا جن سے معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں کہاں کیا ہو رہا ہے اور یہ کوششیں کہاں تک کامیاب ہو رہی ہیں۔

اپنی مدد آپ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اپنے حالات و مسائل کا اپنے آپ جائزہ لینے کے طریقہ کار کا

جس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور احتیاط رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز جب تک اس سے متعلق اُسے آیندہ استعمال کرنے والے لوگوں کا اعتماد اور مشورہ حاصل نہ کر لیا جائے اُن کے اُوپر باہر سے تھوپی نہ جانی چاہیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تنظیم کا کچھ اس طرح کا ڈھنگ ہونا چاہیے کہ جن لوگوں کے لئے یہ عمارتیں قائم کی جائیں، انھیں ان کے پروگراموں کی منصوبہ بندی میں یہاں تک ان کی تعمیر کے کام میں بھی شخصی طور پر شریک کیا جا سکے۔ ان سے ان عمارتوں کے صحیح حالت میں قائم رکھنے اور اس کی پالیسی کے بارے میں بھی یقیناً رائے مشورہ کرنا چاہیے۔ نوعمر لڑکوں لڑکیوں کے سنٹروں اور ہوسٹلوں میں سب سے زیادہ کامیاب وہ دیکھے گئے ہیں جنھیں انہوں نے اپنی محنت سے خود تعمیر کیا تھا۔ یہ بات قدرتی بھی ہے اس لئے کہ اس صورت میں اس چیز سے اپنایت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور اپنایت کا احساس پیدا ہو جانے کے بعد اپنی چیز کی بقا اور بحالی کی لگن پیدا ہو جاتی ہے۔

ذمّے داری سونپ کر اصلاح کرنے کا طریقہ

نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کے ایسے گروہ جو جماعت اور سماج کے لئے مسئلہ بنے ہوتے ہیں، ان کی اصلاح کے کام میں بھی کامیابی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انھیں ذمّے داری کا کام سونپنے سے پرہیز نہ کیا جائے اور خدمت کا موقع نکلے تو اس سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس طریقۂ کار کی سب سے اچھّی مثال نئی دہلی کا ایک واقعہ ہے جو سائکل چوروں کی اصلاح سے متعلق ہے۔ نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر قلیوں کا ایک گروہ تھا جو مسافروں کی سائکلیں ریلوے کے پُل پر چڑھایا کرتا تھا اور موقع پاکر اُسے لے کر چمپت ہو جاتا تھا۔ اس صورت حال کا چرچا پریس میں ہوا تو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے نوجوانوں میں کام کرنے والے کارکن آگے بڑھے اور اس گروہ کی اصلاح کا کام ہاتھ میں لیا۔ ایک عرصے تک صبر دسکون کے ساتھ گروہ کے ممبروں سے تعلقات قائم کرتے کرتے وہ ان کے بیس سالہ سرغنہ کا اعتماد حاصل کرنے میں آخر کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے ان لوگوں کے لئے جو اپنے لیڈر سے سال دو سال عمر میں کم تھے، تفریحی سرگرمیوں کے موقعے نکالے اور ان کے لئے فٹ بال، نوٹنکی اور ناچنے گانے کے مراکز قائم کر دئے۔

اس اسکیم کے ساتھ ساتھ نوعمر لڑکوں لڑکیوں کے لئے ٹریننگ کیمپ بھی منظم کئے گئے جہاں ان کے لیڈری کے جوہر اور خدمتِ قوم کے جذبے کی تربیت کی جاتی تھی۔ ان نوجوان کلبوں نے اس ٹریننگ سے بھی بہت فائدہ اٹھایا اور اب تو یہ کیفیت ہو گئی کہ یہ لڑکے قصبے کی سڑکوں اور عمارتوں کی صفائی کی مہموں میں شریک ہونے لگے، ہسپتالوں میں جاجا کر ایسے مریضوں کی خدمت کرنے لگے جو دور دراز علاقوں سے آئے تھے اور ان کے عزیزوں رشتہ داروں کے لئے روزانہ اُن کی ملاقات کو آنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انہی کلبوں کے لڑکوں نے شہر ابادان میں جہاں ایک یونیورسٹی ہے، اور آبادی کوئی ۵ لاکھ کے قریب ہے، اپنا ایک امدادی دستہ منظم کر کے فٹ بال کے ایک اسٹیڈیم کی عمارت بنانے کا حوصلہ کر ڈالا اور اپنے بزرگوں اور چند افسروں کو بھی اس کارِ ثواب میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کر لیا۔

کمیونٹی سنٹر

بیشتر ملکوں میں شہروں کے اندر کسی نہ کسی شکل میں کمیونٹی سنٹر یا پڑوسیوں کے مل جل کر اُٹھنے بیٹھنے کے لئے ایک عمارت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ اس قسم کے کمیونٹی سنٹروں یا نشست گاہوں کی گنجائش اور وقت کا بڑا حصہ نوعمر لڑکوں لڑکیوں کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے لئے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہوتا تو اکثر یہ ہے کہ پہلے پہل اس قسم کے مراکز انھی نوعمر لڑکوں لڑکیوں کے پروگرام کے لئے قائم ہوتے ہیں اور آگے چل کر ان کی توسیع ہوتی ہے اور بستی میں رہنے والے ہر عمر کے لوگوں کے لئے یہ دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ مشترک سرگرمیوں کے لئے اس طرح کی مقامی عمارت کا یہ طریقۂ کار گاؤں میں اختیار کیا گیا ہے جس کی پہلی مثال غالباً ترکی کے دیہی "الاؤوں"[۱] کی شکل میں ملتی ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد بہت چل پڑے تھے۔ گو یہ عمارتیں چاہے شہراتی علاقوں میں ہوں یا دیہی علاقوں میں جس

---

[۱] "الاؤ" انگریزی لفظ Hearth کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، آگ روشن کر کے اس کے آس پاس بیٹھنے اور بات کرنے گپ۔ مختلف موضوعات پر لوگوں کے تبادلۂ خیال کرنے کا رواج جاڑے کے دنوں میں اب بھی ہندوستان کے دیہی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ایڈیٹر

زیرِ اثر مسلح دشمن اور مجرمانہ حرکتوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو فنڈامنٹل ایجوکیشن کے ماتحت نوجوانوں میں ہونے والے کام کی صحیح تعریف "نئے سرے سے دی جانے والی تعلیم" ہوگی نوعمر مجرموں کی عدالت کے ایک فرانسیسی جج ایم۔ جے کازال نے جنھوں نے پیرس کے نوعمر مجرموں اور نوجوانوں کے بارے میں بہت سے تجربے کئے ہیں، ایک موقع پر لکھا ہے کہ "تین سال سے لے کر سترہ اٹھارہ سال تک کی عمر کے بچے اور نوجوان ایک "کلب" میں جسے وہ اپنی "کٹیا" کہتے تھے بڑی پابندی سے آتے تھے۔ جب ان کے لئے ایسا انتظام ہو گیا کہ اُن کی ضرورتوں، ان کے حوصلوں اور نئے نئے تجربے کرنے کی بھوک کی تسکین اسی قدر ان کے خاندانوں میں ہونے لگی جتنی ان کے "منظم" نوجوان گروہوں اور تحریکوں میں تو انہوں نے ان "کلبوں" میں آنا بند کر دیا۔ گویا یہ ہے وہ طریقہ جس پر نوجوانوں میں کام ہونا چاہئے۔ وہ "کٹیا" ان لوگوں کو جن کے لئے وہ ابتداءً بنائی گئی تھی، ہاتھوں ہاتھ لیتی تھی۔ اسی اصول پر گھروں کا ماحول بنایا گیا۔ اُن کو ہاتھوں ہاتھ لینا اور ان کی عزت کرنا، نظم و ضبط یعنی ڈسپلن کا بہت سخت نہ ہونا۔ ان کی دلچسپیوں میں تنوّع کا لحاظ، اور ان کی پرداخت میں سوجھ بوجھ اور نئے پن سے کام لینا ــــ یہ چیزیں اصل الاصول کے طور پر برتی گئیں۔ تعلیمی نظام کوئی ہو اس کی بنیاد اعتبار و اعتماد، دوستی اور یگانگت، بچوں کے ہاتھ بٹانے کے شوق کی حوصلہ افزائی اور ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں تنوّع ــــ ان چیزوں پر ہونی چاہئے۔"

نوجوانوں میں ہونے والے کام کی قدر و قیمت

سطورِ بالا میں آخر میں جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ نوجوانوں میں کام کرنے والا ہر کارکن تسلیم کرے گا چاہے اس کے کام کا میدان شہروں کی گود میں پلی ہوئی نوعمری کی جرائم پیشگی کی اصلاح ہو یا کوئی اور پروگرام۔ ایک اور اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ نوجوانوں میں ہونے والے کام کی یہ صفات ایک صحت مند تعلیمی بنیادیں بھی ثابت ہوتی ہیں۔ نوجوانوں میں ہونے والے کام کی بنیاد چونکہ انہی کی مرضی اور رغبت کے اوپر ہوگی اور اس کی طرف وہ بے کہے سنے بے ساختہ کھنچ کر آئیں گے اس لئے یہ میدان تعلیم کی ایک ایسی شکل پیش کرے گا جو مختلف عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے قابلِ قبول اور پسندیدہ ہوگی (انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

ان کارکنوں سے اس گروہ کے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے کہ جب ایک موقع پر اس کے لیڈر کو شبہے میں پولیس نے گرفتار کر لیا تو وہ انھی کے پاس فریاد کرنے کے لئے آئے۔ لیڈر چھوٹ گیا اور اسی چور گروہ کی یہ کیفیت ہو گئی کہ اُسے نوجوانوں کا ایک نہایت صالح اور مفید گروہ سمجھا جانے لگا اور سماج میں ان کی عزت ہونے لگی۔ پہلے یہی گروہ تعلیمی اور اصلاحی کارکنوں کے بارے میں شک و شبہے کے جذبات سے پُر رہتا تھا لیکن اب بغیر اس احساس یا شبہے کے کہ اس کی آزادی اُس سے چھن جائے گی ہر جگہ سے امداد قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔

نو عمری کی جرائم پیشگی

شہری زندگی کا ایک لازمی نتیجہ نو عمر لڑکوں کی جرائم پیشگی کے چلن کی صورت میں نکلتا ہے جو صنعت اور سائنس اور مشین کی فتوحات کے آگے آگے چلنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس موضوع پر ایک رسالہ " وے نورم " نے اپنی دسمبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں ہندوستان، ہالینڈ اور بلجیم، امریکہ میکسیکو اور جاپان وغیرہ سے آئے ہوئے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض حالات میں ایسے بھی جرائم پیشہ بچے اور لڑکے ملیں گے جن کی حالت واقعی نازک ہوگی اور جن کے علاج کے لئے جم کر کوشش کرنے کی ضرورت ہوگی، مگر اکثریت خصوصاً نو عمر لڑکوں کی جرائم پیشگی صرف ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے اور جنھیں کچا جرائم پیشہ کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے جرائم پیشہ نوجوانوں کے بارے میں ایک مصنف (ر آئی۔ فرے) نے صحیح کہا ہے کہ " اگر کوئی شخص چال چلن کے معاملے میں طبعی معمول کے مطابق ہے تو غیر طبعی خارجی حالات کے اثر سے وہ عادی مجرم کبھی نہیں بن سکتا، ہاں بھولے بھٹکے اتفاقی طور پر ضرور جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔"

شہر کی زندگی میں اسی طرح کے غیر طبعی حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں نوجوانوں میں ہونے والے کام کا مخصوص منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ بگڑے ہوئے توازن کو پھر سے معمول پر لے آئے اور نو عمر لڑکوں لڑکیوں اور نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کرے جو شہر کی زندگی کی مصنوعیت اور سطحیت کے

بات صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بچوں کی بہبودی کے کام میں مجھے عملی تجربے کا موقع نہیں ہے۔ بالغوں کی تعلیم اور سوشل ایجوکیشن کے میدان میں یقیناً میں نے کچھ کام کیا ہے۔ بچوں کی بہبودی کام کے لئے جامعہ ملیہ میں "بچوں کی برادری" کے نام سے ایک شعبہ ایک عرصے سے کام کر رہا ہے۔ میں نے اس شعبہ کے کام کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور چونکہ یہ شعبہ جامعہ ملیہ کے شعبۂ تعلیم بالغان (ادارہ تعلیم وترقی) ہی کی ایک شاخ ہے، اس لئے اس کام کی منصوبہ بندی سے بھی میرا تعلق رہا ہے لہٰذا میں آج آپ کے سامنے جو کچھ عرض کروں گا وہ اسی مشاہدے اور تعلق کی بنیاد پر ہوگا۔

حضرات، آپ کو تعجب ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ "بچوں کی برادری" کا پورا کام بالغوں کی تعلیم کی ہی کا ایک جزو رہا ہے اور اب تک ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ کی حیرت دور ہو جائے گی آپ اس بات پر غور کریں گے کہ والدین کی تعلیم وتربیت تعلیم بالغان کا ایک اہم پروگرام ہے۔ یہ پروگرام غالباً اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اسکول کے بعد کے اوقات میں بچوں کی سرگرمیاں اور دلچسپیاں منظم کرکے والدین کے اوپر براہ راست اثر نہ ڈالا جائے۔ اس طرح بچوں کی غیر نصابی تربیت کا مؤثر طریقے پر انتظام کرکے آپ گویا ایک پنتھ دو کاج کرتے ہیں۔ بچوں کے فاضل اوقات کا اچھا اور صحت مند استعمال ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ان کے والدین آپ کی بدولت تھوڑے ہی وقت کے لئے سہی، در دسر سے بچتے ہیں اور اس لئے وہ آپ سے قریب ہوتے ہیں۔ اس قربت سے فائدہ اٹھا کر آپ اُن سے اپنی بات مؤثر طریقے سے کہہ سکتے ہیں، اور اگر کچھ نہیں تو شرماحضوری ہی کے زیر اثر آپ کی بات سن بھی لیں گے اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بچوں کی بہبودی کا کام والدین کی تعلیم وتربیت کا ایک نہایت کارگر طریقہ ہے۔

غرض میں بچوں کی بہبودی کے کام کو اسی عینک سے دیکھتا رہا ہوں اور اب بھی دیکھتا ہوں کوئی تعجب نہیں کہ آگے میں جو کچھ اس بارے میں کہوں گا وہ آپ کے لئے اجنبی اور نامانوس بات نہ ہو۔ اس لئے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، تعلیم بالغان کا کوئی ادارہ بچوں کی،

ہندوستان کی تعمیر نو میں بچوں کی بہبودی کے کام کا مقام

ذیل کا مضمون برکت علی صاحب فراقؔ کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے بالکن جی باڑی دہلی کے چائلڈ ویلفیر ورکرز ٹریننگ کیمپ کے موقعے پر پڑھا تھا۔ مقالہ نگار نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے جن باتوں پر خاص طور سے زور دیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ موجودہ دور کے معلّم، خواہ وہ بچّوں کی تعلیم کے میدان میں کام کر رہے ہوں یا بالغوں کی تعلیم کے میدان میں ایک ایسے تعلیمی نظام کے زیر اثر تعلیم پائے ہوئے ہیں جو قومی مفاد کے بالکل خلاف تھا، اس لئے انھیں اپنی سیرت و کردار کی اصلاح پہلے کرنی چاہئے ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن سے غیر شعوری طور پر تعلیم کو نقصان پہنچ جائے۔ دوسری بات جو مقالہ نگار کے نزدیک ہر معلّم بالخصوص بچّوں کے فاضل اوقات کو منظّم کرنے والے چائلڈ ویلفیر ورکر کے لئے قابلِ غور ہے، یہ ہے کہ جب تک چائلڈ ویلفیر اور والدین کی تعلیم و تربیت کا کام ایک ساتھ نہیں ہوگا اُس وقت تک اسکول کی تعلیم میں اصلاح ہی کیوں نہ ہو جائے اور چائلڈ ویلفیر کا کام زیادہ سے زیادہ منظّم ہو جائے، بچّے کی نشوونما صحت مند اور سائنٹفک طریقے پر نہیں ہو سکتی۔

اس اعتبار سے، مقالہ نگار کی رائے ہے کہ بچّوں کی بہبودی کا کام (کم سے کم اس کی موجودہ شکل کے پیشِ نظر) تعلیم بالغان ہی کی تحریک کا ایک جزو ہے۔

——— ایڈیٹر

دوستو!

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں آپ کے سامنے ہندوستان کی نئی تعمیر کے ڈھانچے میں بچّوں کی بہبودی (چائلڈ ویلفیر) کے کام کا جو درجہ ہے، اس کے بارے میں اپنے خیالات پیش کروں۔ میں

انگریزی عہدِ حکومت کے تعلیمی نظام کی کیفیت

ہندوستان کے انگریزی عہدِ سلطنت کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک تو سرکاری انتظام میں تعلیم کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ اور سچ پوچھئے تو یہ کیفیت بہت زمانے تک قائم رہی۔ سرکاری اہتمام میں تعلیم کا باقاعدہ رواج دراصل اس تاریخ کے بعد سے شروع ہوتا ہے جب ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت آئی انیسویں صدی کے آخر تک کا زمانہ بھی تعلیم کے لحاظ سے قریب قریب تاریکی کا زمانہ ہے۔ اس لئے اسے بھی چھوڑیئے، انگریزی عہد میں تعلیم کی جو نوعیت تھی اُس کے اوپر اُس وقت سے نظر ڈالیے جو ہم بیشتر بالغوں کی یاد میں اب تک تازہ ہے، یعنی اب سے کوئی تیس چالیس سال پہلے کا زمانہ

اس بات سے چاہے آپ کو اتفاق نہ ہو مگر میرا ایمان ہے کہ ابتدائی اور مڈل تک کی تعلیم کے انتظام کا مقصد ایک طرف بدنامی سے بچنا تھا اور دوسری طرف اس کے اثر سے ہندوستانیوں میں پست ہمتی اور مغلوبیت کی ذہنیت پیدا کرکے انھیں غلامی کی زندگی پر صابر و شاکر رہنے کا عادی بنانا تھا۔ طالب علم وہی لائق اور سعادت مند سمجھا جاتا تھا جو جماعت میں سب سے زیادہ گم سم بیٹھا رہے، اور استاد کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم طالب علموں میں کسی بات کی شکایت کرنے کے لئے "نالش" کا لفظ رائج تھا جس کے معنی "رونے" کے ہوتے ہیں۔ اُسے جماعت میں اپنی مرضی اور اپنے شوق کا کوئی کام خواہ اس کی تعلیمی قدر و قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو، کرنے کا اختیار نہیں ہوتا تھا وہ وہی کرتا تھا جس کا اس کے مطلق العنان استاد یا اس کے نامزد کیے ہوئے مانیٹر کی طرف سے حکم ہوتا تھا اس وقت مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ سات آٹھ دن کی چھٹیاں تھیں، گھر پر جیومیٹری کے کچھ مقررہ سوالات حل کرنے کا کام دیا گیا تھا۔ میں نے مقررہ تعداد سے کچھ زیادہ سوالات کر لیے تھے، جو صحیح بھی تھے۔ مگر اس کے انعام میں میں نے جتنے زیادہ سوالات کیے تھے، اتنے ہی مجھے ڈنڈے کھانے پڑے تھے

غیر نصابی سرگرمیوں یا ان فاضل اوقات کے استعمال کو تعلیم بالغان کے پروگرام کے ساتھ شامل نہیں کرتا اور اگر کبھی اس کا ذکر آجاتا ہے تو اسے ایک غیر متعلق بات سمجھ کر ٹال دیتا ہے

نئی تعمیر کا مطلب

اس سے پہلے کہ ہم نئی تعمیر کے ڈھانچے میں بچوں کی بہبودی کے کام کا جو مقام ہے، اس کے اوپر بحث کریں، ہمیں تھوڑی دیر تک اپنی توجہ اس طرف موڑنی چاہئے کہ نئی تعمیر کا مفہوم کیا ہے؟ یہ بات بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہو گویا ہم ابتدائی درجے کے بچوں سے مخاطب ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس لفظ کا بہت بُری طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسے اس زمانے میں قریب قریب ہر شخص اور ہر موقعے پر استعمال ہوتا ہے مگر اس کے مطالب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کا استعمال بہت کم لوگ کرتے ہیں اس لئے کہ میری رائے میں اس کے استعمال سے اپنے اوپر بہت بڑی ذمّے داری آجاتی ہے۔

یاد رکھئے نئی تعمیر کا مطلب مرمّت یا لیپ پوت نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے آزاد ہندوستان کے ساتھ اس لفظ کو جوڑا ہے وہ بہت ذمّے دار لوگ ہیں۔ اس لفظ کو ہندوستان کے ساتھ منسوب کرنے کے بعد جو کچھ وہ کر رہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ مرمّت یا لیپ پوت کا کام ہے بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ "کہنے والوں" اور "کرنے والوں" کے سوچنے یا کرنے کے طریقے میں فرق ہوا ور کرنے والوں کے ہاتھوں جو کچھ نظر آتا ہے ،، اس کے اوپر نئی تعمیر کے لفظ کا اتنا اطلاق نہ ہو جتنا مرمّت اور لیپ پوت کے کام پر ہو سکتا ہے۔

دراصل اس لفظ "نئی تعمیر" کے دامن میں ایک بہت بڑی تاریخ پوشیدہ ہے جس کا جائزہ لینے کا نہ یہ وقت ہے اور نہ مقصد۔ اس وقت صرف اتنا کہنے پر بس کروں گا کہ ملک کی آزادی سے پہلے ہمارے یہاں جو کچھ بھی تھا، وہ ہمارا یا کم سے کم ہمارے بھلے کے لئے نہیں تھا۔ یہ بیان بھی تھوڑی تفصیل کا محتاج ہے، مگر میں اپنی بحث کو صرف تعلیم تک محدود رکھوں گا جس کا ہمارے موضوع سے بہت قریب کا تعلق ہے۔

وہ بھی نئی تعمیر کے ماحول میں کرنے چلے ہیں، اُسی زہرآلود تعلیمی نظام کے پالے پوسے ہوئے ہیں اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نظام کا زہر اور لوگوں کے جسموں میں ہو تو ہو، ہم اُس کے اثر سے بچے ہوئے ہیں۔ میرے ایک استاد نے جن کی رہنمائی میں میں تعلیم بالغان کا کام کرتا تھا، ایک موقع پر مجھ سے کہا تھا کہ "میں یہ نہیں دیکھتا کہ میرے کسی ساتھی نے اپنے کام سے دوسروں کو کتنا فائدہ پہنچایا۔ میری نظر اس بات پر رہتی ہے کہ اس نے اپنی اصلاح اور اپنی سیرت کی نئی تعمیر کس حد تک کرلی ہے۔" اس بات کی تہہ میں جو راز اور معنی چھپے ہوئے تھے، اس کا اندازہ مجھے اُس وقت نہیں ہوا تھا۔ اس بات میں کتنا وزن اور کتنی سچائی ہے، اس کا اندازہ آپ کو گاندھی جی کی زندگی سے ہوگا۔ جس نظام تعلیم کے وہ پروردہ تھے، اس کی جتنی دینیں تھیں، گاندھی جی نے ایک ایک کرکے اُن سے پیچھا چھڑایا اور دوسروں سے کبھی کوئی بات اُس وقت نہیں کہی جب تک خود اپنی زندگی میں اس کے اوپر عمل نہیں کرلیا۔ یہ بات یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک مریض اپنے اوپر جلاب کی تکلیف اٹھا کر اپنے جسم کے سڑے ہوئے اور بیماری پیدا کرنے باہر نہیں نکال دیتا اُس وقت تک صحیح معنی میں وہ صحت یاب نہیں کہا جاسکتا۔

دوسرا نتیجہ جس پر ہم پرانے نظام تعلیم کے مطالعہ سے پہنچتے ہیں، یہ نکلتا ہے کہ جس کا میں نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ ملک کی نئی تعمیر کے فریم میں محکومی کے زمانے کا تعلیمی تصور فٹ نہیں ہوسکتا، اور تعلیم کی بھی نئی تعمیر کی اُسی قدر ضرورت ہے جس قدر زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم کا عمل بہت سست رفتار ہوتا ہے۔ اس کی نئی شکل مکمل طور پر اُبھرنے میں بہت دیر لگے گی جس کا دوسرے اسباب کے ساتھ ساتھ ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے استاد اُسی پرانے تعلیمی نظام کے عادی ہوچکے ہیں، اور انھیں نئے حالات کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے میں بڑی مدت لگے گی۔ اُن سے ہزار کہا جائے کہ وہ اپنے اسکول کو Activity school بنائیں، بچوں کو آزادی دیں تاکہ انھیں اظہارِ نفس یعنی Self Expression کا موقع ملے، وہ اسکول اور بچوں کے والدین کے درمیان گہرا تعلق قائم کریں، اور بچوں کو جسمانی سزا دینے سے پرہیز کریں، لیکن ان باتوں کی فائدہ مندی کا قائل ہونے کے باوجود وہ شاید ان میں سے ایک کام بھی نہ کرسکیں۔ ایسی صورت میں تعلیم کی اس کمی کو پورا کرنے کا اگر کوئی راستہ

وہی سب کچھ کرتے تھے جو انگریز حاکم کرتا تھا، اور لطف کی بات یہ ہے کہ انگریز کے حکم اور اشارے سے نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے کرتے تھے۔

ظاہر ہے تعلیم کا یہ تصور اور اس کا یہ ڈھنگ نہ ہندوستان کا اپنا ہو سکتا ہے نہ اُس کے بھلے کے لئے ہو سکتا ہے۔ یہ حکمراں قوم کی ایجاد تھی اور اُسی کے اپنے بھلے کے لئے تھی۔ اب جبکہ ہندوستان آزاد ہے اور اپنی قسمت کا آپ مالک ہے، تو اسے یہ سوچنا ہے کہ آیا تعلیم کے اسی ڈھنگ میں ہندوستانیت اور قومیت کی محض قلم لگا دینے سے کام چل جائے گا یا اسے سرے سے بدلنا ہوگا۔ اس سوال کے جواب کے لئے ہم دور کیوں جائیں، جبکہ خود بابائے قوم گاندھی جی کے یہاں ہمیں اس کا معقول جواب مل جاتا ہے۔ جس تعلیم کو ہم آج بنیادی تعلیم یا بیسک ایجوکیشن کے نام سے جانتے ہیں، گاندھی جی کے یہاں اس کا نام "نئی تعلیم" تھا۔ جس تعلیم کی برکتیں دیکھ کر انہوں نے ایک موقعے پر فرمایا تھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی بڑی اکثریت تعلیم سے محروم رہ گئی"، اس کی جگہ لینے کے لئے تعلیم کے جس تصور کی انہوں نے تبلیغ کی تھی، وہ سرے سے "نئی تعلیم" ہی ہو سکتی تھی، جس کا پرانی تعلیم سے کوئی تعلق نہ رہ جائے۔ دوسرے الفاظ میں قوم کی نئی تعمیر کے فریم میں تعلیم کا پرانا تصور فٹ ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے تعلیم کے میدان میں بھی تعمیرِ نو کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اقتصادی، سماجی اور سیاسی میدان میں ہے۔

ہمیں کیا کرنا ہے؟

میں نے محکومی کے عہد کے جس تعلیمی تصور کا ذکر کیا ہے، اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ دیکھئے میں پھر ایک گستاخانہ بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں جس پر آپ کو پہلے پہل تعجب ہوگا۔ میرا مدعا یہ ہے کہ تعلیم کے کسی میدان میں معلم کی حیثیت سے قدم رکھنے سے پہلے ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم نے خود اپنے آپ کو کس حد تک تعلیم دے لی ہے۔ یہاں تعلیم سے میری مراد اصلاحِ نفس سے ہے، یعنی یہ کہ ہم نے خود اپنی قلب ماہیت کہاں تک کر لی ہے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہم لوگ جو بچوں کی بہبودی کا کام اور

اور گھر کے ماحول میں بھی۔ اُسے اسکول میں اپنی مرضی کے خلاف استاد کی سنک کی پابندی کرنی پڑتی تھی اور گھر پر ماں باپ کی اقتصادی اور ذہنی پریشانیوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ نزلہ ہمیشہ کمزور عضو پر گرتا ہے۔ اسکول میں اور گھر پر دونوں جگہ کمزور عضو یہی معصوم بچہ ہوتا تھا۔

اب خدا خدا کرکے کم سے کم اتنا تو ہوگیا ہے کہ اسکول کے ماحول کے ڈراؤنے پن میں کمی آگئی ہے اور اگر نہیں آئی ہے تو بہت جلد آجائے گی۔ لیکن ہندوستانی گھروں کا ماحول ابھی جوں کا توں پہلے ہی جیسا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ماں باپ یا تو سرے سے ان پڑھ ہیں اور اگر پڑھے لکھے بھی ہیں تو اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے ان پڑھوں سے بھی گئے گزرے۔ موجودہ اسکول ابھی ایسے نہیں ہیں اور نہ ابھی مستقبل قریب میں اس کا امکان ہے کہ بچے کو صبح سے شام تک اپنے ماحول میں رکھیں۔ اس صورتِ حال میں بچہ چوبیس گھنٹے میں اٹھارہ اُنیس گھنٹے اپنے گھر کے ماحول میں رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیجئے کہ اسکول کا ماحول بہت کچھ سدھر گیا ہے اور تعلیمی اعتبار سے اُسے صحت مند کہا جاسکتا ہے تب بھی اگر گھر کا ماحول اسکول کے صحت مند ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوتا تو بچہ یا نوخیز لڑکا جس کے اندر ابھی صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہوتی، لازمی طور پر اس تضاد اور ذہنی پراگندگی میں کھو کر رہ جائیگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب وہ بڑا ہوکر زندگی میں قدم رکھے گا اور اُسے آئے دن مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا تو ہر قدم پر تذبذب اور پس و پیش کا شکار اور اگر مارے باندھے فیصلہ بھی کریگا تو وہ بیشتر غلط اور وقت کے تقاضے سے مختلف ہوگا۔ غرض پھر وہی غلط اور بیمار قسم کے شہریوں کی تخلیق جو پہلے منصوبہ بناکر کی جاتی تھی، اب غفلت کی وجہ سے عمل میں آئے گی۔

اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر سوچئے تو آپ کی ذمّے داری اس اعتبار سے کہ آپ بچّوں کی بہبودی کا کام ملک کی نئی تعمیر کے ڈھانچے میں کرنا چاہتے ہیں، بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آپ کا کام صرف اتنا ہی نہیں رہتا کہ آپ بچّوں کو اُن کے فاضل اوقات میں مشغول رکھیں جو میں سمجھتا ہوں

ہوسکتا ہے تو وہ صرف ایک ہے اور وہ ہے بچّوں کی بہبودی کے کام کے نام سے ہم جو کام کریں گے وہ اگرچہ اپنی جگہ خود ایک مستقل کام ہے اور سائنٹفک تعلیم کے پوری طرح رائج ہوجانے کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی رہے گی، مگر اس عبوری دور میں یہ کام اس کمی کو بھی پورا کرے گا جو اسکولوں کی تعلیم میں رہ جائے گی۔

نئی تعلیم کی دوسری خصوصیتوں کو نظرانداز کیجئے اس لئے کہ اس مختصر مقالے میں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، صرف ایک خصوصیت اظہارِ نفس (Self Expression) کے پہلو کو لیجئے جو موجودہ حالات میں بچّوں کی بہبودی کے کام کا سب سے عام اور اہم پہلو ہے۔ اظہارِ نفس انسان کی وہ فطری جبلّت ہے جسے بھوک پیاس اور پیشاب پاخانے وغیرہ کے درجے پر رکھا جاسکتا ہے۔ اگر انسان کو اور خصوصاً نوعمر بچّوں کو اس کا موقع نہ ملے تو وہ گھُٹ کر رہ جائیں گے۔ اس سے شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں، جس سے خود فرد کو بھی اطمینان حاصل ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کو بھی اس کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کی مثال لوہے کے ہتھیار کی سی ہے کہ اگر اس سے کام نہ لیا جائے یا دوسرے الفاظ میں اُسے اپنا جوہر دکھانے کا موقع نہ ملے تو کچھ عرصے کے بعد وہ زنگ آلود ہونے لگتا ہے اور اگر اُس وقت بھی اس کی خبر نہ لی جائے تو وہ ایک مدت کے بعد زنگ کا شکار ہوکر مٹی میں مل جاتا ہے۔ یہ مثال آج ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں انسانوں پر صادق آتی ہے جو اب سے پچیس تیس سال پہلے ایک بے کیف، اظہارِ نفس کے مواقع سے عاری اور غلامانہ نظامِ تعلیم کے سائے میں پرورش پاچکے ہیں۔ ظاہر ہے اب جبکہ آزادی کی فضا میں قوم کے پلنے بڑھنے اور پروان چڑھنے کا زمانہ ہے، بالغ آبادی کا اتنی بڑی تعداد میں از کار رفتہ ہونا بہت زبردست قومی نقصان ہے

بچّوں کے گھریلو ماحول کی اصلاح

میں پہلے ذکر کرآیا ہوں کہ انگریزی عہدِ حکومت کے تعلیمی نظام کی کیفیت یہ تھی کہ بچّہ اسکول میں استاد کی مار کھاتا تھا اور گھر پر ماں باپ کی۔ اس کی جائز سے جائز خواہشوں کا خون اسکول میں بھی ہوتا

رکھ کر آپ کام کرتے ہیں تو آپ کی نظر حال سے زیادہ بچوں کے مستقبل پر رہنی چاہئے اور اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو ملک کی نئی تعمیر کے کام میں آپ کا ـــــ بچوں کی بہبودی کا کام، بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے آپ کے اوپر بہت بڑی ذمّے داری عاید ہوتی ہے۔

دیہاتی اور شہراتی بچوں کے لئے تفریحی انتظامات

ان کی نوعیت اور مقدار

حضرات! میں نے ملک کی نئی تعمیر کی وضاحت اور اس کے ڈھانچے میں بچوں کی بہبودی کے کام جو مقام ہے، اس پر آپ کا بہت زیادہ وقت لے لیا ہے۔ میری بحث کے موضوع کے دو حصّے تھے ایک وہ جس کا میں نے اب تک ذکر کیا ہے یعنی موضوع کا نظری حصہ اور دوسرا یہ جس کا میں اب ذکر کروں گا یعنے موضوع بحث کا عملی حصّہ۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ موضوع کے اس پہلو کے لئے وقت بہت کم بچ رہا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اس میدان میں عملاً کام کرنے موقع نہیں ملا ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ وقت اور اس سے زیادہ تجربے کی کمی کے باوجود جو کچھ محسوس کرتا ہوں آپ کے سامنے بیان کر دوں۔

۱- دیہاتی علاقہ

میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں دیہاتی بچوں کی تفریح کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں ہے اور جب کوئی چیز موجود ہی نہ ہو تو اس کے اوپر تنقید و تبصرہ کرنا، اس کا جائزہ لینا اور پھر اس جائزے کی روشنی میں اس میں ترمیم و اصلاح کا مشورہ دینا ہوا میں لاٹھی چلانے کے برابر ہے۔ اس صورت حالات میں تو صرف اسکیم اور منصوبہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے اور جب اس منصوبے پر کچھ عرصے تک کام ہو لے تب اس کا جائزہ لینا اور اس جائزے کی روشنی میں ترمیم و اصلاح کی راہیں تلاش کرنا چاہئے۔

مجھے معلوم نہیں کہ بچوں کی بہبودی کے نام سے دیہاتی علاقوں کے بچوں کے لئے الگ سے کبھی

آسان کام نہیں ہے، بلکہ آپ کا یہ فرض بھی ہو جاتا ہے کہ بچوں کے والدین سے تعلقات قائم کرکے گھر میں کے ماحول کی اصلاح کا کام بھی کریں، اس لئے کہ بچوں کا ویلفیر صحیح معنی میں اُسی وقت ہو سکتا ہے جب انھیں اپنی نشو و نما کے زمانے میں تضادات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ چوراہے پر کھڑے ہو کر صحیح راہ کا تعین کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا اس میں شک نہیں، بہت اہم تعلیمی فریضہ ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اگر اس صلاحیت کی مشق اسکول اور گھر کے ماحول میں بنیادی فرق قائم رکھ کر کرائی جائے تو بچے کا میرے خیال میں وہی حشر ہوگا جو سال دو سال کے اُس معصوم کا ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں شمشیر زنی کی مشق کرانے کی غرض سے چھوٹی سی مگر دھار دار کٹار دی جائے۔ غرض کم سے کم ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بچے اور اس کے والدین کی تربیت کے درمیان باہم وہی رشتہ ہے جو پانی کی شکل میں ہائڈروجن اور آکسیجن کے درمیان ہوتا ہے کہ اگر ان کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے تو ہائڈروجن اور آکسیجن کا وجود تو قائم رہے گا مگر پانی کا وجود ختم ہو جائے گا۔

دوستو، میں نے یہ سب باتیں ملک کی نئی تعمیر کی وضاحت کے سلسلے میں کہی ہیں۔ اب نئی تعمیر کے ڈھانچے میں بچوں کے بہبود کے کام کا کیا مقام اور اس کی کیا اہمیت ہے، میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب ڈھونڈھنا آسان ہوگا۔ ملک کی نئی تعمیر کے سلسلے میں نہ جانے کتنی طرح کے کام ہو رہے ہیں۔ ان کاموں کی تفصیل سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کا میٹھا پھل ہمارے رہنماؤں کا کہنا ہے اگر بہت کم مدت میں ملا جب بھی پچیس تیس سال لگ جائیں گے ظاہر ہے یہ پھل انہی کو ملے گا جو آج بچے ہیں اور پچیس تیس سال کی مدت میں جوان ہو جائیں گے اور انہی کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہوگی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ماں باپ زندگی سے ریٹائر ہونے یا مرنے کے بعد اپنی اولاد کے لئے جو ترکہ چھوڑ جاتے ہیں، اس سے بہرہ اندوز ہونے یا اُسے تباہ و برباد کر دینے کا دارو مدار اولاد کے اوپر ہوتا ہے۔ اگر ہم نے مادی تعمیر (Material Reconstruction) کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی سیرت و شخصیت کو سنوارنے کی کوشش جی جان سے نہ کی تو اندیشہ ہے کہ آج کی تعمیر کل تخریب میں تبدیل ہو جائے آپ کا کام بچوں کی سیرت و شخصیت کو سنوارنے کا کام ہے اس لئے اگر نئی تعمیر کے پروگرام کو اپنے سامنے

مل جاتا ہے مگر ٹھیٹھ قسم کے گاؤوں کے بچّے منورنجن کے منظم بندوبست سے اکثر محروم ہی رہتے ہیں

لیکن منورنجن اور دل بہلاؤ تو انسان کے لئے بھوک پیاس جیسی فطری ضرورتوں کی طرح کی ضرورت ہے اس لئے بچّے اپنے ہی طور پر اس کا کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتے ہیں۔ مگر ماں باپ کی طرف سے جس قسم کے منورنجن اور دل بہلاؤ کی اُن کو اجازت ہوتی ہے وہ بس انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں۔ جیسے کبڈی اور گلی ڈنڈا اور ان کے مقابلے۔ نوخیز لڑکے کسی استاد کی شاگردی میں کشتی کی بھی مشق کرتے ہیں مگر جہاں تک تہذیبی سرگرمیوں جیسے گانا بجانا، ناچ اور ناٹک وغیرہ، تربیت جسمانی کے کرتب اور تعلیمی تقریبیں جیسے تحریر اور تقریر کے مقابلے، نظم خوانی، ایکٹنگ، کتب خانے اور ریڈنگ روم، جلسے اور کانفرنسیں وغیرہ یا ایکسکرشن، سیر سپاٹے، ہائکنگ، تہواری تقریبوں کے انتظام میں عملی شرکت، یہ باتیں سرے سے گاؤوں میں ناپید ہیں۔ کچھ نہیں تو ان سرگرمیوں میں سے ایک آدھ ہی اگر پابندی کے ساتھ چلائی جائیں، اور دیہاتی قسم کی تفریحات میں جو بغیر کسی ضبط و نظم کے بچّے خود کر لیتے ہیں، کچھ ترمیم کر کے انھیں باضابطہ اور بامقصد بنا دیا جائے تو کم سے کم گاڑی چل پڑے گی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں نئی نئی باتیں شامل کی جا سکیں گی۔ مثلاً گلی ڈنڈا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ کرکٹ کے قریب لایا جا سکتا ہے اور کبڈی کو اس طرح کی شکل دی جا سکتی ہے کہ اس کا کھیل ٹیم اسپرٹ کے ماتحت ہونے لگے۔

ترکیبیں اور تدبیریں بہت کی جا سکتی ہیں اور بچّوں کی دل بستگی اور تفریح کے بیسیوں پروگرام چلائے جا سکتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ لوگ اس کی ضرورت کو محسوس کریں اور گاؤوں میں جا کر رہنے سہنے اور گاؤوں کی زندگی کا اپنے آپ کو عادی بنا لیں۔

شہراتی علاقے

شہراتی علاقوں کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً بمبئی، کلکتہ،

کوئی اسکیم نئی یا جن اسکیموں کا ادھر چند سال سے اخباروں میں ذکر آتا ہے ان کے مطابق گاؤں
کبھی کچھ کام کیا گیا۔ میں نے اپنی اب تک کی باتوں کے دوران میں کسی جگہ بچوں کی بہبودی کے کام کی تعر
وتشریح اس لئے نہیں کی کہ آپ لوگ اس سے میری بہ نسبت زیادہ واقف ہیں یا اگر پہلے واقف نہیں
تو اس ٹریننگ کیمپ کے دوران میں اب ہو گئے ہوں گے۔ بچوں کی بہبودی کے کام کی فہرست بہت ز
طویل ہے اور اس میں بعض کام ایسے ہیں جو سماجی بہبود (Social Welfare) کی صف
آجاتے ہیں اور ان کو انجام دینا صرف حکومت یا سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ جیسی نیم سرکاری جماعتوں
سے ممکن ہے۔ میں صفائی سے کہہ دوں کہ اس تمام بحث کے دوران میں بچوں کی بہبودی کے کام
باب میں نے باقی تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف ایسے ہی کاموں اور سرگرمیوں کو اپنے ذہن میں ر
ہے جو بالکن جی باڑی، بچوں کی برادری، بھارت اسکاوٹ اور گرل گائڈ اور سیوا سمتی جیسی جماعتیں ا
تک کرتی رہی ہیں، یعنی اسکولوں کی تعلیم سے بچوں کے پاس جو وقت بچ رہتا ہے، اس کے صرف تھوڑ
سے حصے کا تعلیمی اور تفریحی استعمال۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیہاتی علاقوں میں سوائے سنٹرل سوشل ویلفیر بو
ماتحت کام کرنے والی بال واڑیوں کے بچوں کی بہبودی کے کام کے اتنے حصے کی تنظیم بھی نہیں
اس کی سب سے بڑی وجہ تو میرے خیال میں وہی جس کا ذکر میں اس بحث کے پہلے حصے کی ابتد
منزل میں کر آیا ہوں۔ یعنی یہ کہ جو کارکن اس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ نئے حالات کے مطابق ا
آپ کو ڈھالنے میں یا تو کامیاب نہیں ہوتے یا سرے سے اس کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ میری مراد یہ
کہ وہ اپنے اوپر سے طبقاتی امتیاز یا شہرائیت کا جامہ اتار پھینکنے اور ہندوستانی گاؤں کی گرد و غبا
اٹی ہوئی زندگی اختیار کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتے۔

دیہاتی علاقوں میں غرض بچوں کی تفریح اور منورنجن کا منظم بندوبست نہ گاؤں کے اسکول کی طر
ہے اور نہ غالباً اس سنستھا کی طرف سے جو انڈین کاونسل فار چائلڈ ویلفیئر کے نام سے قائم ہوئی ہے اور نہ بالکن جی باڑی یا ا
کسی دوسری غیر سرکاری سنستھا کی طرف سے بڑے بڑے شہروں سے قریب کے گاؤں کے بچوں کو تو کبھ
کبھی اس قسم کی ایجنسیوں کی منظم ایک آدھ میلہ یا بڑے اور مرکزی سماروہوں میں شریک ہونے کا مو

जामिआ मिल्लिया का तालीमी मेला

جامعہ ملیہ کا تعلیمی میلہ



ग्राम्य सम्मेलन में समुदाय विकास के मंत्री श्री एस० के० डे० भाषण दे रहे हैं

دیہی کانفرنس میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے وزیر شری ایس- کے- ڈے تقریر کررہے ہیں



ग्राम्य सम्मेलन के प्रतिनिधि और अन्य दर्शक

دیہی کانفرنس کے نمائندے اور دوسرے تماشائی

دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں بچوں کی بہبودی سے متعلق تفریحی، تہذیبی اور تعلیمی کاموں کی ایجنسیاں بھی ہیں اور اکا دکا ایسے ادارے اور سنستھائیں بھی قائم ہیں جن کا کام براہ راست سماجی بہبودی Social Welfare کی تعریف میں آتا ہے جیسے آوارہ اور بے سہارا بچوں کے آشرم، بگڑے ہوئے اور مشکل بچوں کے گھر، بچوں کے مستقبل کے بارے میں ماہرانہ مشورہ دینے کے ادارے وغیرہ۔ ہمارا ملک اقتصادی ترقی کے اعتبار سے آج جس منزل میں ہے اُس کے پیش نظر اگر اتنا بھی پابندی اور باضابطگی کے ساتھ ہوتا رہے تو بہت ہے۔ میں نے "پابندی اور باضابطگی" کا لفظ یونہی روانی میں نہیں کہا ہے بلکہ اس کے پیچھے میرے پیش نظر ایک باضابطہ سُجھاؤ ہے اور وہ یہ کہ بچوں کی اس قسم کی سرگرمیوں کی تنظیم ہفتے، پندرہ روز یا مہینے میں ایک بار کر دینے سے بچوں کی بہبودی کے کام کا جو مقصد ہے اور جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے میں اپنی بحث کے پہلے حصے میں کر آیا ہوں، وہ حاصل نہیں ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے ان سرگرمیوں میں چاہے وہ گھنٹے ہی دو گھنٹے کے لئے ہوں، اسکولوں کی سی پابندی ہونی چاہئے اور اس کے لئے اسکولوں کے استادوں اور خاص طور پر والدین کا تعاون حاصل کرنا چاہئے۔

شہراتی علاقوں میں بچوں کی بہبودی کے جو کام ہوتے ہیں، میں افسوس کے ساتھ کہوں گا اور جس کا اظہار سُنا ہے پنڈت نہرو نے بھی آل انڈیا چلڈرنس ڈے کے کسی موقعے پر کیا تھا، وہ زیادہ تر ان بچوں کے لئے ہوتے ہیں جو پبلک اسکولوں میں پڑھتے ہیں یا کم سے کم امیر اور کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ انہی شہروں میں ایسے بچے بھی رہتے ہیں جن کی حالت گاؤوں کے بچوں سے بھی بدتر ہوتی ہے اور سچ پوچھئے تو بچوں کی بہبودی کے لفظ کا جو مطلب ہے، وہ انہی بچوں پر زیادہ صادق آتا ہے۔ پبلک اسکولوں اور امیر گھرانوں کے بچوں کی تفریح کے موقعے تو ان اسکولوں میں بھی نکلتے رہتے ہیں اور اگر میری اطلاع غلط نہیں ہے تو ان اسکولوں کے اہتمام میں والدین کی سبھائیں یعنی Parents Associations بھی قائم ہیں۔ ان حالات میں ان بچوں کو جن کی تعداد بھی مقابلتاً کم ہے، ان سرگرمیوں اور دلچسپیوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے، جتنی گندی بستیوں میں رہنے والے اور غریب والدین کے بچوں کو ہے۔ (باقی ص[illegible] پر)

اِس شمارے میں لکھنے والے

۳ مسٹر رابرٹ پی ارس - آپ تعلیم بالغان کی مشہور کتاب " اڈلٹ ایجوکیشن اِن پریکٹس " کے ایڈیٹر ہیں۔ یونیورسٹی کالج ناٹنگھم میں ڈپارٹمنٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن کے صدر اور " ایسوسی ایشن آف ٹیوٹرس اِن اڈلٹ ایجوکیشن " کے چیرمین ہیں۔

۴۔ شری اشوک مہتا۔ پارلیمنٹ کے ممبر اور مشہور سوشلسٹ لیڈر۔

۵۔ ڈاکٹر بی۔ ایچ۔ مہتا۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ورک بمبئی۔

۶۔ مسٹر ای۔ سیویل ہیرس۔ دی ایجی کیونٹی ایسوسی ایشن۔ لندن

۷۔ شری ایس۔ آر۔ محسنی۔ سوشل ورک میں کولمبیا یونیورسٹی کے ماسٹر ہیں۔ آپ ۱۹۵۷ء میں یونیسکو کی طرف سے لبیا (شمالی افریقہ) میں فنڈامنٹل ایجوکیشن کے ایک مشن کے ہیڈ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے۔ اِن دنوں آپ جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ میں اڈلٹ ایجوکیشن اور پبلک ایڈمنسٹریشن کے استاد ہیں۔

۸۔ شری نیکی رام گپتا - دہلی ایڈمنسٹریشن کے ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ میں آپ " اسسٹنٹ ڈائرکٹر فار سوشل ایجوکیشن " کے عہدے پر مامور ہیں۔ اس سے پہلے ایک عرصے تک آپ دہلی میونسپل کمیٹی کے شعبۂ سوشل ایجوکیشن میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکے ہیں۔

۹۔ شری عبدالرشید صدیقی۔ آپ جامعہ ملیہ کے ریسرچ ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سنٹر میں ماہر تعلیم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

जामिया मिल्लिया का शैक्षिक मेला

جامعہ ملیہ کا تعلیمی میلہ



ग्राम्य सम्मेलन के सिल[illegible]
कुश्ती की प्रतियोगिता

[illegible]کانفرنس کے سلسلے میں
[illegible]ن کا مقابلہ



बच्चों की बिरादरी के आयोजन में "गांधी ग्रानी" की कहानी प्रतियोगिता में अव्वल आने वाली बच्ची कहानी सुना रही है

بچوں کی برادری کے زیر اهتمام گاندھی ترانی کے کہانی سنانے کے مقابلے میں اول آنے والی بچی کہانی سنا رہی ہے

کم پڑھے بالغوں کے لئے

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ نے

اردو اور ہندی میں

مفید اور دلچسپ کتابیں تیار کی ہیں جن کو ملک کے مقتدر ماہرین تعلیم نے بڑی کاوش سے لکھا ہے یہ کتابیں اپنی بے پناہ خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہیں اور اسی لئے سرکاری لائبریریوں کے لئے خاص طور پر منظور ہیں

ابتدائی :- ۲ کتابیں قاعدہ، دس سبق

سوانح :- ۱۵ 〃 گاندھی جی اول دوم، کرشن کنہیا، مہاتما بدھ، غوث پاک، نظام الدین اولیا، حضرت محمدؐ وغیرہ وغیرہ

جھلکیاں :- ۱۲ 〃 نذیر احمد، احمد ندیم، حالی، عبدالحق، سید سلیمان، اکبر الہ آبادی کی ایک جھلک 〃 〃

پیشے :- ۱۱ 〃 حجام، درزی، خانساماں، حلوائی، راج، تانگے والا اور مرغی پالئے 〃 〃

حفظان صحت ۱۲ 〃 نزلہ زکام، طاعون اور چیچک، ہیضہ اور ملیریا۔ ہم کیا کھائیں، گھریلو نسخے 〃 〃

تمدن :- ۸ 〃 میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، ضلع کی سرکار، اچھا ہندوستانی، پنچایت راج 〃 〃

معاشیات :- ۳ 〃 روپیہ کی کہانی، کارخانوں کے قانون اور سرکاری ٹیکسوں کا راز 〃 〃

معلومات :- ۸ 〃 چاند ستارے، ہمارا بھارت، مقناطیس کی کہانی، دنیا کے عجائبات اول دوم 〃 〃

مذہب :- ۲۲ 〃 نکاح، زکوٰۃ، کعبہ شریف، مدینہ منورہ، تعلیمات قرآن مجید 〃 〃

کھیتی باڑی ۱۳ 〃 ہرا چارا، آم کے باغ لگائیے، اپنی کھیتی کو ایک چک کرو۔ ساگ سبزی، پپیتے کے باغ 〃 〃

کھیل کود ۴ 〃 فٹ بال، ہلکے پھلکے کھیل اول، دوم اور سوم

ڈرامے ۷ 〃 مقدمہ باز، جہیز، استری دھن، لڑکی کی شادی، کوآپریٹیو اسٹور 〃 〃

کہانیاں ۱۱ 〃 رامو بھی پڑھنے لگے، پنچ تنتر اول، دوم، سوم، کہانیاں اول، دوم 〃 〃

متفرق ۴ 〃 پہیلیاں، کہاوتیں، پہیلیاں، پنجابی لوک گیت۔

ابتدائی دو کتابوں کی قیمتیں ۴/۴ مرغی پالئے ۸/ آم کے باغ لگائیے ۶/ اور بقیہ سب ۵/ کی ہیں

کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی سے طلب فرمائیے

برکت علی فراق پرنٹر و پبلشر نے دِلّی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر دفتر تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

Registered No. D. 454.

Printer and Publisher : BARKAT ALI Firaq; Printed at Rama Krishna Printing Press, DELHI. The Monthly TALIM-O-TARAQQI JAMIA DELHI